کلامِ غالب

کی دو مستند شرحیں

[وثوقِ صراحت اور مشکلاتِ غالب]

ترتیب و تدوین

حنا جمشید



کلامِ غالب کی دو مستند شرحیں

(وثوقِ صراحت اور مشکلاتِ غالب)

ترتیب و تدوین

حنا جمشید

کلامِ غالب کی دو مستند شرحیں

(وثوقِ صراحت اور مشکلاتِ غالب)

ترتیب و تدوین

حنا جمشید

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت : نومبر 2018

کتاب : کلامِ غالب کی دو مستند شرحیں
[illegible]

ترتیب و تدوین : حنا جمشید

ناشر : محمد عابد

قیمت : 600 روپے

مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

kalam-e-ghalib ki do mustanid sharhe

by

Hina Jamshed

Edition - 2018

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
+92-41-2615359-2643841, Cell: 0300-6668284
E-mail: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

نادر ذخیرۂ غالبیات کے بانی

لطیف الزماں خاں مرحوم

کی غالبؔ پرستی کے نام

maablib.org

فہرستِ موضوعات

پیش لفظ

اگرچہ ساہیوال کے بیشتر لوگ لاہور، کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں تاہم ہمیں وہ شاگرد عزیز ہیں جو ساہیوال میں رہتے یا پڑھاتے ہوئے بھی ملتان کو فراموش نہیں کرتے۔ حنا جمشید ہماری اُن غیر معمولی شاگردوں میں سے ہے جس نے ساہیوال اور ملتان کے بیچ فکری رشتے کو قائم رکھا اور زمانۂ طالب علمی میں ایسا نام پیدا کیا کہ زکریا یونیورسٹی ملتان کا شعبۂ اُردو اس پر فخر کرتا ہے۔

محنت نے اس میں خشونت یا رعونت پیدا نہیں کی، یہی وہ نکتہ ہے جسے ہر اچھے اُستاد اور پُرکشش مصنف کو سمجھنا چاہیے۔ اس کے شعبے کے اساتذہ کے ساتھ ساتھ فطرت بھی اس پر ایسی مہربان ہوئی کہ اس کا رفیقِ حیات ایسی داستان کا منیر شامی دکھائی دیتا ہے، جس نے ممکن ہے کہ شادی کی اُمید پر اس کے سات سوال پورے کیے ہوں مگر میں نے تو یہ محسوس کیا ہے کہ وہ رفاقت کی ایسی ترنگ میں مبتلا ہے کہ اس نے شادی کے بعد بھی اپنے لیے سات اور سوال تشکیل دے رکھے ہیں۔ یہی وہ جوہر ہے جس کی پہچان ہماری مجلسی اور عائلی زندگی میں کم ہو رہی ہے مگر جب میں ان دونوں کے مابین رفاقت کی یہ سرگرمی دیکھتا ہوں تو بے اختیار دل سے دُعا نکلتی ہے۔ ایم فل کے دوران حنا نے شبنم، عابد علی جیسی شخصیت کو منتخب کیا، تب ان دونوں میاں بیوی کو میں نے بہت سے کتاب خانوں اور اداروں میں سرگرداں دیکھا۔ بہت سے افراد سے ہم کلام پایا اور نا صرف وہ یہاں سرخرو ہوئے بلکہ وہ مقالہ بھی دیدہ زیبی کے ساتھ شائع ہو گیا، دنیائے تحقیق میں اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی۔

غالب کے بارے میں عمومی تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ ایک مشکل شاعر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اچھے افسانہ نگار کی طرح اپنے مخاطب کی ذہانت سے بہت زیادہ توقعات رکھتا ہے اور جو غالب کی

اس بھید بھری شفقت کو سمجھ جاتے ہیں ان کے لیے مطالب کا ایک جہاں ظاہر ہو جاتا ہے اس کے باوجود بہت سے شارحین نے اس کے کلام کی شرحیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض مضحکہ خیز بھی ہیں یا تجارتی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں مگر شرح کلامِ غالب ایک الگ باب معنی ہے، جس کا اپنا ایک لطف ہے۔

کلامِ غالب کی اولین شرح ذوق صراحت ہے جو کسی حد تک کامیاب ہے۔ پروفیسر لطیف عارف (مرحوم) کے کتب خانے سے حنا جمشید نے یہ شرح حاصل کی اور ایم اے کے مقالے کے طور پر اسے مرتب کرنے کی ٹھانی۔ تب اس کام کی ثقالت اور سنجیدگی اس کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتی تھی مگر وہ ایک حیرت انگیز سہولت سے اس مشکل مرحلے سے بھی گزر گئی۔ سو میں ہمیشہ اسے کہتا رہا کہ وہ اپنی تحقیق کے اس ابتدائی نقش کو بھی شائع کرائے تاکہ غالب کے نازک اور دقت طلب اشعار کی تفہیم کے لیے یہ بنیادی حوالہ باذوق لوگوں کے روبرو آئے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب پی ایچ ڈی کی چنوتیوں کا سامنا کرنے والی حنا جمشید نے اپنی اس اولین کاوش پر نظرِ ثانی کر کے اسے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اُسے بجا طور پر احساس تھا کہ یہ شرح نہایت مختصر ہے اس لیے غالب کے اشعار کے حوالے سے تشنگی رکھنے والے طالب علموں کی کما حقہٗ تسکین نہیں کر سکے گی۔ اس لیے میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ ہی نیاز فتح پوری کی کتاب ''مشکلاتِ غالب'' کو بھی شامل کرلے جو طالب علموں میں بہت مقبول تھی اور اب عرصے سے وہ آؤٹ آف پرنٹ ہے۔ اس کے لیے حقوقِ اشاعت کی اجازت کا مسئلہ تھا سو مدیرِ نگار ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم کے صاحبزادے ابصار علی سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے ہماری درخواست کا مان رکھتے ہوئے یہ لکھا۔ ''ابا جی اور ادارہ نیاز و نگار کی کسی کتاب کے حقوق کے لیے انوار احمد یا اس کے شعبہ اُردو زکریا یونیورسٹی ملتان کو کسی رسمی درخواست کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کتاب کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ غالب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے والے طالب علم زیادہ ذہین، شوخ اور طباع ہوتے ہیں اور غالب کو اہمیت دینے والی درس گاہیں زندہ تر ہو جاتی ہیں۔ پھر غالب نے جس مشکل دور میں آنکھ کھولی تھی اس کی مشکلات ابھی تک ختم نہیں ہوئیں۔ اظہار کے پیرائے پر کئی بندشیں اب بھی ہیں، اس لیے ان سے نبرد آزما تخلیقی ذہن بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

انوار احمد

نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

کہا جاتا ہے کہ دیوانگیٔ شوق کا حاصل جنوں ہے جس کی تمنا انسان کو جستجو کے صحرا میں ہمہ وقت سرگرداں رکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سودائے عشق کی اس وادیٔ پُرخار میں کئی دشوار مقام ضرور آتے ہیں لیکن اس سے ہمتِ جنوں بجائے گھائل و پسپا ہونے کے مزید تازہ دم ہو جاتی ہے۔ علم و حکمت کی تلاش و بسیار کے اس سفر میں یہ تشنگی نہ تو کبھی دُور ہوتی ہے اور نہ ہی کبھی اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے۔ شاید اس کا حاصل ہی سفرِ مسلسل ہے۔ میری تمنائے شوق کا دوسرا قدم 'کلامِ غالب کی دو مستند شرحوں' کی پیشکش ہے۔

وثوقِ صراحت کلامِ غالب پر لکھی جانے والی پہلی جزوی شرح ہے، جسے نظام کالج حیدر آباد دکن کے اردو زبان و ادب کے قابل پروفیسر عبدالعلی والہ نے ۱۸۹۳ میں تحریر کیا، آپ وہاں بی اے کے طلباء کو مرزا غالب پڑھاتے تھے۔ اس شرح کو اُن کے بیٹے عبدالواجد نے، اُن کی وفات کے بعد مطبع نظامی حیدر آباد دکن سے ۱۸۹۵ میں شائع کروایا۔ کلامِ غالب کی اس اوّلین شرح کے نادر و نایاب ہونے کے باعث، اس شرح کی تدوین کا کام میں نے اپنے ایم۔ اے کے دوران کیا تھا۔ چونکہ ''وثوقِ صراحت'' کلامِ غالب کی ایک جزوی شرح ہے جس میں شرح سے زیادہ حلِ لغت کو مدِ نظر رکھا گیا ہے، لہٰذا اس کتاب کی اشاعت کے وقت، اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کلامِ غالب کی کوئی ایک ایسی مختصر اور جامع شرح ہو جسے وثوقِ صراحت کے تتمہ میں شامل کر کے، اس کے معانی و مفہوم کو مزید وسعت دی جا سکے۔ یقینی طور پر کلامِ غالب کی کوئی بھی شرح کبھی آخری نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ شعریاتِ کلامِ غالب کے وسیع تر پھیلاؤ اور عمیق لسانی تشکیلات کا احاطہ کر سکتی ہے، یقیناً اس کی وجہ

ہر دور میں آنے والے شارحین و ناقدینِ غالب کے ہاں، کلامِ غالب سے اخذ کردہ فکر و معنی کی نت نئی جہات ہیں۔

اگرچہ غالب شناسی کی روایت میں، معنی کی کھوج کرنے والے ہر شناور نے کلامِ غالب کی شعری ساخت سے، معنی کے نئے جہانوں کی کلید لانے کی سعی کی ہے، تاہم ہم جانتے ہیں کہ تفہیمِ غالب کی روایت میں، زمانی اعتبار سے بعد میں آنے والی محض چند ہی شرحوں کو، دنیائے تحقیق و تنقید میں استناد کا درجہ حاصل ہو سکا۔ مشہور استاد، محقق، ادیب اور غالب شناس "علامہ نیاز فتح پوری" کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ معروف رسالہ "نگار" کے حوالے سے ان کی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اس رسالے میں کلامِ غالب کی بصیرت افروزی کا ایک سلسلہ، طویل عرصہ تک اسیرانِ غالب کی تشنگی دور کرتا رہا۔ خصوصاً کلامِ غالب کے ایسے مشکل اور پیچیدہ اشعار جن کے دقائق کو حل کرنے کے لیے شارحین نے صفحوں کے صفحے بھر ڈالے اور معنی پھر بھی عنقا رہے، ان اشعار کو انھوں نے محض چند سطروں میں سلجھا ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتاب 'مشکلاتِ غالب' کو دنیائے تحقیق و تنقید میں استناد کا درجہ حاصل رہا ہے۔ سو ان کی اسی فہم و آگہی کی فراست کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کی کتاب "مشکلاتِ غالب" کو ان کے سعادت مند بیٹے محترم "ابصار فتح پوری" کی اجازت سے وثوقِ صراحت کے تحت میں شامل کیا جا رہا ہے تا کہ اس کتاب سے مجھ ایسے کم فہم طالب علم بھی استفادہ کر سکیں۔

جستجوئے شوق کے اس سفر میں، کئی لوگ میرے ہمراہ رہے۔ بہت دور مت جائیں۔ بس یہی کوئی جون ۲۰۰۵ء کی بات ہے جب گرد و گرما کے تحائف سے مزین شہرِ ملتان کی ایک تپتی دوپہر میں حالی روڈ پر واقع گلگشت کالونی کے ایک گھر "غالب نما" پر میں نے دستکِ شوق دی تھی اور اس بیت العلم کا در وا کرنے والی شخصیت کا تاثر آج تک میرے حافظے میں رقم ہے۔ سفید کرتا پانجامہ میں ملبوس سفید بالوں والے لطیف الزماں ہی تو تھے جنھوں نے شوق کی اس پہلی دستک کو جانچ لیا تھا۔ وہ جنھیں اپنے ذخیرۂ غالبیات پر ناز تھا، وہ جو اپنی نادر و نایاب کتب سے عشق، جنون کی حد تک کیا کرتے تھے، یہ وہی تو تھے جو میرے اس شوق کی خاطر جانے کتنے گھنٹوں میرے ساتھ تلاشِ کتب کی سعی میں گم رہتے۔ جن کے چھوٹے چھوٹے چٹکلے آج بھی میری سماعتوں میں گونجتے ہیں۔ جن کا دل میرے لیے دریا دل تھا۔ خدائے کریم اُن کے درجات بلند کرے۔ آمین

ڈاکٹر انوار احمد جیسا ہر دل عزیز ناخدا ہو تو منزل دُور بھی ہو تو پاس دکھائی دیتی ہے۔ یہاں

کا ہی دیا گیا حوصلہ اور راہنمائی ہے کہ کلامِ غالب کی اولین شرح ''وثوقِ صراحت'' جو تب ان کی نگرانی میں کیا گیا، محض ایم اے کا ایک تدوینی مقالہ تھا آج صحیح معنوں میں ایک تحقیقی و تدوینی کتاب کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔ آمین

سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس مقام تک لانے والے میرے بے حد شفیق اساتذہ ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ ترین جن کی شفقت اور محبت مجھے ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے کا درس دیتی ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد جو اپنی ذہانت اور وسیع مطالعے کے سبب نہ صرف شوقِ علم کی آبیاری کرتے ہیں بلکہ اپنے طلباء کے ذہن میں علم اور عصری تقاضوں کی ہم آہنگی کے سوالات کی تخم ریزی بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عقیلہ جاوید جو اپنے صفاتی نام کی آئینہ داری کرتے ہوئے زندگی کی تصویروں کے کئی رخ میرے سامنے وا کر دیتی ہیں۔ شعبے کے بھی معتبر اساتذہ ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی، ڈاکٹر شازیہ عنبرین، ڈاکٹر آصف، ڈاکٹر فرزانہ، ڈاکٹر سجاد نعیم، ڈاکٹر حماد رسول اور ڈاکٹر خاور نوازش جیسے لوگ اس شعبے کا افتخار ہیں اور جن کی علم دوستی طلباء کے لیے مینارۂ نور ہے۔

کچھ لوگ سایہ دار اشجار کی مانند ہوتے ہیں جن کا وجود فیض رسانی کا ایسا چشمہ ہوتا ہے جس میں اپنے پرائے کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی، جن کے وجود کا حاصل محض تھکے ماندے مسافروں کو سفر کی کلفت سے نجات دے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ دینا ہوتا ہے۔ بالکل ایسا ہی حوالہ رانا عمر خان صاحب کا ہے۔ تدوین و تحقیق کے اس مرحلے میں کئی باریک نکات انھوں نے ہی مجھے سمجھائے۔ یہی نہیں بلکہ ابتداء سے پروف ریڈنگ تک کے مشکل مراحل میں بھی انھوں نے کمال شفقت سے میرا ساتھ دیا۔ خدائے پاک انھیں شاد و آباد رکھے۔ (آمین) ایک اور شخصیت جن کا شکریہ ادا نہ کرنا زیادتی ہوگی ڈاکٹر سہیل عباس خاں، جنھوں نے اشاعت سے قبل نہایت انہماک سے کتاب کے آخری مسودے کو اغلاط سے پاک کیا، ان کے لیے نیک تمنائیں۔

اور وہ جن سے میری کائنات کی تکمیل ہوتی ہے، میرا معتبر حوالہ ''خرم علی خان'' جن کی دی گئی محبت اور اعتماد اس سفرِ زیست کا حاصل ہے۔ ''خنساء'' اور ''انفیہ'' جو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ میری شفیق خالہ اور میرے بہت پیارے ماں باپ خدائے لم یزل ان کا سایہ مجھ پر ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ (آمین)

"وثوقِ صراحت" غالب شناسی کی روایت کا ایک اہم تاریخی حوالہ ہے۔ جس کی تدوین میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں۔ مجھے امید ہے جستجوئے شوق کا یہ استعارہ میری طرح اہلِ علم و بصیرت کے لیے بھی آسودگی کا باعث ہوگا۔ آخر میں اہلِ علم و دانش سے ملتمس ہوں کہ اس کتاب کی پیشکش میں اگر کوئی سقم رہ گیا ہو یا کوئی فروگذاشت سرزد ہوئی ہو تو اس کی ضرور نشاندہی فرمائیں تا کہ اگلی اشاعت میں اس کا ازالہ کیا جا سکے۔

حنا جمشید
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ساہیوال

۱۱جون، ۲۰۱۸ء

maablib.org

مقدمہ

کلامِ غالب فکری و تخلیقی علویت کا وہ شاہکار جس کی وسیع تر معنیات اور لسانی تشکیلات کو سر کرنے کی سعی ایک زمانے سے ہوتی چلی آئی ہے۔ ہر دور میں شارحین و ناقدین نے کلامِ غالب سے فکر و معنی کے نت نئے جوہر تراشے ہیں۔ عہدِ غالب سے شروع ہونے والے بصیرت و ادراک کے اس سفر کو معاصرین، متاخرین اور متقدمین نے اپنی اپنی قابلیت اور علمی استعداد کے بل پر نہ صرف وسعت دی بلکہ اسے فکر و معنیات کی نئی جہات سے بھی متعارف کرایا۔ اس قبیل میں وہ عقیدت مند بھی شامل ہیں جنھوں نے اس کلام کو ایک الہامی کتاب کا سا تقدس دیا اور وہ بیگانے بھی جو غالب کے تخلیقی جوہر سے نظریں چرا کر غالب شکن کہلائے۔ تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اپنی انفرادی فکری صلاحیتوں اور تنقیدی معیارات کے بل پر ہر نیا شناور غالب شناسی کی اس روایت کو ایک نئی توسیع سے ہمکنار کرتا آیا۔ شارحین و ناقدینِ غالب کی کثرتِ اختلافات نے نئے اور کثیر فکری مباحث کو جنم دیا۔

ترسیلِ معنی کی روایت جس کی ابتدا خود غالب سے ہوتی ہے حالی، نظم طباطبائی، شوکت میرٹھی، حسرت موہانی، مولانا سہا، عبدالباری آسی، جوش ملسیانی، اثر لکھنوی سے ہوتی ہوئی عبدالرحمن بجنوری، خورشید الاسلام، احتشام حسین، ظ۔ انصاری، شمس الرحمن فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسی ہستیوں تک آ پہنچتی ہے۔ یہاں سبھی نے اپنا اپنا غالب دریافت کیا ہے، اپنے اپنے انداز سے کلام پر رائے زنی اور تشریح و توضیح کی ہے۔ شارحین و ناقدین کے ہاں کلامِ غالب سے اخذ کردہ فکر و معنی کی کئی جہات ہیں۔ غالب نازک خیالی، ندرتِ مضامین، معنی آفرینی، تنوع، فلسفہ ہائے غم و زیست غرض

کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے دامن تہی کیا گیا ہو لیکن اسیرانِ غالبؔ کی تشنگی ہنوز باقی ہے۔ "وثوقِ صراحت" کی تدوین بھی شوق کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس میں غالبؔ کی تخلیقی علویت کا تعین ماضی کے اوراق میں گم "کلامِ غالبؔ" کی معنی شناسی کی ابتدائی کڑی "وثوقِ صراحت" کی بازیابی و تدوین سے کیا گیا ہے جو نہ صرف عظمتِ غالبؔ کا اعتراف و ادراک ہے بلکہ غالب کی فکری و معنوی توسیع کی روایت میں بھی ایک بیش قیمت تاریخی اضافہ ہے۔

دیکھا جائے تو تفہیمِ غالبؔ کے سلسلے میں جو سب سے پہلی مشکل درپیش ہوتی ہے وہ کلامِ غالبؔ کی فنی و فکری معنویت کا ادراک و شعور ہے۔ جس کی آگہی پانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس راہ میں پیش آنے والی اولین رکاوٹ غالبؔ کی حد درجہ مشکل و مفرس تراکیب، پیچیدہ بیانی اور دوررس تشبیہات و استعارات کا استعمال ہے۔ اس کی وجہ ابتداء میں مرزا کا بیدلؔ کی روش اختیار کرنا تھا۔ جن کی شاعری نہ صرف بذاتِ خود فلسفیانہ، پیچیدہ اور دقیق نکات کی حامل ہے بلکہ تصوّف کے اسرار و رموز سے بھی مالا مال ہے۔ سو مرزا نے بھی مشقِ سخن اسی قسم کے کلام سے شروع کی جس میں فارسیت کا غلبہ زیادہ تھا یہی نہیں بلکہ تصوف اور دیگر موضوعات کے مضامین بھی نہایت پیچیدہ اور گنجلک تھے۔ مثلاً:

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

مے کدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

سو اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کے اشعار اور ان کے مضامین جب لفظی بازی گری میں اُلجھے تو معانی اور فکر کو بھی مہمل کر گئے۔ اہلِ ذوق اور ناقدانِ سخن نے انھیں برا سمجھا لیکن غالبؔ کے لیے طرزِ بیدل ایک فخریہ احساس کے طور پر ہی سامنے آیا۔ اس کا ذکر اپنے ایک مقطع میں انھوں نے کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ:

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

غالب کو اپنی فارسیت اور مشکل گوئی پر ہمیشہ ناز رہا۔ وہ اپنے فارسی کلام کو ہی اپنا جوہرِ اصل سمجھتے تھے جبکہ اپنے اردو کلام کو انھوں نے کبھی درخورِ اعتنا ہی نہ جانا تھا۔ حالانکہ انھیں شہرت اور بقائے دوام اسی مختصر اردو کلام ہی کی بدولت حاصل ہوئی۔

غالب کے معاصرین میں شیخ امام بخش ناسخ، حکیم مومن خان مومن، شیخ محمد ابراہیم خاں ذوق، مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں وغیرہ شامل تھے۔ اگرچہ مرزا غالب نہایت صلح کل اور وسیع المشرب شخص تھے لیکن چونکہ مرزا اپنے سامنے کسی اور کی عظمت کی قائل نہ ہوتے مزید برآں اپنی مشکل گوئی اور پیچیدہ بیانی کے سبب ان کا کلام اکثر و بیشتر معترضوں کے طنز کا نشانہ بنا رہتا، جن میں مولانا آزردہ، ذوق اور ان کے شاگرد خاص طور پر پیش پیش ہوتے۔ اسی لیے غالب کو بھی ہمیشہ اپنے زمانے سے قدر ناشناسی کا گلہ ہی رہا۔

کلامِ غالب کے دقائق کا احساس خود عہدِ غالب میں ہی اس درجہ تک موجود تھا کہ غالب کے معاصرین اور دوست واحباب جب خود غالب کے مہمل اشعار کو سمجھ نہ پاتے تو خط لکھ کر غالب سے اُن اشعار کے معنی پوچھتے۔ معنی آفرینی اور نازک خیالی مرزا غالب کا شیوۂ خاص تھا لیکن چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور مزید برآں طبیعت بھی مشکل گوئی پہ مائل رہتی، سو مرزا کا کلام عام آدمی کی فہم سے بالاتر ہو جاتا۔ ایک دفعہ مرزا ایک مشاعرے میں تشریف لے گئے وہاں حکیم آغا جان عیش نے جو طبعاً ظریف اور خوش طبع شخص تھے مرزا کے بارے میں یہ شعر کہے:

مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے — اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے — کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے

اس قسم کے شعراء کی نکتہ چینی اور شکایتوں کی تعداد جب بڑھنے لگی تو مرزا نے کمال بے اعتنائی برتتے ہوئے اپنے چند اشعار سے اس کا جواب کچھ اس طرح سے دیا۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اسی طرح ایک جگہ ان معترضین کی کم فہمی کا گلہ کچھ یوں کرتے ہیں:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اُسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

یوں مرزا کے لیے بذاتِ خود بھی یہ "مشکل گویم و گرنہ مشکل گویم" کا مسئلہ رہا۔ چونکہ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ طبیعتاً مرزا خود بھی بڑے نازک خیال اور دقت پسند تھے سو کلامِ غالب کے انہی دقائق کو حل کرنے کے لیے متعدد مکمل اور جزوی شروح لکھی گئیں۔ جن میں طباطبائی، شوکت میرٹھی، عبدالباری آسی، حسرت موہانی، جوش ملسیانی، بیخود، سعید، مولانا حالی، نیاز فتح پوری کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شرح لکھنے کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ کیونکہ شارحین اور قارئین دونوں کے ہاں احساسِ تشنگی ہے کہ مٹتا ہی نہیں جس کی وجہ کلامِ غالبؔ کی وہ تخلیقی علویت ہے جس نے فکروفن کی بصارت سے بھرے اس خزانے کو ہمیشہ تابناک رکھا ہے۔

کلامِ غالبؔ کی ابتدائی تشریحات میں جو کتاب سرِ فہرست نظر آتی ہے وہ "عبدالعلی والہ" کی ہے۔ جس کا تاریخی نام "وثوق صراحت" ہے۔ یہ شرح اپنی ایک تاریخی اہمیت بھی رکھتی ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے ایک مضمون "غالب کی شرحیں" میں غالب کی اولین شرح لکھنے کا سہرا احمد حسن شوکت میرٹھی کے سر باندھا ہے لیکن اس بارے میں انھوں نے کوئی مستند حوالہ نہیں دیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے نزدیک:

"لہٰذا ہماری رائے میں یہ روایت معتبر نہیں ہے۔ شوکت میرٹھی نے ایک رسالہ 'پروانہ' کے نام سے ستمبر ۱۸۹۵ء میں میرٹھ سے جاری کیا۔ اس کے متعدد رسالے ہماری نظر سے

گزرے ہیں۔ 'پروانہ' کے بعد کے شماروں میں شوکت میرٹھی نے کلامِ غالب کی شرح بالاقساط شائع کی۔ اگست ۱۹۰۲ء کے شمارے میں موصوف نے صفحہ نمبر ۲۶ میں پہلی بار اعلان کیا۔ 'حل کلیاتِ اردو مرزا غالب'۔ اب یہ حل کتابی صورت میں بعد ترمیم و تکمیل چھپ گیا ہے۔ اخباروں میں اس کی دھوم ہے۔ پس ناظرینِ 'پروانہ' بھی ایک ایک جلد ضرور طلب فرمائیں۔ قیمت بھی کم ہوگئی ہے، یعنی صرف ایک روپیہ۔"(۱)

اس طرح اس قبیل کی سب سے پہلی کوشش ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، کی دریافت کے مطابق غالب کی زندگی میں درگا پرشاد نے کی تھی۔ جس میں کُل ۱۴۷ اشعار کی شرح ڈاکٹر موصوف اپنے ایک مقالے میں پیش کر چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے قمرالدین راقم کی شرح کا ذکر کیا ہے مگر وہ منظرِ عام پر نہ آسکی۔

"ڈاکٹر اکبر حیدری" کی رائے میں:

"دیوانِ غالب کی اوّلین شرح لکھنے کا شرف حیدر آباد دکن کے ایک عالم جید اور شاعر با کمال مولوی عبدالعلی تخلص والہ کو حاصل ہے۔ کتاب نادر و نایاب ہے۔"(۲)

اسی طرح "شان الحق حقی"، "بیانِ غالب" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

"دراصل پہلی کتاب جو صرف کلامِ غالب کی شرح کے طور پر لکھی گئی عبدالعلی والہ کی تھی جو ۱۸۹۳ء میں مدراس میں چھپی۔ تاریخی نام وثوق صراحت ہے۔ (۱۳۱۳ھ) اس کا انداز کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ مولانا حسرت موہانی نے اپنی شرح میں اختیار کیا یعنی جستہ جستہ اشعار پر نہایت مختصر حواشی۔"(۳)

لیکن یہاں ہمیں ایک جگہ اس رائے سے اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جب تقویم میں ۱۳۱۳ھ کا سال عیسوی دیکھا گیا تو وہ ۱۸۹۵ء تھا ۱۸۹۳ نہیں۔ لہٰذا یہ شرح غالباً ۱۳۱۳ھ یعنی ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی ہوگی۔(۴)

اگرچہ عبدالعلی والہ کے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے دستیاب نہیں تاہم اتنی معلومات ہیں کہ اُن کے والدِ بزرگوار کا نام "مولوی محمد مہدی" تھا۔ وہ بھی عالم فاضل اور فارسی کے عمدہ شاعر تھے عبدالعلی والہ اپنے آبائی گھر میں ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲) میں شہر مدراس میں پیدا ہوئے اور حیدر آباد دکن میں پروان چڑھے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ "حیدر آباد دکن" شروع سے ہی علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا مرقع

رہا ہے۔ اس کا شمار ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستوں میں ہوتا تھا یوں اس کو علم وادب کے ایک مرکز کی سی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جہاں ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی گئی۔ ''نظام کالج حیدر آباد'' کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کالج نے برصغیر پاک و ہند میں علومِ اسلامیہ اور اُردو زبان کی تعلیم و تربیت میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ ''نظام کالج حیدر آباد دکن'' کی تاریخی حیثیت بھی مسلّم ہے۔ یہی وہ کالج ہے جس میں تاریخ کی کئی مایہ ناز ہستیوں نے درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ عبدالعلی والہ بھی عرصہ دراز تک اسی کالج سے وابستہ رہے۔ آپ وہاں اردو زبان وادب کے پروفیسر تھے اور بی۔ اے کے طلباء کو مرزا غالبؔ پڑھاتے تھے۔

عبدالعلی والہ اردو ہی نہیں بلکہ فارسی زبان وادب پہ بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ غالبؔ کے پیچیدہ اور دقیق اشعار کے معانی اور مضامین کو بھی اپنے شاگردوں کے سامنے کھول کے رکھ دیتے۔ فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر اور زبردست شخصیت کے مالک ترک علی شاہ ترکی قلندر نورمحل اپنے تذکرے میں عبدالعلی والہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''عالم متبحر بود و باشعرِ فارسی خصوصیت داشت۔ مردمِ ایران و ہندوستاں آں مجمع صفاتِ سعدی دکنی می گفتند۔ عرصہ بست و ہست سال می شود کہ شے در مشاعرہ کدام نواب از دور دیدہ بودم۔ مردِ معمر معلوم نی شود، مگر با ہم گفت گو نہ شدہ''(۵)

عبدالعلی والہ کا انتقال ۶۳ برس کی عمر میں ۱۳۱۱ھ بمطابق ۱۸۹۳ سال عیسوی حیدر آباد دکن میں ہوا۔ آپ مرضِ دق میں مبتلا تھے۔ جو آخر جان کے ساتھ ہی گیا۔ آپ کی وفات پر کئی لوگوں نے تاریخِ وفات کہی۔ فارسی کے بہت مشہور شاعر اور نظامِ دکن کے استاد غلام قادر گرامی نے آپ کی وفات پر یہ تاریخ کہی۔

والہ آں فخرِ خطۂ مدراس — اے گرامی مگر ندانی مُرد
باہمہ دانش تواں گفتن — در دکن انوری ثانی مُرد
آب و رنگِ سخن نماند، افسوس — بلبلِ گلبنِ معانی مُرد
در سخن ہمنوائے من او بود — آوخ آوخ کہ یارِ جانی مُرد
دفتر و خامہ را بآب انداز — کان شہنشاہ خوش بیانی مُرد
سالِ مرگش ز روئے ماتم چیست — شاہ اقلیمِ نکتہ دانی مُرد

اُردو اور فارسی کے شاعر سید فرخند علی تخلص طاہر نے اُردو میں یہ تاریخ کہی۔

عازم جنت، ہوئے جب والہ حسنِ سخن   شاعر فخر اجلّہ   مولوی عبد العلی
کی رقم تاریخ طاہر نے، سُن اے عبد العلی   بیت جنت میں ہیں قبلہ مولوی عبد العلی

اب اگر "جنت میں ہیں قبلہ مولوی" کے الفاظ کو علم الاعداد کی رو سے جمع کیا جائے تو سن ۱۳۱۱ھ سامنے آتا ہے۔

تصانیفِ عبد العلی والہ

عبد العلی والہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کچھ کتابیں سالار جنگ میوزیم میں بھی موجود ہیں۔

وجدانِ فارسی

ان کی نمایاں کتابوں میں "وجدانِ فارسی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ دیوان ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں سولہ صفحات کے دو جزو شامل کیے گئے ہیں ان میں سلطان العلماء والشعراء آقا سید علی شوستری تخلص طوبیٰ کا گراں قدر مقالہ عربی وفارسی میں بغیر کسی عنوان کے مقدمے کے طور پہ درج کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اکبر حیدری اس میں والہ کی شعری خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔(۶)

چمنستانِ بہشت

"دیوانِ والہ" "مطبع فخر نظامی، واقع حیدر آباد دکن میں باہتمام وزیر علی مالک مطبع ۱۱ ذیقعد ۱۳۱۲ھ ہے۔ عبد العلی والہ کے بیٹے محمد عبد الواجد تخلص واجد اور ان کے ایک عزیز محمد عبد الولی نے اس دیوان کو مرتب کیا۔ عبد الواجد نے دیوانِ والہ کا تاریخی نام "چمنستانِ بہشت"(۷) رکھا تھا۔ جس سے عبد العلی والہ کی تاریخ وفات اور ترتیب دیوان کی تاریخ یعنی ۱۳۱۱ھ کے تاریخی اعداد نکلتے ہیں۔ اس دیوان میں ۹ قصائد، ۴ مرثیے، ایک خمسہ، ۱۳۲ قطعات اور ۱۹۳ رُباعیات کے علاوہ غزلوں کے ۱۳۳۴۸ اشعار ہیں۔ جبکہ ایک ہفت بندی بھی ہے۔

صفحہ نمبر ۲ پر فیض محمد خاں ریحانی نے اردو میں کچھ اس طرح اس کی تاریخِ طبع کہی ہے۔(۸)

دیوان جناب والہٗ مرحوم کا چھپا
سچ تو یہ ہے بیاں فصیح و بلیغ ہے

سن کر یہی زباں اسے اہلِ کمال کے
تاریخ لکھ ''زبان فصیح و بلیغ ہے''

''زبان فصیح و بلیغ ہے''۔ اگر ان الفاظ کو علم الاعداد کی رو سے جمع کیا جائے تو ۱۳۱۱ھ کا سن نکلتا ہے یعنی یہ ۱۸۹۳ء سال عیسوی ہے۔

گلستانِ نثر

عبدالعلی والہ نظم کی طرح نثر میں بھی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی نثری کتاب کا نام ''گلستانِ نثر''(۹) ہے۔ یہ بھی تاریخی نام ہے۔ علم الاعداد کی رو سے اس سے ۱۳۱۱ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ اس میں ۳۷ اقطعات ہیں۔ ابتداء میں ۱۲ صفحات کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد ''نواب محبوب علی خاں'' نظامِ دکن کی تعریف میں ایک قصیدہ ہے۔ عبدالعلی والہ باکمال انشاء پرداز تھے۔ اس کتاب میں ان کی انشاء پردازی کے کئی نمونے ہیں۔ بعد ازاں عبدالعلی والہ کے بیٹے عبدالواجد نے عبدالعلی والہ کے انتقال کے سلسلے میں لوگوں کے تعزیت نامے بھی اس میں شامل کر دیے۔ یہ کتاب ۲۶۶ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع عزیز دکن سے ۱۳۱۱ھ میں شائع ہوئی۔(۱۰)

وثوقِ صراحت

''وثوقِ صراحت''(۱۱) دیوانِ غالب کی اولین شرح ہے۔ ''وثوقِ صراحت'' اس کا تاریخی نام ہے۔ علم الاعداد کی رو سے اس سے ۱۳۱۱ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ یہ شرح ۱۸۹۳ء میں پہلی بار لکھی گئی۔ جبکہ عبدالعلی والہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے عبدالواجد نے اسے ۱۸۹۵ء یعنی ۱۳۱۳ھ میں شائع کرایا۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

> ''اردو دیوانِ غالب کی شرح، بطرزِ تازہ و پاکیزہ، مفید منتہیاں، جس کا تاریخی نام ہے ''وثوقِ صراحت''۔ جس کو بستانِ سخنوری کے استادِ کامل، حضرت مولانا ''مولوی محمد عبدالعلی'' المتخلص بہ والہؔ (رحمۃ اللہ علیہ) نے تصنیف فرمایا۔ باہتمام وزیر علی مہتمم مطبع نامی فخر نظامی، واقع حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی۔''(۱۲)

چونکہ ''وثوقِ صراحت'' مختصر سے مختصر اشارات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے سرورق پر یہ عربی مقولہ درج ہے:

مَا قَلَّ وَدَلَّ خَیْرًا مِمَّا کَثُرَ وَ اَلْهیٰ

ترجمہ: ''جو قلیل ہے اور دلالت کرتا ہے، بہتر ہے اُس سے جو کثیر ہے اور گمراہ کرتا ہے۔''

مثال کے طور پر غالب کے اِن اشعار پر عبدالعلی والہ نے چند حرفی حاشیہ اس طرح لکھا ہے کہ:

؎ جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

''شوق: شوقِ عاشق جو شائقِ قتل ہے۔''(۱۳)

چونکہ عبدالعلی والہ نظام کالج حیدر آباد دکن میں اُردو کے استاد تھے اور طلباء کو غالبؔ پڑھایا کرتے تھے۔ لہٰذا درس و تدریس کے دوران انھوں نے جو مشکل الفاظ کے معنی بتائے اور کلامِ غالب کی جو تشریحات کیں وہ دیوان کے حاشیے پر ہی لکھتے رہے۔ اس طرح اس کی ایک مختصر سی شرح بن گئی۔ اس شرح کے دیباچے میں عبدالعلی والہ کے بیٹے عبدالواحد کا بیان بھی یہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس خاکسار کے والد مرحوم جب نظام کالج میں بی۔ اے کی کلاس کو اردو دیوان مرزا غالبؔ دہلوی کا پڑھاتے تھے تو اس کے اُن مقامات پر جن کو شرح طلب جانتے اور ایسی مشکلات پر جن کو حل کے قابل سمجھتے، شرح اور حل لکھ دیتے۔''(۱۴)

یہ شرح طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہے۔ مشکل الفاظ کے معنی بیان کرنے میں اور مبتدی کو شعر فہمی میں مدد دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ ذوقِ شعری کی تربیت و پرورش بھی کرتی ہے۔ آج کے دور میں عروض و قوافی، علمِ بیان و بدیع، فی الجملہ علمِ بلاغت سے عمومی بے رغبتی پائی جاتی ہے۔ جبکہ اگلے وقتوں کے اساتذہ اس پر بھی توجہ دیتے تھے۔ ''وثوقِ صراحت'' اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

عبدالعلی والہ اس شرح کو جلد از جلد مکمل اور نظرِ ثانی کر کے اس کو ''نواب عمادالملک بہادر ناظم تعلیمات'' کے حضور پیش کرنا چاہتے تھے لیکن اجل نے مہلت نہ دی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے عبدالواحد نے اس شرح کو عبدالعلی والہ کی وصیت کے مطابق شائع کر دیا۔ لیکن صد افسوس کہ عدیم الفرصتی کے باعث عبدالواحد اس شرح پر نظرِ ثانی نہ کر سکے۔ وہ خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''ایں شرح دیوانِ اردو، شاعرِ نازک خیال، صاحب کمال بلند پایہ مرزا غالبؔ۔۔۔ مصنف فخر الشارحین۔۔۔ حضرت مولانا شیخ عبدالعلی المتخلص بہ والہؔ دکنی المدراسی المولد حیدر آباد۔۔۔ بہ جد و جہد بلیغ شاعر ادیب صاحب الفضائل والمناقب مولوی عبدالواجد

۔۔۔خلف الصدق حضرت شارح مرحوم بحسب وصیت شارح مغفور۔۔ بحلیۂ طبع مزین گردید۔"(۱۵)

یوں تو اس شرح کی کئی تواریخ کہی گئیں جن میں نمایاں "مرزا محمد تقی" تخلص تقی کی تاریخ تھی جو کچھ یوں تھی:

اے تقی طبع ہوئی حضرت والہ کی وہ شرح — جس کے سب اہلِ سخن تھے بہ دل و جاں طالب
طبع کا سال لکھا میں نے یہ منقوطہ میں — لِلّٰہ الحمد ہوئی شرح کلامِ غالبؔ (۱۶)

اس شرح کے کُل ۱۹۲ صفحات ہیں۔ آخری قطع میں عبدالواجد کا لکھا ہوا سالِ طبع ہے۔ غزلیات کی شرح صفحہ نمبر ۱۸۰ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۱۳۲ ہے جبکہ آخری شعر یہ ہے:

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

صفحہ نمبر ۱۸۱ تا ۱۸۳ پر "شرح بعض ادبیاتِ قصائد" دی گئی ہے۔ جس میں ۱۱۶ اشعار کی شرح درج ہے۔ اس طرح کل ۱۱۴۸ اشعار ہو جاتے ہیں۔ خاتمۃ الطبع کے بعد بھی کئی تواریخ ہیں۔ بقول ڈاکٹر اکبر حیدری:

"غالباً والہ کے پیش نظر شرح لکھتے وقت دیوانِ غالبؔ کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۷ء رہا ہوگا۔ اس ایڈیشن میں بھی کم و بیش اتنے ہی اشعار ہیں۔"(۱۷)

عبدالعلی والہ کی یہ شرح دیوانِ غالبؔ اپنی ایک خاص تاریخی اہمیت کی حامل شرح ہے۔ چونکہ اس شرح میں بیشتر مقامات پر صرف مشکل الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں اور اگر کہیں اس سے زیادہ کی ضرورت محسوس بھی کی گئی تو بھی شعر کی شرح کو غیر ضروری تفاصیل سے گریز کرتے ہوئے مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ شرح اپنے اختصار اور جامعیت کی بدولت مفید اور کارآمد ہے۔ عبدالعلی والہ نے اشعار کی شرح کرتے وقت آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ بعض جگہوں پر اشعار کا پس منظر اور اس میں موجود تلمیح بھی بیان کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں:

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

عبدالعلی والہ نے شعر کی شرح کرتے وقت اس واقعے سے متعلقہ قرآنی آیت کا بھی حوالہ

دیا ہے۔جیسا کہ والہ لکھتے ہیں کہ:

شرح: ''جاء الحق۔۔ کان زھوقا، یعنی حق آیا اور باطل مٹ گیا۔بے شک باطل مٹنے کے قابل تھا۔پیغمبرِ اسلام نے کعبے کو بتوں سے پاک کر ڈالا۔''

اردو کے مشہور شاعر و ادیب ''منشی نوبت رائے'' اپنے رسالے ''خدنگِ نظر'' میں وثوقِ صراحت پر تبصرہ درج ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

''وثوقِ صراحت'' نام کی ایک شرح کلیاتِ اردو مرزا غالب اکبر آبادی مرحوم پر حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔اس پر ہماری رائے طلب کی گئی ہے۔ہم غالب کے دیوان کو حل طلب نہیں بلکہ تبصرہ طلب خیال کرتے ہیں اور متمنی ہیں کہ ملک میں کوئی اور ایسا پیدا ہو جو غالب کے کلام کی نزاکتیں اور اس کے حکیمانہ خیالات پر ایک مبسوط تبصرہ تیار کرے، لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا اس وقت تک یہ شرحیں بھی غنیمت ہیں جو لفظی معانی سمجھا سکتی ہیں اور غالب کے دقیق کلام کو عام فہم بنا سکتی ہیں۔''(۱۸)

وثوقِ صراحت کے اختتام پر یہ قطعہ درج ہے جس سے وثوقِ صراحت کی تاریخِ تصنیف نکلتی ہے۔

شد چو آراستہ ز چاپ ایں شرح　　ساقی عقل خواست زیبا حال
گفت و اجدز انتہای ادب　　شرح دلکش نشاط افزا سال(۱۹)

اب اگر ''شرح دلکش نشاط افزا'' کو علم الاعداد کی رو سے جمع کیا جائے تو ۱۳۱۱ ہجری کا سن نکلتا ہے۔جو کہ وثوقِ صراحت کا سالِ تصنیف ہے۔

عبدالعلی والہ کے فرزند عبدالواجد المتخلص واجد بھی عربی اور فارسی کی جلیل القدر اساتذہ میں سے تھے۔وہ حیدر آباد ہائی سکول علاقہ سرکار نظام میں فارسی پڑھانے جاتے تھے۔وہ خود بھی اپنے والد بزرگوار کی مانند غالب شناس تھے۔انھوں نے غالب کے دیوانِ اردو کی فارسی شرح ''وجدانِ تحقیق'' کے نام سے ۱۹۰۱ء میں مرتب کی۔افسوس کہ عبدالواجد کے حالاتِ زندگی بھی عبدالعلی والہ کی طرح مفصل دستیاب نہیں۔تاہم اُن کے بارے میں ترک علی شاہ ترکی قلندر نورمحل اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ:

''واجد تخلص۔خلفِ مولوی عبدالعلی والہ مرحوم حیدر آبادی شاعر جدیست وصاحب علم وصاحب دیوانِ فارسی۔با فقیر شناسائی دارند۔دو سہ بارو مشاعرہ عبداللہ خاں ضیغم ملاقات شدہ۔بسیار صاحب خلق و ادب نظر آمد۔''(۲۰)

عبدلواجد نے دیوانِ غالب کی فارسی شرح لکھ کر گویا اپنے والد عبدالعلی والہؔ سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی اور وہ اس ضمن میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ عبدالواجد کے نام سے ناواقف ہیں۔ تاہم یہ بات عرض کی جاتی ہے کہ عبدالواجد اُن ابتدائی لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے آج سے تقریباً سو سال قبل غالبؔ کی مفصل فارسی شرح لکھی۔ ''وجدانِ تحقیق'' کلامِ غالبؔ کی وہ فارسی شرح ہے جو صرف ردیف ''الف'' پر مشتمل ہے۔ یہ کلامِ غالبؔ کی قدیم، ابتدائی، مفصل اور نادر فارسی شرح ہے۔ ایک ایک شعر کی تشریح کئی کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ تائید میں فارسی مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ یہ شرح، شرح غالبیات میں بڑی اہم اور تاریخی ہے۔ گویا عبدلواجد نے اپنے والد عبدالعلی والہؔ سے ایک قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مثل مشہور ہے:

''اگر پدر نتواند پسر تمام کند''

عبدالواجد نے اپنی شرح ''وجدانِ تحقیق'' کو ''وثوقِ صراحت'' کا ضمیمہ قرار دیا ہے۔ وہ خود اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> ''جب رسالہ 'وثوقِ صراحت' میری کوشش سے مجتمع ہو کر چھپ گیا۔ اسی دوران میں میرا یہ ارادہ ہو گیا کہ اس کا ضمیمہ لکھ لوں۔ مگر قلتِ فرصت کی وجہ سے ایک مدّتِ معینہ میں مسلسل یہ کام نہ کر سکا۔ کبھی کبھی، کچھ کچھ غرض جب طبیعت ادھر آ گئی، لکھتا رہا اور اس کام سے ہمہ تن غافل نہ رہا آخر یہ کام ایک مدّت کے بعد خدائے ذوالجلال کے افضال واکرام سے اپنے انجام کو پہنچا اور یہ ضمیمہ میرے ارادے کے موافق کامل اور پورا ہو گیا۔ بعد اختتام کے میں نے اس کے دو نام رکھے۔ ایک ''وجدانِ تحقیق'' اور دوسرا ''توضیح اشاراتِ والہ''۔ (۳)

''وجدانِ تحقیق'' حصہ اوّل (ردیف الف) مطبع فخرِ نظامی حیدر آباد دکن میں آج سے لگ بھگ سو سال قبل ۱۳۱۹ ہجری بمطابق ۱۹۰۱ سالِ عیسوی شائع ہوئی۔ اس حساب سے یہ شرح آج سے کوئی ۱۱۵ سال پرانی ہے۔ ابتداء کے ۳۴ صفحات میں متعدد اساتذہ کی تواریخ درج ہیں۔ ان میں سید محمد کاظم حسین تخلص شیفتہؔ میر نوازش علی لمعہ اور میر یاور علی اعظم قابلِ ذکر ہیں۔ صفحہ نمبر ۳۴ تا ۴۱ صحت نامہ پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے صفحات کے نمبر شروع کیے گئے ہیں۔ صفحہ ا تا ۱۳۷ پر کلامِ غالبؔ کی ردیف الف کی شرح اس طرح بیان کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ بھی تشنہ نہیں رکھا گیا۔ پہلا شعر یہ ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جبکہ شرح کا آخری شعر یہ ہے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

سید محمد کاظم حسین شیفتہ کی ''شرح دیوانِ اُردوئے غالبؔ موسوم بہ وجدانِ تحقیق'' کی تاریخِ طبع صفحہ ۲۹ پر موجود ہے۔ جو کہ درج ذیل ہے:

جب مشرّح ہوا اردو دیواں — اور روشن ہوا نامِ غالب
شرح یہ والہؔ و واجدؔ نے لکھی — جس سے ظاہر ہوا مرامِ غالب
مخبرِ سال میں منقوطِ حروف — اب چھپی شرحِ کلامِ غالب (۴۲)

آخری مصرع کو اگر علم الاعداد کی مدد سے دیکھا جائے تو ۱۳۱۹ ہجری یعنی بمطابق تقویم ۱۹۰۱ سالِ عیسوی کے اعداد نکلتے ہیں۔

''وثوقِ صراحت'' از عبدالعلی والہ اور ''وجدانِ تحقیق'' از عبدالواجد، اگر ان دونوں شرحوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایک تضاد جو واضح نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ عبدالعلی والہ نے وثوقِ صراحت میں نہایت اختصار سے کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اشعار میں صرف لغت لکھنے پہ ہی اکتفا کیا ہے۔ جبکہ عبدالواجد کے ہاں شرح اتنی ہی مفصّل ہے۔ مثال کے طور پر عبدالعلی والہؔ نے دیوانِ غالب کے اس پہلے شعر پر چند حرفی حاشیہ لکھا ہے۔ جیسا کہ:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

شرح عبدالعلی والہؔ: ''پیرہنِ کاغذی، فریادیوں کا لباس جو قدیم یمن میں دستور تھا۔ یہ کنایہ ہے عجز و بیچارگی و تظلم زاری سے۔''(۴۳)

جبکہ اسی شعر کی شرح عبدالواجد نے اتنی طویل کی ہے کہ وہ صفحہ ۱ تا ۵ پر مشتمل ہے۔ ساتھ ساتھ فارسی کی دیگر مثالیں بھی دی ہیں۔ یوں وثوقِ صراحت کی بنیادی خوبی اس کا اختصار ہی ہے۔ لیکن یہ شرح اپنے اختصار کی بدولت ہی بیشتر مقامات پر تنقید کی زد میں رہی۔ اس کی وجہ تفہیمِ غالب میں اس

شرح کا اپنے اختصار کے باعث ہی بہت سی جگہوں پر معانی و مطالب کے تقاضوں پر پورا اترنے سے قاصر ہوتا ہے۔ کیونکہ عبدالعلی والہ نے غالبؔ کے کئی دقیق اور مفرس اشعار کو بھی مشکل الفاظ کے معانی لکھ کر یا ایک آدھ سطر میں مدعا بیان کر کے بات ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کلام مزید محتاجِ وضاحت رہتا ہے۔ یوں کلامِ غالبؔ کی تفہیم پورے طور پر نہ ہونے سے قاری کی تشنگی بڑھ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ شرح معاون نہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تمکین کاظمی لکھتے ہیں کہ:

''عام طور پر یہ شرح غالبؔ کی اولین شرح خیال کی جاتی ہے۔ مگر مجھے اس کے شرح کہنے میں ہی تامل ہے۔ اس کو شرح کی بجائے غالبؔ کا ایسا دیوان کہا جا سکتا ہے جس میں لغات حل کیے گئے ہیں۔ ایران و ہندوستان سے بیشتر عربی و فارسی دواوین اور دوسری علمی کتب اس طرح حاشیہ پر حل لغت لکھ کر شائع کی جاتی تھیں۔ یہ بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔''(۲۴)

اسی طرح سے مولانا بے خود موہانی یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ:

''یہ شرح مختصر سے مختصر اشارات کا مجموعہ ہے۔ شارح کے لیے اس کا مفید نہ ہونا ظاہر ہے۔''(۲۵)

اگرچہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کلامِ غالبؔ کے معانی و مفہوم کی وضاحت و تشریح میں یہ شرح کوئی خاص ممد و معاون نہیں ہے تاہم کلامِ غالبؔ کی اولین شرح ہونے کے ناطے اس شرح کی تاریخی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ایوب شاہد اپنی کتاب ''شارحینِ غالبؔ کا تنقیدی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ وثوقِ صراحت کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے اور یہ کہ غالبؔ کے عہد سے قریب افراد کا غالبؔ کے اشعار کے بارے میں کیا رویہ تھا۔ یا ان کی پہنچ کہاں تک تھی۔ ایسی معلومات وثوقِ صراحت جیسی شروح سے ہی مل سکتی ہیں۔''(۲۶)

شرح کی تدوین کے وقت کئی جگہوں پر مشکل مقامات آئے۔ سب سے پہلی مشکل ''وثوقِ صراحت'' کا حصول تھا۔ جس میں محترم ''لطیف الزماں'' مرحوم نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا (حق مغفرت کرے)۔ وہ اپنے ذخیرۂ غالبیات اور دیگر کتب کے معاملے میں حد درجہ حساس اور کسر نفسی سے کام لینے والے تھے، لیکن میرے لیے انھوں نے کمال شفقت سے اپنے اس ذخیرے کا دریچہ وا کر دیا۔ جانے کتنے ہی دن کے تردد اور ایک ایک کتاب کی اتھل پتھل کے بعد انھوں نے اپنے اس ذخیرۂ غالبیات میں سے ''وثوقِ صراحت'' کا انتہائی شکستہ، بوسیدہ اور نادر و نایاب مخطوطہ میرے

لیے ڈھونڈ کر نکالا۔ یہی نہیں بلکہ تدوین کے دوران ''وثوقِ صراحت'' سے متعلق قدیم مواد کی فراہمی کا مشکل مرحلہ بھی ان ہی کی بدولت اپنے انجام کو پہنچا۔

تدوین کے کام میں دوسری دشواری ''وثوقِ صراحت'' کے ابتدائی چند صفحات کی غلط ترتیب تھی۔ اس پہ مستزاد شرح کا قدیم اُردو املاء۔ جس کے بیشتر الفاظ عصرِ حاضر کے اُردو املاء سے قطعی مختلف تھے۔ مثال کے طور پر ''وثوقِ صراحت'' ایک قدیم شرح ہے اور چونکہ اُس زمانے میں ''یائے معروف اور یائے مجہول'' کا بھی قدیم نسخوں کی طرح کوئی خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ سو اسی لیے وثوقِ صراحت میں بھی ''کوئے یار'' اور ''کوی یار'' جیسے الفاظ کی بھی تمیز نہیں رکھی گئی بہت سی جگہوں پر ''ترے'' کو ''تری'' اور ''یعنی'' کو یعنے'' لکھا گیا ہے۔ اسی طرح ''ن غنہ'' کو ہر جگہ ''ن'' لکھا گیا ہے۔ مثلاً ''میں'' کو ''مین'' ''گراں قدر'' کو ''گران قدر'' اور ''ہوں'' کو ''ہون'' لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں دیوانِ غالبؔ کے کچھ الفاظ مثلاً جیسے جہاں کہیں ''قطرے، آئینے' کاشانے یا پردے'' وغیرہ جیسے کچھ الفاظ آئے تو انھیں ''قطرہ، آئینہ، کاشانہ یا پردہ لکھا۔'' رشید حسن خان'' کی کتاب ''املائے غالبؔ'' کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میں نے املا کے ایسے کئی مشکل مقامات کو حل کیا۔ یہی نہیں بلکہ کئی جگہوں پر غالبؔ کے متعدد اشعار بھی غلط درج کیے گئے تھے۔ چونکہ شرح پر نظرِ ثانی نہ کی گئی لہٰذا شرح میں کتابت کی اغلاط بھی کثرت سے موجود تھیں۔ یوں ان اغلاط کی تصحیح و درستی کے لیے کئی نسخوں سے رجوع کیا گیا اور پھر ''دیوانِ غالبؔ، نسخۂ انجمن'' دہلی مطبوعہ ۱۹۸۹ء کو بنیادی نسخہ بنایا گیا۔ شرح کے قدیم، شکستہ اور بوسیدہ ہونے کے باعث جہاں زیادہ ضرورت محسوس ہوئی وہاں بریکٹ ڈال کر قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں متن میں یا متن کی شرح کے لیے درج کیے گئے بعض ایسے اشعار جن کو وثوقِ صراحت میں غلط لکھا گیا تھا لیکن ان کی درستی سے شرح پر اثر پڑتا تھا اُن کو جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ البتہ حواشی میں ان کی نشاندہی اور اصلاح ضرور کر دی گئی ہے۔

چونکہ ''وثوقِ صراحت'' کلامِ غالبؔ کی ایک جزوی شرح ہے جس میں عبدالعلی والہؔ نے کلامِ غالبؔ کی منتخب غزلیات کے منتخب اشعار کی شرح کی ہے۔ کہیں کہیں پوری غزل جبکہ کہیں کہیں کسی غزل کے محض ایک دو یا تین اشعار کی شرح پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس شرح کا جو اشاریہ مرتب کیا گیا ہے اس میں ہر ردیف کی غزل کا پہلا مصرعہ لکھا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں اشاریے میں صرف وہ منتخب غزلیات ہی درج کی گئی ہیں جن کے اشعار کی شرح عبدالعلی والہؔ نے کی ہے۔ قاری

کی آسانیٔ خاطر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس اشاریے کو وثوق صراحت سے قبل جگہ دی گئی ہے۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق عبدالعلی والہؔ نے کلامِ غالب کی شرح کے لیے جہاں حلِ لغت کو سامنے رکھا وہیں کلام کی عددی شرح بھی کی۔ وہ یوں کہ شعر میں مفہوم کی توسیع اور ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے معنوی تناسب ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے کئی اشعار میں شامل الفاظ پر اعداد ڈال دیے ہیں۔ جس کے مطابق مصرع اول میں شامل لفظ جس پر نمبر ا لکھا ہے، کا معنوی رشتہ مصرع دوم کے نمبر ا لکھے گئے لفظ سے جا ملتا ہے۔ سوان اعداد کو بھی جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوسکا کوشش کی گئی ہے کہ شرح وثوق صراحت میں شامل فارسی اشعار، آیات اور ضرب المثل کے معنی حواشی میں درج کر دیے جائیں۔ اسی طرح شرح میں درج کیے گئے اشعار نیز متن میں بھی جہاں جہاں مشکل الفاظ آئے ان کے معانی کتاب کے آخر میں شامل فرہنگ میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ نیز "وثوقِ صراحت" کی تدوین کے وقت عبدالعلی والہؔ کے بیٹے عبدالواجد نے بعدازاں جو "وثوقِ صراحت" کا صحت نامہ مرتب کیا ہے اس کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے باقی ماندہ اغلاط کی درستی کر دی گئی ہے۔ تقویم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سالِ ہجری سے درست سالِ عیسوی بھی درج کیے گئے ہیں۔ معانی و مطالب کی درست تفہیم کے لیے اشعار غالب میں رموزِ اوقاف کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ نیز شرح کلامِ غالب میں جہاں جہاں اشعار کے ذریعے تاریخ کہی گئی ہے اس کو بھی حواشی میں علم الاعداد کے استعمال سے حل کر کے دکھایا گیا ہے۔

اسیرانِ غالب کی تشنگی کے پیشِ نظر، آج کے اس برق رفتار دور میں بھی غالبؔ شناسی کے نت نئے پہلو اور فکری جہات کی دریافت کا عمل مستقل جاری ہے، شارحین و ناقدین کے لیے، کلامِ غالب فکر و معنی کا وہ گنجینہ ہے، جس کی گہرائیوں کو ماپنا آج بھی آسان نہیں۔ اگرچہ عبدالعلی والہؔ کی یہ جزوی شرح کلامِ غالبؔ کی دیگر شرحوں کی مانند، کلامِ غالبؔ پر سیر حاصل تبصرہ، تشریح و معلومات فراہم نہیں کرتی تاہم کلامِ غالب کی اولین جزوی شرح ہونے کے باعث، اسے ایک خاص تاریخی اہمیت حاصل ہے، جس کی بدولت غالبؔ شناسی کی روایت میں یہ قدیم تاریخی شرح، ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ''اکبر حیدری، ڈاکٹر''، ''غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے'' ادارہ یادگارِ غالب کراچی، ۲۰۰۲ء (ص ۲۳۵)

۲۔ ایضاً

۳۔ ''محمد باقر، آغا''، ''بیانِ غالب'' مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۷ء (ص ۲۳)

۴۔ ''ابوالنصیر محمد خالدی''، ''تقویم ہجری وعیسوی'' انجمن ترقی اردو کراچی (ص ۲۶)

۵۔ ''ترک علی شاہ''، ''سخنورانِ چشم دیدہ'' مطبع شمس الاسلام حیدر آباد، ۱۹۱۴ء (ص ۱۴۳)

۶۔ ''اکبر حیدری، ڈاکٹر''، ''غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے''۔ (ص ۲۳۵)

۷۔ ''چمنستانِ بہشت'' ایک تاریخی نام ہے۔ اگر علم الاعداد کی رو سے اس کے اعداد نکالے جائیں تو ۱۳۱۱ ہجری کے اعداد نکلتے ہیں۔ جیسا کہ ''چمنستانِ بہشت'' کے ان اعداد (چ=۳ + م=۴۰ + ن=۵۰ + س=۶۰ + ت=۴۰۰ + الف=۱ + ن=۵۰ + ب=۲ + ہ=۵ + ش=۳۰۰ + ت=۴۰۰) کو اگر جمع کیا جائے تو ۱۳۱۱ کے اعداد بنتے ہیں جو کہ اس کی تاریخ تصنیف ہے۔

۸۔ ''اکبر حیدری، ڈاکٹر''، ''غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے''۔ (ص ۲۳۸)

۹۔ ''گلستانِ نثر'' بھی ایک تاریخی نام ہے جس کے اعداد کچھ اس طرح سے بنتے ہیں۔ (گ=۲۰ ل=۳۰ + س=۶۰ + ت=۴۰۰ + الف=۱ + ن=۵۰ + ن=۵۰ + ث=۵۰۰ + ر=۲۰۰) اگر ان اعداد کو بھی علم الاعداد کی مدد سے جمع کی جائے تو ۱۳۱۱ کے اعداد بنتے ہیں جو اس کا سالِ تصنیف ہے۔

۱۰۔ ''اکبر حیدری، ڈاکٹر''، ''غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے''۔ (ص ۲۳۸)

۱۱۔ ''وثوقِ صراحت'' بھی ایک تاریخی نام ہے۔ جس کے اعداد کو بھی اگر علم الاعداد سے جمع کیا جائے تو اس کا سالِ تصنیف نکلتا ہے مثلاً (و=۶ + ث=۵۰۰ + و=۶ + ق=۱۰۰ + ص=۹۰ + ر=۲۰۰ + الف=۱ + ح=۸ + ت=۴۰۰) کے اعداد کو جمع کرنے سے بھی ۱۳۱۱ کا عدد نکلتا ہے

جو وثوقِ صراحت کا سالِ تصنیف ہے۔

۱۲۔ لوحِ ''وثوقِ صراحت'' از ''عبدالعلی والہ''

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ''عبدالواجد'' ''دیباچہ'' ''وثوقِ صراحت'' از ''عبدالعلی والہ'' ''مطبعِ فخرِ نظامی حیدر آباد دکن، ۱۸۹۵ء،

(ص ۱)

۱۵۔ ایضاً (ص ۲۳۸)

۱۶۔ ایضاً (ص ۱۸۵)

۱۷۔ ''اکبر حیدری، ڈاکٹر'' ''غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے'' ۔ (ص ۲۳۵)

۱۸۔ ''نوبت رائے، منشی'' ''خدنگِ نظر'' رسالہ لکھنؤ جلد ۵، اپریل ۱۹۰۱ء

۱۹۔ اب اگر ''شرح دلکش نشاط'' اور ''افزا'' کو علم الاعداد کی مدد سے جمع کیا جائے تو ۱۳۱۳ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں جو کہ ''وثوقِ صراحت'' کا سالِ تصنیف ہے۔ مثلاً (شرح=۵۰۸ + دلکش = ۳۳۴ + نشاط=۳۶۴ + افزا=۸۹ کا مجموعہ ۱۳۱۱ بنتا ہے)۔

۲۰۔ ''ترک علی شاہ'' ''سخنورانِ چشم دیدہ'' ''مطبع شمس الاسلام حیدر آباد، ۱۹۱۳ء، (ص ۱۳۰)
ضیغم سے مراد یہاں ''تذکرہ یادگارِ ضیغم'' ہے۔

۲۱۔ ''عبدالواجد'' ''وجدانِ تحقیق'' ''مطبع فخرِ نظامی حیدر آباد دکن، ۱۹۰۱ء، (ص ۱)

۲۲۔ ایضاً (ص ۲۹)

۲۳۔ ''عبدالعلی والہ'' ''دیوانِ والہ'' ''مطبعِ فخرِ نظامی حیدر آباد دکن، ۱۸۹۵ء، (ص ۱)

۲۴۔ ''تمکین کاظمی'' ''مشمولہ رسالہ'' ''ہم قلم'' سالگرہ نمبر ۱۹۶۱ء، (ص ۸۷)

۲۵۔ ''بے خود موہانی'' ''گنجینۂ تحقیق بے خود موہانی'' ۔ (ص ۵)

۲۶۔ ''ایوب شاہد، ڈاکٹر'' ''شارحینِ غالب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' (جلد اول) مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ء، (ص ۱۰۵)

اشاریہ

(ردیف الف)

(ردیف ب)

(ردیف ت)

(ردیف ج)

(ردیف چ)

(ردیف د)

(ردیف ر)

(ردیف ز)

(ردیف س)

(ردیف ش)

(ردیف ع)

(ردیف ف)

(قصائد)

(غزل)

maablib.org

ما قلّ و دلّ خیرٌ ممّا کثر و الہیٰ

سبحان اللہ وبحمدہٖ

اُردو دیوان غالب کی شرح

بطرز تازہ و پاکیزہ و مفید مبتدیان

جسکا تاریخی نام ہے

وثوق صراحت

جسکو

دبستان سخنوری کے اوستاد کامل حضرت مولانا مولوی

محمد عبد العلی المتخلص والہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے تصنیف فرمایا

باہتمام وزیر علی مہتمم مطبع

مطبع نامی فخر نظامی واقع حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی

دیباچہ

ظاہر ہو کہ اس خاکسار کے والدِ مرحوم جب نظام کالج میں بی۔اے کلاس کو اُردو دیوانِ مرزا غالب دہلوی کا پڑھاتے تھے تو اُس کے اُن مقامات پر جن کو شرح طلب جانتے تھے اور ایسی مشکلات پر کہ جن کو حل کے قابل سمجھتے تھے شرح اور حل لکھ دیتے تھے۔ چاہتے تھے کہ نظرِ ثانی کے بعد امیر ذی توقیر ارسطوی زمن قدر دانِ علم و فن جامعِ امارت و فضیلت مستغنی عن الالقاب عالی جناب نواب عماد الملک بہادر ناظم تعلیمات ادام اللہ اقبالہ و اجلالہ کے جناب فیض مآب میں اس شرح کو پیش کریں لیکن قضارا مرضِ دق سے بیمار ہو کر اس جہانِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف انتقال کر گئے لہٰذا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔

اگر چہ اس شرح پر نظرِ ثانی نہ کی گئی لیکن نظرِ اوّل ہی میں جو کچھ لکھا ہے نہایت غنیمت اور قابلِ قدر ہے۔ کیونکہ ایک فردِ کامل، سخن گو، سخن دان، سخن فہم اور مسلم الثبوت استاد کی تصنیف ہے۔ اختصار کے ساتھ دقائق کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مقصود و تاویل فوت نہ ہو۔ کہیں فوراً کہیں کچھ تو غض و تامل طالبِ علم کے ذہن نشین ہو جائے۔ حضرت مرحوم کی یہ عادت تھی کہ شرح کو بلا ضرورت ہرگز طول نہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ شرح مختصر مفید ہونی چاہیے۔

اب مجھ کو جو مرحوم کے دیوان اور انشا کے چھپوانے سے فرصت ملی تو اس شرح کو بھی صاف کرا کر اور اس کا تاریخی نام وثوقِ صراحت کہہ کر بغرضِ افادہ چھپوایا۔ امید ہے کہ مقبولِ خاص و عام ہوگی۔ فقط

الراقم

محمد عبدالواجد عفی عنہ

قطعہ تاریخیہ بزبان عالیشان فارسی در مرثیہ ملک الشعرای واقعی حضرت مولانا مولوی محمد عبدالعلی والہ مرحوم از کلامِ بلاغت نظام مخزنِ علوم و معدنِ فنونِ شاعر غرای ہمہ دان مستغنی عن الالقاب عالی جناب فیض مآب مولانا مولوی عبدالحیٔ صاحب وقبلہ المتخلص بوصف مددگار پیمائش و بندوبست علاقہ سرکارعالی مدظلہٗ

بنام یگانہ نامانہ یزدان

والہ تخلص مولوی عبد العلی ‏ صہر من و عم من ، اُستاد من
گوہر فشاں، جوہر نشاں، قدسی مکاں ‏ شیوا زباں، جادو بیاں ، شیریں سخن
کانِ ادب، جانِ حسب، شانِ نسب ‏ بدرِ زمیں ، صدرِ زماں، فخرِ زمن
در شاعری زیرِ فلک بی شایہ ‏ بو دست او فردِ فرید اندر دکن
شاعر چنان نادر بود کز آسماں ‏ مدحش رسد صد گونہ چوں سلویٰ و من
فکرش چو نیساں، ہر زماں گوہر فشاں ‏ طبعش رواں ، مانندِ بحرِ موجزن
فکرش مگو سرچشمۂ آبِ بقا ‏ طبعش مگو سرچشمۂ شہد و لبن

ق

گر فیض او نازان رود در گلستاں ‏ در مہر او نازان رود اندر چمن
آرد برون لعل بدخش از ناروان ‏ آرد بدر مہر درخش از نارون
گہ از دعا گہ از اثر راند بیان ‏ گہ از قضا گہ از قدر گوید سخن

ق

خرش اگر ریز و اثر آرد بدر — سوداز سر دروا ز جگر رنج از بدن
کثرت زگل ذلت زذل شدت زغل — نکہت زگل حرمت زغل جوشش زدن
بربست تا رخت سفر زین گلستاں — ہر کس چو گل برتن دریدہ پیرہن
سوی عدم رفتی چرا ای رہنما — در قد سیان شاید شوی استاد فن
باشد بگورت شمع ایمن گلفشان — وز رحمت یزدان ترا گرد و کفن
وصف حزین، شنید تا این واقعہ — گردیدہ یکسر سینہ کوب و نوحہ زن
بر خواند پیش سوگواران سال را — با نالہ پُر درد و در بیت الحزن

گشتند اکنون بی سر و پا از قضا
درس وکتب، علم و بیاں، شعر وسخن(۲)

۱۳۱۱ ہجری

فقط

حواشی

۱۔ یہ قصیدہ مولوی عبدالحیٔ نے عبدالعلی والہ کی شان میں لکھا ہے۔ یہ فرمانروا حیدر آباد دکن کی سرکار میں ملازم تھے۔

۲۔ اگر اس مصرع میں شعر کے مطابق ہر لفظ کا پہلا اور آخری حرف ہٹا دیا جائے اور درمیان والے حرف کو علم الاعداد کی مدد سے جمع کیا جائے تو ۱۳۱۱ ہجری کے اعداد نکلتے ہیں۔ جیسا کہ درس کا 'ر' کتب کا 'ت'، علم کا 'ل'، بیان کا 'ی' اور 'الف' شعری کا 'ع'، اور سخن کا 'خ'، (ر=۲۰۰، ت=۴۰۰، ل=۳۰، ی=۱۰، الف=۱، ع=۷۰، خ=۶۰۰) ان اعداد کا مجموعہ ۱۳۱۱ ہے جو کہ وثوق صراحت کی تاریخِ تصنیف ہے۔

بسم اللہ الرّحمٰنِ الرّحیم

ردیف الف

۱۔ نقش فریادی ہے[۱] کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

پیرہنِ کاغذی: فریادیوں[۲] کا لباس جو قدیم یمن میں دستور تھا۔

یہ کنایہ ہے عجز و بیچارگی و تظلم و زاری سے۔

۲۔ جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

شوق: شوقِ عاشق جو شایقِ قتل ہے۔

۳۔ آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

پیچ و تابِ دودِ غم سے داغ سویدا نقش پذیر ہوا ہے تو ظاہر ہوا کہ داغ سوختہ کا سرمایہ دود تھا جیسے دودِ فتیلۂ چراغ۔

۴۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یعنی فرہاد اگر خمارِ رسم وقید کا سرگشتہ نہ ہوتا تو بغیر ضربِ تیشہ کے مر جاتا۔ یہ اُس کے نقصانِ عشق کی علامت ہے۔

۵۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

زیست: زندگیٔ جاوید۔

درد کی دوا پائی: دردِ محرومی کی دوا پائی۔

دردِ بے دوا پایا: عشق وہ درد ہے جس کی دوا نہیں۔

۶۔ دوستدار [۱] دشمن [۲] ہے اعتمادِ دل معلوم — آہ [۱] بے اثر [۲] دیکھی نالہ [۱] نارسا [۲] پایا

۷۔ سادگی [۱] و پُرکاری [۲] بے خودی و ہشیاری [۳] — حسن [۱] کو تغافل [۲] میں جرأت [۳] آزمایا پایا

۸۔ شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

رقیب: دشمن

۹۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پُر افشاں نکلا

تنگیٔ دل: جو تمنائے تیر میں تھی۔

۱۰۔ دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

اس مایدہ سے کامیابیٔ یاراں بقدر اُن کے دہاں کے تھی۔

۱۱۔ تھی (۳) نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

یعنی اپنی ہمتِ دشوار پسند نے با آنکہ نو آموز فنا ہے آسانی سے مرحلۂ فنا کو طے کیا۔ یہ کام آسانی سے سرانجام پانا بڑی مشکل کی بات ہے۔ کہ ہر ایک سے ہو نہیں سکتا۔

۱۲۔ دل میں پھر گریے نے اِک شور اٹھایا غالبؔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

نہ نکلا تھا: بوجہ ضبط نہ نکلا تھا

۱۳۔ تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فرد فرد تھا: یعنی ابھی مجتمع نہ ہوا تھا کم عمری میں

۱۴۔ دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

رہگذر مذکور میں جو پیشتر نزاکت موفور کے سبب جلوۂ گل باعثِ گرد کدورت تھا اب عاشقی میں اس دل و جگر کا یہ حال ہے۔

اُستاد فصیحی

پامالِ دو صد قافلہ خوں است دریں راہ آں دیدہ کہ از سایہ مژگاں گلہ دارد

دریں راہ: راہِ عشق۔

۱۵۔ بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ [۱] جاوید آساں ہے کشایش [۱] کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

عقدۂ مشکل: دلِ باختہ

۱۶۔ ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل: ہوائے گلگشتِ قاتل

آئینہ: نمایندہ

بخوں غلتیدن: بخوں غلتیدن سیرِ گل میں۔

۱۷۔ دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

یعنی وفا لفظ بے معنی ہے۔

۱۸۔ میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

وہ ستمگر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا: کیونکہ اس میں اندوہِ وفا سے رہائی تھی۔

۱۹۔ دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی — گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا: اگر ہمارا دم باریک راستہ منزلِ ذکرِ الٰہی کا نہ ہوا۔

۲۰۔ ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی — گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

گلبانگ: آواز۔

گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا: تسلی بخش وعدے کا کان کبھی ممنون نہ ہوا۔

۲۱۔ کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر جائیں: جس سے نجات ملتی آفات سے

۲۲۔ نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو — لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

دانتوں میں تنکا لینا: عاجزی و فروتنی کرنی۔ زنہار و اماں چاہنا

۲۳۔ مری تعمیر [ا] میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم [ا] دہقاں کا

ہیولیٰ: مادہ

۲۴۔ اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

مدار: گذران

۲۵۔ ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے — دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

خیال: تصور۔

۲۶۔ نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا — قیامت ہے سرشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

پانی ہوا ہوگا: بہا ہوگا

۲۷۔ نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا — حباب موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

یک بیاباں: مراد کثرت۔

۲۸۔ سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی [ا] — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس [ا] حاصل کا

افسوس: مقتضائے عالمِ زندگانی

۲۹۔ بقدر ظرف[۱] ہے ساقی[۲] خمار[۳] تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے[۲] مے ہے تو میں[۱] خمیازہ[۳] ہوں ساحل کا

۳۰۔ رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا
رنگِ شکستہ: رنگِ شکستہ عاشق کا۔
گل ہائے ناز کا: گل ہائے نازِ معشوق کا۔

۳۱۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا: بلحاظ اُچھلنے شیشوں کے

۳۲۔ کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا
گرہ میں نہ باندھنے کی وجہ سے لفظ قرض مناسب گرہ ہے

۳۳۔ بزم[۱] شہنشاہ میں اشعار[۲] کا دفتر کھلا رکھیو یارب یہ درِ[۱] گنجینۂ گوہر[۲] کھلا

۳۴۔ گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
دشنہ: کلائی۔
نشتر: فصدِ دیوانہ کے لیے ہے۔

۳۵۔ گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں[۱] اُس کا بھید پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری[۱] پیکر کھلا
کھلا: شگفتہ ہوا

۳۶۔ منہ نہ کُھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا
کُھلا: خوش نما ہوا۔ زیب دیا

۳۷۔ در[۱] پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا[۱]
جلد منحرف ہوا۔
پھر گیا: منحرف ہوا۔

۳۸۔ کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
اختر: طالع بد۔

۳۹۔ کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا: جیسے غدر کے زمانہ میں

۴۰۔ اُس کی اُمت ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

شہ: سلطانِ انبیاء علیہ السّلام۔

گنبدِ بے در: آسمان

کھلا: شبِ معراج میں

۴۱۔ واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

کرم کو: کرمِ یار کو

عناں گیر: روکنے والا

خرام: رفتار

عناں گیرِ خرام: روکنے والا رفتار کا۔

قائل نے (گراں کو) کی جگہ (کرم کو) کہا ہے تاکہ مقصود میں تعقیدِ معنوی ہو۔

۴۲۔ یاں سرِ پُرشور بےخوابی سے تھا دیوار جو واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب[۳] تھا

دیوار جو: ٹکرانے

۴۳۔ یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

جلوۂ گل الخ: بسترِ گل پر یار ہم صحبتِ یاراں تھا یا یوں کہیے کہ محبوب ہم صحبتِ احباب تھا۔

۴۴۔ ناگہاں اس رنگ سے خوننابہ ٹپکانے لگا دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

خُوننابہ: اشارہ ہے طرف دوسری غزل کے۔

ناخن: ناخنِ دردِ عشق۔

۴۵۔ نالۂ دل [۱] میں شب اندازِ اثر نایاب تھا تھا سپند [۱] بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

دل اس بزم کا سپند بن کے جل رہا تھا۔ اگر نالہ اس کا با اثر ہوتا تو سپند اپنی بزمِ وصل کا ہونا چاہیے

غزلِ سابق سے واسوخت کا حال روشن ہے۔

۴۶۔ مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

آہنگ: الاپ

۴۷۔ کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

کچھ نہ کی: کچھ رسائی نہ کی۔

جنون: عشق۔

روکش: مقابل۔

۴۸۔ یاد کر وہ دن کہ ہر یک(۷) حلقہ تیرے دام کا　　انتظارِ صید میں ہر اک دیدۂ بے خواب تھا(۸)

حلقہ: مشبہ۔

دام: زلف۔

دیدۂ: مشبہ بہ۔

۴۹۔ ایک ایک قطرے کا(۹) مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ودیعتِ مژگانِ یار: امانت یار کے مژگاں کی

۵۰۔ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو　　توڑا جو تو نے آئینۂ تمثال دار تھا

میرے آئینۂ دل میں تیری صورت تھی جس سے ہزاروں آرزوئیں زندہ تھیں آئینۂ دل جو ٹوٹ گیا تو وہ صورت مٹ گئی آرزوئیں مردہ ہو گئیں۔

۵۱۔ گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں　　جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

رہگزار: رہگذرِ محبوب یا مطلق محبوبان۔

۵۲۔ موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال　　ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

ذرہ ذرہ اس دشت کا نمائشِ جوہر آبدار تیغ رکھتا تھا یعنی سامانِ قتل و بلا کی تھا نہ سامانِ کامیابی۔

۵۳۔ کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب　　دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

غمِ روزگار برابر غم مذکور تھا۔

۵۴۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انساں ہونا: سیرتِ انسانی کا پیدا کرنا۔

۵۵۔ لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط　　تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

گلستاں ہونا: باغ باغ ہونا۔

۵۶۔ عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا　　لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

عشرتِ پارۂ دل: سوال۔

زخمِ تمنا کھانا: جواب

لذتِ ریشِ جگر: سوال۔

غرقِ نمکداں ہونا: جواب۔

۵۷۔ شب خمارِ شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا تامحیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

رستخیز اندازہ: قیامت کی مانند۔

۵۸۔ یک قدم[۱] وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا جادہ[۱] اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا: جادہ لازم صحرا اور صحرا کو وحشت لازم ہے۔

۵۹۔ مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

خانۂ مجنونِ صحرا گرد: وہ خانۂ صحرا جس میں مجنوں پھرا کرتے تھے۔

۶۰۔ پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

رسوئی انداز استغنائے حسن: رسوائی عاشق بہ استغنائے معشوق حنا اور غازہ کے سبب کہ ان دونوں کو بوسہ نہیں دے سکتے بلحاظ بگڑنے رنگ کے۔

۶۱۔ نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل[۱] بہ باد یادگارِ نالہ اِک دیوانِ بے شیرازہ[۱] تھا

۶۲۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا زخم کے بھرنے[۱۰] تلک ناخن نہ بڑھ جاویں[۱۱] گے کیا

غمخواری: التیامِ زخم کے لیے ناخن کٹوانے میں جو سعی کی ہے یہی غمخواری ہے۔

۶۳۔ بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا

بے نیازی: استغنائے معشوق

۶۴۔ حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا

دیدہ و دل اپنا۔

فرشِ راہ اُن کے۔

سمجھاویں گے کیا مجھے۔

۶۵۔ آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا

عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا: کیونکہ سامانِ شہادت موجود ہے۔

۶۶۔ گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

انداز: قصد، ارادے۔

۶۷۔ خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا

گرفتارِ وفا: زندانیٔ وفا۔

۶۸۔ ہے اب اس معمورے[۱۲] میں قحطِ غمِ[ا] الفت اسد ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاویں[ا] گے کیا

معمورہ: دلی۔

قحطِ غمِ اُلفت: غمِ عشق بازی کی قحط سالی۔

۶۹۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہی انتظار ہوتا: اَلاِنتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْت۔[۱۳]

۷۰۔ ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

جان جھوٹ: وعدۂ مذکور کو۔

کہ: کیونکہ۔

اگر اعتبار ہوتا: اس وعدہ کا

۷۱۔ تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر اُستوار ہوتا

بودا: سست۔

اگر استوار ہوتا: عہدِ مذکور۔

۷۲۔ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

کاش چارہ[۱۴] جو ہمارے ہوتے عاشقی میں اور وصالِ یار میں ہماری غم خواری کرتے تدبیر سے۔

۷۳۔ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے غمِ عشق اگر[۱۵] نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

غم: غمِ عشق۔

دل ہے: کوئی نہ کوئی غم اس کو ہوا ہی کرتا ہے۔

۷۴۔ کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا: غمِ فراق کی شب میں یعنی مر مر کے اس رات میں جینا ہے۔

شبِ غم: شبِ غمِ فراق

۷۵۔ ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا: عشق میں

۷۶۔ اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

دو آنکھیں چار ہونا: کنایہ ہے ملاقات سے

۷۷۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مرنا: فدا ہونا۔

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا: فدا ہونا یار پر یا یہ کہ مر جائیں تو ہوس بازیوں سے رہائی ہو۔ اس وقت زندگی کا ثمرہ پایا۔

۷۸۔ تجاہل پیشگی سے مدعا کیا　　　کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

کیا کیا: انجان سے بار بار پوچھنا

۷۹۔ نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں　　　شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نوازش ہائے بیجا: بہ نسبت غیروں کے تمہاری بیجا نوازشیں۔

شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا: اپنی گفتگو سے گلۂ رنگیں کا گلہ نہ کیجیے۔

۸۰۔ نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں　　　تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

بے محابا: بے تامل ولحاظ

تغافل: انجان ہو جانا، آنکھیں چرانا۔

تمکیں آزما: صبر کو آزمانے والے عاشق کے۔

۸۱۔ فروغِ شعلۂ خس یک(۱۶) نفس ہے　　　ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے: تمثیل ہوس کی ہے۔

ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا: یہ پاس عشق کو ہوتا ہے یعنی عاشق وفادار ہوتے ہیں نہ بوالہوس۔

۸۲۔ نفسِ موجِ محیطِ بیخودی ہے　　　تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

محیط: محیطِ شراب۔

تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا: تغافل ہائے ساقی سے جو بیخودی ہمیں ہوئی وہ بمنزلۂ نشۂ شراب ہے پس ساقی کے شراب نہ دینے کا کیا گلہ۔

دوسری توجیہ ساقی کی چشمِ مستانہ نے ہمیں مست کر دیا ہے۔ اس حالت کو دیکھ کے وہ ہمیں مے نہ دے تو کیا گلہ۔

۸۳۔ دماغ عطرِ پیراہن نہیں ہے　　　　غمِ آوارگیہائے صبا کیا

اپنے یوسف کے پیرہن کی بو بسبب آوارگیٔ صبا اگر ہم تک نہ پہنچی تو اچھا ہوا کہ دماغ اس عطر کے سونگھنے کا ہمیں نہ تھا۔

۸۴۔ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر: ہر ایک قطرے کے دل سے انا البحر کا نغمہ نکل رہا ہے۔

ہمارا پوچھنا کیا: کہ ہم کون ہیں۔

۸۵۔ محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ　　　　شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

میں ضامن کہ خون بہا کا طلب گار تیرے شہیدانِ نگہ سے کوئی نہ ہوگا۔

۸۶۔ سن اے غارتگرِ جنسِ وفا سن　　　　شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

جنسِ وفا کنایہ ہے دل سے۔

یہ بات سن لے کہ قیمتِ دل کی شکست آواز نہیں رکھتی پس اس کو نہ توڑ اور جنسِ وفا کی غارتگری نہ کر۔ یا یہ کہ شکستِ مذکور کی صدا پکارے کیا کہتی ہے؟ یہ کہتی ہے اے غارتگرِ جنسِ وفا ہماری آواز سُن اور ہمارے ضعیف نالے پر رحم کر۔

۸۷۔ کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ　　　　شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

کس عاشق نے دلاوری کا دعویٰ صبر کرنے میں کیا ہے۔

؏ ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است۔[۵۱]

۸۸۔ یہ قاتل وعدۂ صبر[۱] آزما کیوں　　　　یہ کافر فتنۂ طاقت[۱] ربا کیا

قاتل: منادیٰ یا ایسا قاتل۔

مصرعِ ثانی بھی بدستور۔

۸۹۔ درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا　　　　پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے: یعنی یہ دعویٰ صحیح ہے۔

۹۰۔ سب کو مقبول ہے دعویٰ تیری یکتائی کا　　　　رُوبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

رُوبرو: مقابل تیرا

۹۱۔ کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں　　　　ترا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

ہمنائی چشمِ خوباں: یعنی چشمِ بیمار کا ہمنام ہونا۔

۹۲۔ سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا　　　خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے: باعثِ آزارِ سینہ ہے۔

دریا نہ ہوا: دریا سے جا نہ ملا۔ یعنی اپنی اصل سے جدا ہوا سو خاک میں مل گیا۔

۹۳۔ نام[18] کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا　　　کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

نام کا میرے ہے: خبر مقدم۔

دکھ: رنج۔

کام میں میرے: فکرِ کار میں میرے۔

۹۴۔ ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب[19]　　　حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

دمِ ذکر: وقتِ ذکر جس تذکرۂ عشق کے خونِ خالص ہر بُنِ مُو سے نہ ٹپکے وہ امیر حمزہ کی[20] داستان ہے نہ عشق کی کہانی۔

۹۵۔ قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل　　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دیدۂ بینا نہ ہوا: جو قطرہ میں دریا کو اور جزو میں کُل کو نہ دیکھے وہ دیدہ بازیچۂ اطفال ہے۔

۹۶۔ پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا　　　بہ خوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

کرم: بخششِ الٰہی۔[21]

تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا: خجلتِ ناتمامی کا ہدیہ ہے۔

وہ کون؟: یعنی صد رنگ سے خوں میں لپٹا ہوا پارسائی کا دعویٰ۔

۹۷۔ نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا　　　بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

رسوا بیوفائی کا: بدنامِ عہدِ دوستی پورا نہ کرنے کا یا عہدِ پارسائی کو۔

صد نظر: صد دیدۂ نظارگی

دعویٰ پارسائی کا: دعویٰ حسنِ تماشا دوست کی پاکدامنی کا محضرِ مذکور سے دعویٰ مہر بور ثابت ہے۔

۹۸۔ زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا　　　چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

کاسہ گدائی کا: یعنی دیدۂ دریوزہ گرِ دیوار

۹۹۔ نہ مارا جان کر بے جرم غافل[22] تیری گردن پر　　　رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

نہ مارا قتل نہ کیا۔

جان کر بے جرم: مجھ کو بے گنہ جان کے۔

غافل: اے غافل

حقِ آشنائی کا: حقِ عاشق جو مقتضی قتل تھا خون بے گنہ کی مانند تیری گردن پر رہ گیا۔

۱۰۰۔ تمنائے زبان محو سپاس بے زبانی ہے   مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

تمنائے زبان: بتقاضائے مذکور مابعد۔

بے دست و پائی: ہماری بے دست و پائی مقتضی تمھاری تشریف آوری کی تھی۔ بارے ہماری بے زبانی نے یہ تقاضا بھی کرنے نہ دیا اور بے زبانی کی سپاس گزار ہماری تمنائے زبان ہے۔

۱۰۱۔ دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی   عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

حلقۂ دہان ہر ایک بت طعنہ جو کا باہم مل کے زنجیرِ رسوائی ہو گیا۔ اس مصرع کے موافق

ع   حلقہ بر حلقہ چو افزود ہماں زنجیر ست۔

لفظ عدم مراعات دہن ہے۔

۱۰۲۔ وہی اک بات ہے جو یاں نفس [۱] واں نکہت [۲] گل ہے
چمن کا جلوہ [۲] باعث ہے مری رنگیں نوائی [۱] کا

۱۰۳۔ نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے   کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

ہوں: متکلم۔

حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا: جن حسرتوں کا بیان ہو نہیں سکتا۔

۱۰۴۔ دل کو ہم صرف وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا   یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

صرفِ وفا سمجھے تھے: وفا میں پائداری کرے گا سمجھے تھے۔

پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا: امتحانِ وفا کی ابتدا ہی میں اس کا کام تمام ہو جائے گا۔

۱۰۵۔ گر نگاہِ گرم فرماتی رہی [۴۳] تعلیم ضبط   شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

نگاہِ گرم: نظرِ مہر۔

۱۰۶۔ ہے خبر گرم ان کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

بوریا نہ ہوا: بوریا نہ ہوا بچھانے (کے لیے)۔ [۴۴]

۱۰۷۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

صنم کی بندگی میں اپنی بھلائی جو نہ ہوئی گویا صنم کی صاحبی نمرود کی خدائی تھی جس سے پرستاروں کا بھلا نہ ہوا۔

۱۰۸۔ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی	حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حق ادا نہ ہوا: حق ادا نہ ہوا جان کے دینے میں

۱۰۹۔ رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟	لے کے دل، دلستاں روانہ ہوا

کہ: کافِ تردید بمعنی یا۔

۱۱۰۔ کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں	آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے: کچھ تو پڑھیے حدیثِ نفس۔

۱۱۱۔ گلہ ہے شوق[۱] کو دل[۲] میں بھی تنگیٔ جا کا	گہر[۳] میں محو ہوا اضطراب دریا[۱] کا

۱۱۲۔ ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں	کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

کرے ہے: با آنکہ کرے ہے۔

۱۱۳۔ فلک[۱] کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو[۲] یاد اسد	جفا میں اس کی[۱] ہے انداز کارفرما[۲] کا

کارفرما فلک ٹھہرا اور کارکن محبوب یا بالعکس۔ توجیہ ثانی میں مبالغہ زیادہ ہے۔

۱۱۴۔ قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا	خطِ جامِ مے سراسر، رشتۂ گوہر ہوا

حیرت سے: حیرت سے لبِ محبوب کی۔

۱۱۵۔ اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز	جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

ناز کی شوخی سے حیرت مبدل با اضطراب ہو گئی تو جوہرِ آئینہ طوطیٔ مذبوح کے مانند تڑپ(۳۵) رہے ہیں۔

۱۱۶۔ یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا	عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

چونکہ دلِ سائل طلسمِ یاس و اُمید ہے اور سوال کی بنا پست ہمتی پر ہے اس لیے سائل کے دل کو جنگ گاہ امید و یاس کہا ہے۔

۱۱۷۔ نہ بندھے تشنگیٔ شوق(۳۶) کے مضموں، غالب	گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

نہ بندھے: باندھے نہ گئے۔
یعنی تشنگیٔ شوق یہاں تک ہے کہ جس کے مقابل دریا بہ مشابہ ساحل ہے۔

۱۱۸۔ بے مے [۱] کسے ہے طاقت [۲] آشوب آگہی — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ [۲] نے خط ایاغ [۱] کا

۱۱۹۔ بے خونِ [۱] دل ہے چشم [۲] میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ [۲] خراب ہے مے [۱] کے سراغ کا

۱۲۰۔ باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل — ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

تیرا باغِ شگفتہ یعنی گلزارِ حسن ہمارا بساطِ نشاطِ دل ہے۔ ابرِ بہار کی مے کشی سے ہمارا دماغ تر و تازہ نہیں ہوتا۔

۱۲۱۔ وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ[۲۷] بے ربطیٔ عنواں سمجھا

ربطیٔ عنواں: عنوانِ نامربوط یعنی چین جو ضد ہے جبینِ کشادہ کی۔[۲۸]

۱۲۲۔ یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

صیقل سے جو خط آئینہ پر پڑتا ہے وہ ہو بہو الف کے مانند ہوتا ہے۔ تو خطِ مذکور ابھی الف ہی کی مشق کر رہا ہے۔ ہنوز روزِ اول ہے۔ مگر چاک گریباں اپنا کہ وہ بھی بصورتِ الف تھا۔ سیکڑوں شکلیں اس کی بدل گئیں تو معلوم ہوا کہ مشقِ گریباں دری میں آئینہ مبتدی ہے اور حضرت غالب کا گریباں منتہی۔

۱۲۳۔ بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام — رخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

کیونکہ گرمیٔ مشی عرق آور ہے اور قطرۂ عرق شبیہ دیدۂ حیران عاشق ہے۔

۱۲۴۔ عجز [۱] سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو [۲] ہوگا — نبضِ خس [۱] سے تپشِ شعلۂ [۲] سوزاں سمجھا

بدخو: افروختہ و سرکش

۱۲۵۔ سفرِ عشق [۱] میں کی ضعف [۲] نے راحت [۳] طلبی

ہر قدم [۱] سائے [۲] کو میں اپنے شبستاں [۳] سمجھا

لف و نشر مرتب

۱۲۶۔ تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ — دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

مگر کہاں تک بھاگ سکے آخر اسی کا کشتہ ہو گیا کیونکہ وہ مژگانِ قضا کا پیکاں تھا جس کا دفع کرنا آساں نہیں ہے۔

قضا و قدر مراعات النظیر ہے۔

اگر دفع کی جگہ زخم بمعنی جراحت ہوتا تو مناسب تھا۔

۱۲۷۔ دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

جان کے: ایہام تناسب

۱۲۸۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دل: مبتدا۔

تشنہ جگر خبر ہے دل کی۔

یعنی دیدۂ تر کی یاد سے دل تشنہ جگر فریاد کا ہوا۔ یعنی رونا چلانا جو لازمہ عاشق کا ہے پھر تازہ ہوا۔

۱۲۹۔ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا: جس کے یاد آنے سے ہنگامۂ قیامت تازہ ہوا۔

۱۳۰۔ سادگی ہائے تمنا یعنی پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

یاد نیرنگ بازی نظر محبوب بتقاضائے سادگی عشق ہے کیونکہ جس نیرنگ سے ایک بار آفتیں اُٹھا چکے ہیں دوبارہ اس کا خیال کرنا محض نادانی ہوگی۔

۱۳۱۔ عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

اے حسرتِ دل میں نالہ کرتے کرتے رہ گیا اور عذر رہ جانے کا یاد آنا جگر کا ہے کہ اب جگر میں آہ باقی نہ رہی۔

۱۳۲۔ زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کیوں ترا راہگذر یاد آیا

تیری رہگذر جس پر میری زندگی کوئی دن بسر ہوئی تھی کیوں یاد آگیا جس کے یاد آنے سے اب زندگی کا گزرنا مجھ پر سخت دشوار ہوگیا ہے وَاِلّا زندگی کسی حال گزر ہی جاتی۔

۱۳۳۔ کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

لڑائی ہوگی تکرار پر اس بات کی کہ ترا گھر بہتر ہے نہ خُلد۔

۱۳۴۔ آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل سے تنگ آنے کی یہ وجہ کہ پہلے کی مانند دل میں جرأتِ فریاد نہ رہی لیکن جگر کہ جس سے شجاعت کا تعلق ہے یاد آگیا پر کیا فائدہ کہ اب وہ جرأت اس میں بھی باقی نہ رہی۔

۱۳۵۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دو پہلو ہیں دشت دلکشائی میں گھر جیسا ہے یا اپنا گھر ویرانی میں دشت جیسا ہے۔

۱۳۶۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد — سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

یعنی اپنے سر کی چوٹ یاد آئی اس لیے طفلی میں مجنوں کے سر پر سنگ اندازی نہ کی گویا لڑکپن سے قائل نے آپ کو شوریدہ سر فرض کیا ہے۔ جس کے سبب سنگِ طفلاں کا مزہ چکھ چکا ہے۔

۱۳۷۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

کوئی: غیر یا رقیب۔

عناں گیر: مانع و مزاحم۔

۱۳۸۔ تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی [۱] کا گلہ — اس میں [۲] کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

شائبہ خوبیٔ تقدیر: آمیزش و میل بدیٔ مقدر کا۔

۱۳۹۔ تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں؟ — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا: کیا تسمۂ شکار بند میں تیرے کوئی شکار بھی تھا؟ یہ مراد اپنی گرفتاری سے ہے زمانہ سابق میں۔

۱۴۰۔ قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنج گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

ہاں کچھ اک رنج گرانباریٔ زنجیر بھی تھا: گرفتاری یادِ زلف کے علاوہ گرانیٔ زنجیر کا کسی قدر رنج بھی تھا مگر آں کجا و ایں کجا۔

۱۴۱۔ بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

بجلی: یہ کنایہ چمک سے دانتوں کی ہے بات کرنے میں۔

بجلی کو باراں لازم ہے۔ باراں تراوش تقریر کو قرار دیا ہے جو چارۂ لب تشنگی ہے۔

۱۴۲۔ یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

کچھ نہ کہے: مجھے برا نہ کہا اُس نے۔

لائقِ تعزیر بھی تھا: برا کہنے کے علاوہ سزا کے لائق بھی میں تھا۔

۱۴۳۔ دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا — نالہ کرتا تھا و لے طالب تاثیر بھی تھا

نالہ کرتا تھا غیر کے تقرب سے مگر میرے نالے کی تاثیر نے اس کو یار کی نزدیکی سے دور کر دیا۔

۱۴۴۔ پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر [۳] بھی تھا

ہم آشفتہ سرانِ محبت میں فرہاد پیشہ ور میر زمرہ بھی تھا یا جوان مر گیا تھا۔

دو پہلو ہیں۔

۱۴۵۔ ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا، نہ سہی — آخر اس شوخ کے[۳۰] ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پاس: ایہام بمعنی پاسداری یا نزدیکی یعنی پاس نہ آنا صحیح نہ ہوا کیونکہ اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر نہیں تھا جو پاس آیا ہوتا۔

۱۴۶۔ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

فرشتوں: کراماً کاتبین۔

۱۴۷۔ لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا — زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

تشنگی میں (اُدھ) موئے جو لوگ ہیں گویا میں ان کا لبِ خشک ہوں۔

چونکہ مردے کی زیارت کیا کرتے ہیں میں زیارت گاہ ہوں اپنے غم گسارانِ آزردہ دل کا۔

۱۴۸۔ ہمہ نا امیدی، ہمہ بدگمانی — میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

میں بالکل نا امید اور بالکل بدگماں ہوں یہ دو صفتیں دل فریب خوردگانِ وفا سے بے وفاؤں کی ہیں گویا میں وہی دل ہوں۔

۱۴۹۔ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا — اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

حالانکہ وہ ظلم جو اوروں پہ ہوا تھا مجھ پر ہوتا تھا، تو نے بحیلۂ دوستی وہ ظلم جو عین مطلوب میرا تھا، مجھ پر نہ کیا یہ محض دشمنی ٹھہری، تو حقیقتاً تو میرا بھی دوست نہ تھا۔ اگر میرا دوست ہوتا تو وہ ستم جو اوروں پر کر رہا ہے پہلے مجھ پر کرتا۔ خلاصہ محبوب کا ظلم زیادہ سے زیادہ بھی ہو مرغوبِ عاشقِ صادق ہے۔

۱۵۰۔ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

چھوڑ: چھوڑا چاہِ مغرب میں۔

۱۵۱۔ توفیق باندازۂ ہمت[۱] ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر[۲] نہ ہوا تھا

یعنی آنسو اگر گوہر ہوتا تو صدف میں ہوتا نہ آنکھ میں۔ پس آنسو علوِ ہمت سے گوہر نہ ہوا تو چشمِ مردم یا چشمِ عاشق میں اس کی جگہ نہ ہوگی۔

۱۵۲۔ جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

جب قامتِ یار کا تماشا دیکھا تو ہنگامۂ محشر کا معتقد ہوا اور ایمان لایا کہ فتنۂ محشر برحق ہے یہ نہ دیکھے تک دہریوں کی مانند منکرِ قیامت تھا۔

۱۵۳۔ میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

حالانکہ آزردگیٔ یار کی جو تکرارِ شوق سے پہلے ہوئی محلِ خوشی نہ تھی کیونکہ یہ اندازِ نازِ حسن کے ہیں۔ تکرارِ مذکور کے بعد وہ آزردگی نہ رہتی معاملہ دگرگوں ہو جاتا پس میری خرسندی سادہ دلی (۳) سے تھی۔

۱۵۴۔ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

میرے دامن کا کنارہ دریائے معاصی کا پانی پی کر ہنوز تر بھی نہ ہوا تھا کہ دریائے مذکور خشک ہو گیا۔

۱۵۵۔ شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

ناموس: شرم و حیا۔

مجلس افروزی شمع بسبب بے پردگی اور رسوائی کے مایۂ آزارِ فانوس تھی۔

۱۵۶۔ مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

کس قدر عاشق کشتۂ حسرتِ پابوسی معشوق کا تھا کہ جس کے مشہد یعنی قبر سے کوسوں تک مہندی کے جھاڑ اُگے ہوئے ہیں تا بذریعہ حنائے مشہد کے پابوسی بعدِ مردن حاصل ہو۔

۱۵۷۔ حاصلِ الفت [۱] نہ دیکھا جُز شکستِ [۲] آرزو دل [۱] بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس [۳] تھا

جیسے دو لب باہم ملے ہوئے افسوس کرنے میں جدا ہوتے ہیں دل ہائے پیوستہ کا بھی یہی حال ہے کہ ان کے ملاپ میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔

۱۵۸۔ کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

غم: غمِ عشق

۱۵۹۔ آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

دل نہ دینے پر پشیماں ہو گئے اور اپنے پر آپ فریفتہ و حیراں ہو گئے۔

۱۶۰۔ قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

پس اپنے ہاتھ سے میری گردن ماریے۔

۱۶۱۔ عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

میں اظہارِ نیازمندیٔ عاشق کے لائق نہ رہا کیونکہ وہ دل جس پر مجھے ناز تھا کہ عہدہ برائے نازِ معشوق ہو گا اب وہ دل نہ رہا۔

۱۶۲۔ جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے   ہوں شمع کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

روشن ہے کہ شمعِ مردہ کو محفل سے نکال دیتے ہیں۔

۱۶۳۔ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں   شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا بسبب حقیری اور ناچیزی کے۔

۱۶۴۔ بروئے شش جہت در آئینہ باز ہے   یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

شش جہت کے منہ پر دروازہ آئینہ کا کھلا ہے یعنی آئینے کے گھر جس کا جی چاہے چلا آئے۔ یہاں خوب و زشت دونوں برابر ہیں۔ آئینہ کنایہ ہے دلِ سادہ ولاں یا صاف ضمیراں یا روشن دلاں سے۔

۱۶۵۔ وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن   غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

حسن: حسنِ حقیقی یا مجازی۔

نگاہ: نگاہ قاصرِ نظارگیاں کہ دیکھنے پر قاصر نہیں ہے۔

۱۶۶۔ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یعنی مکروہاتِ زمانہ کی قید میں تجھ کو نہ بھولا۔

۱۶۷۔ دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں   حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

ہوا: آرزو۔

۱۶۸۔ بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ناز تھا: ناز تھا بیدادِ عشق سہنے کا۔

اس مقطع میں مطلع کے مصرعِ آخر کی تضمین ہے۔

۱۶۹۔ ذرہ ذرہ[۱] ساغرِ میخانۂ[۲] نیرنگ ہے   گردشِ[۱] مجنوں بہ چشمک ہائے[۲] لیلیٰ آشنا

۱۷۰۔ شوق ہے ساماں[۱] طرازِ نازشِ اربابِ عجز[۲]   ذرہ[۲] صحرا[۱] دستگاہ و قطرہ، دریا آشنا

شوق کی ساماں پردازی نے ذرہ اور قطرۂ ضعیف کو صحرا اور دریا تک پہنچا دیا جس کی دستگاہی اور آشنائی پر وہ ناز کرتے ہیں۔ دوسری تقریر۔ اربابِ عجز ذرہ و قطرہ ناچیز ہیں جن کا سامان پردازِ افتخار شوق ہوا اور بوسیلہ اس کے ذرہ صاحب جاگیر صحرا اور قطرہ دریا کا آشنا ہو گیا۔ لفظ آشنا ضدِ بیگانہ و بمعنی شناکنندہ ایہامی لفظ و مناسب دریا ہے۔

۱۷۱۔ میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

اور: عطفِ لازمہ۔

۱۷۲۔ شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

زانو: آئینۂ زانو۔

عاشق اور معشوق ایک ہی چیز کے آشنا ہوتے تو رشک ہم دیگر لازم آتا۔

۱۷۳۔ کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

یعنی فرہاد نے فقط تصویرِ شیریں کو پیدا کیا نہ شیریں کو۔

۱۷۴۔ ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

پھر: علاوہ، تیسر۔

۱۷۵۔ مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

آج ہی جو میں بھی شریکِ بزم ہوں۔

۱۷۶۔ منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے ادھر[۳۳] ہوتا کاش کے مکاں اپنا

منظر: جھروکہ۔

۱۷۷۔ دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

اُن کا پاسباں جس قدر تذلیل کرے گا ہم ہنسی میں ٹالیں گے کیونکہ آشنا کی باتوں سے آزردہ نہیں ہوتے۔ دوسرے مصرعے میں تعقیدِ لفظی ہے۔

۱۷۸۔ سرمۂ مفت[۱] نظر ہوں، میری قیمت[۲] یہ ہے کہ رہے چشمِ خریدار[۱] پہ احساں[۲] میرا

خریدار کو کوئی چیز مفت ہاتھ آئے تو وہ احسان پذیر ہوگا بس خریدار پر منت کا ہونا یہی میری قیمت ہے کہ وہ بے اجرت مجھ سے منفعت پائے۔

۱۷۹۔ رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

ضبطِ نالہ سے رک رک کے میں مر جاؤں اس وقت میرے غمِ پنہاں کا اثر یعنی یوں مرجانے کا غم تیرے چہرے سے نمایاں ہو۔

۱۸۰۔ غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں بے شانۂ صبا نہیں طرۂ گیاہ کا

محبوبانِ طناز اپنی خود آرائی پر غافلانہ ناز کر رہے ہیں ورنہ دنیا میں کوئی طرۂ گیاہ و ناچیز کا

بے شانہ زنیٔ مشاطۂ صبا نہیں ہے۔ بجلی قدر زننہ۔

۱۸۱۔ بزمِ قدح سے عیش تمنا نہ رکھ، کہ رنگ صید ز دام جستہ ہے اس دامگاہ کا

مجلس شراب سے زندگانی خوش کی تمنا نہ کر۔ کیونکہ رنگ جو شراب پینے سے چہرے پر آتا اور نشہ اترتے ہی اُڑ جاتا ہے دامگاہِ بزمِ قدح کا ایک شکار رمیدہ ہے۔

۱۸۲۔ رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

گناہ کا عذر نہ کرنے کو جس کا منشا شرمندگی ہے اگر رحمت قبول کرے تو بعید نہیں۔

۱۸۳۔ حریفِ جوششِ [۱] دریا نہیں خودداریٔ [۲] ساحل
جہاں ساقی [۱] ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری [۲] کا

حریف: مقابل۔

خودداری: ضبطِ خود۔

۱۸۴۔ تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

بات کا بننا مراد ترتیبِ حروفِ ابجد سے ہی قفلِ مذکور پر۔

۱۸۵۔ دل [۱] سے مٹنا تری انگشتِ [۲] حنائی کا خیال ہو گیا گوشت [۱] سے ناخن [۲] کا جدا ہو جانا

۱۸۶۔ گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

اگر بوئے گل کو تیری گلی میں آنے کی آرزو نہیں ہے تو اس کا گردِ راہِ صبا ہو جانا کس لیے ہے۔

خوشبو کا گردِ راہِ ہوا ہو جانا کنایہ ہے اس کی ہمراہی سے کمالِ خاکساری کے ساتھ۔

۱۸۷۔ تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

آئینہ: آئینۂ فولادی۔

حواشی

(ردیف الف)

۱۔ قدیم اُردو کتابت میں چونکہ یائے معروف اور یائے مجہول کا کوئی خاص امتیاز نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وثوق صراحت میں کثرت سے کئی جگہوں پر ایسے الفاظ ملتے ہیں مثلاً "ہے" کو "ہی"، "تمنائے" کو "تمنائی" "لیعنی"، کو "لیجئے"، "باندھے" کو "باندھی"، "اجزائے" کو "اجزائی" وغیرہ۔ لیکن چونکہ اس کی تصحیح واجب ہے لہٰذا دیوانِ غالب نسخۂ انجمن دہلی کو مدنظر رکھتے ہوئے اشعارِ غالب کا املاء اور کتابت درست کر دی گئی ہے نیز آج کے اُردو املاء کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے شرح وثوق صراحت میں بھی یائے معروف اور یائے مجہول کی تمیز کو بھی درست قائم کر دیا گیا ہے۔

۲۔ غنہ کی آواز ہندوستانی صوتیات کا اہم جُز ہے۔ فارسی کی ہندوستانی روایت میں بھی یہ آواز شروع سے بہت واضح رہی ہے۔ عبدالعلی والہ کو فارسی میں کمال حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ وثوق صراحت پر بھی فارسی کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ وثوق صراحت میں نون غنہ کو ہر جگہ "ن" کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ لہٰذا دورانِ تدوین وثوق صراحت میں جدید اُردو املاء کے پیش نظر نون غنہ اور نون کی تمیز قائم کر دی گئی ہے۔

۳۔ بعض نسخوں میں "تھی" کی جگہ "اے" اور "ہے" چھپا ہے۔ حسرت موہانی اور طباطبائی کے نسخوں میں "اے" چھپا ہے۔ وثوق صراحت میں یہاں "ہے" درج ہے۔ جبکہ نسخۂ انجمن مرتبہ رشید حسن خاں میں "تھی" چھپا ہے۔ واضح رہے کہ شرح وثوق صراحت میں درج اشعار کی تصحیح کے لیے نسخۂ انجمن مرتبہ رشید حسن خاں، مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ جس کے مطابق یہاں "ہے" کو "تھی" کر دیا گیا ہے۔

۴۔ دیوانِ غالب میں اس شعر سے ماقبل "بے خوابی" کا ذکر ہے۔ حامد علی خاں کے بقول غالب نے رعایتِ لفظی کے خیال سے یہاں "کمخواب" لکھا ہے۔ "کمخواب" کا املا "کمخاب" بھی ہے۔ لیکن "کمخواب" علی العموم قابلِ ترجیح اور یہاں علی الخصوص مرجح ہے۔ کیونکہ یہی غالب کا مقصود ہے۔ کپڑے کے روئیں کو "خواب" کہتے ہیں۔ کم روئیں کا کپڑا = کمخواب = کمخواب

۵۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کو" درج تھا جبکہ نسخۂ انجمن اور دوسرے نسخوں میں یہاں "کہ" درج ہے۔ لہٰذا تصحیح کر دی گئی ہے۔

۶۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کو" درج تھا جو شاید کتابت کی غلطی ہے کیونکہ نسخۂ انجمن اور دوسرے سبھی نسخوں میں "گو" درج ہے۔ لہٰذا تصحیح کر دی گئی ہے۔

۷۔ وثوقِ صراحت میں یہاں اِک درج ہے۔ نسخہ حامد علی خاں میں بھی اسی کی تائید کی گئی ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور کئی نسخوں میں یہاں "یک" لکھا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں اسے "یک" کر دیا گیا ہے۔

۸۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "ہر" نہیں لکھا گیا۔ جو کہ کتابت کی غلطی ہے۔ جس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

۹۔ وثوقِ صراحت میں کئی جگہوں پر جہاں قطرے، آئینے، کاشانے یا پردے جیسے الفاظ آئے ہیں وہاں انھیں قطرہ، آئینہ، کاشانہ یا پردہ لکھا گیا ہے۔ نسخۂ انجمن دہلی کو بنیاد بناتے ہوئے ایسے الفاظ کی درستی کر دی گئی ہے نیز آگے بھی اس درستی کا خیال رکھا گیا ہے۔

۱۰۔ وثوقِ صراحت میں "بھرتے" لکھا گیا ہے لیکن نسخۂ انجمن اور دوسرے کئی نسخوں میں یہاں "بھرتے" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا تصحیح کر دی گئی ہے۔

۱۱۔ تمام قدیم نسخوں میں قافیے "فرماویں"، "جاویں" وغیرہ ہی چھپے ہیں جبکہ بعد کے نسخوں میں "جائیں"، "فرمائیں" وغیرہ درج ہیں۔ مثلاً شیونرائن اور طباطبائی وغیرہ۔

۱۲۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "معمورہ" لکھا گیا ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور کئی دوسرے نسخوں میں "معمورے" درج ہے لہٰذا تصحیح کر دی گئی ہے۔

۱۳۔ وثوقِ صراحت میں لکھا تھا "الانتظار اشد الموت" جبکہ صحت نامہ عبدالواجد کے مطابق اس کی درستی یہ ہے۔ "الانتظار اشدُّ من الموت"۔ یہاں اس کی بھی تصحیح کر دی گئی ہے۔

۱۴۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "چارہ جو" کی بجائے "چار جو" لکھا تھا جو کہ کتابت کی غلطی ہے اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

۱۵۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "گر" درج ہے۔ نسخۂ رضا اور نسخۂ حامد علی خاں میں یہاں اس کی تائید

ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور کئی دوسرے نسخوں میں یہاں ''اگر'' درج ہے۔ لہٰذا ''گر'' کو ''اگر'' سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔

۱۶۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''اِک'' لکھا گیا ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور دوسرے کئی نسخوں میں یہاں ''یک'' ہی ہے لہٰذا تصحیح کر دی گئی ہے۔ دراصل کلامِ غالب کے املائی مسائل میں ''اِک'' اور ''یک'' کا مسئلہ بھی کافی اہم ہے۔ مکاتیبِ غالب میں امتیاز علی خاں عرشی نے اس ضمن میں خود مرزا صاحب کی بہت سی اصطلاحیں دی ہیں جس میں وہ نواب یوسف علی خاں ناظم کے ایک شعر کے مصرع ''یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک'' پر اصلاح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جہاں ''ہر ایک'' اچھی طرح نہ آئے وہاں ''ہر یک'' لکھیے۔ ''ہر ایک'' کیوں لکھیے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ ''رشید حسن خان'' : ''املائے غالب'' ''ادارہ یادگارِ غالب کراچی ۲۰۰۰ء (ص۔ ۱۷۶)

۱۷۔ ترجمہ: یہ عشق صبر سے کوسوں دور ہے۔

۱۸۔ نسخۂ حسرت موہانی اور نسخۂ مہر میں یہ شعر یوں ملتا ہے:

نام کا میرے ہے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا
کام کا ہے میرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

لیکن دوسرے کسی بھی قدیم نسخے میں یہ ثبوت نہیں ملتا کہ یہ شعر ایسے ہے۔ بقول حامد علی خاں غالب کو شاید دوسرے مصرعے کا وہ مفہوم مطلوب بھی نہ تھا جو کہ ''کام کا'' سے پیدا ہوتا ہے۔ عرشی، طباطبائی، مالک رام اور بیخود دہلوی کے نسخوں میں بھی یہ شعر ایسے ہی ہے۔ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں بھی شعر اسی طرح سے ہے۔

۱۹۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''خونناب'' درج ہے نسخۂ حامد علی خاں مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی میں بھی اس کی تائید ہے لیکن نسخۂ انجمن اور نسخۂ رضا میں یہاں ''خوناب'' درج ہے۔ لہٰذا درستی کر دی گئی ہے۔

۲۰۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''کا'' درج ہے جو کہ سہوِ کتابت ہے۔ فقرے کی رو سے یہاں ''کی'' آنا چاہیے۔ اس کی درستی کر دی گئی ہے۔

۲۱۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''آلہی'' لکھا گیا تھا جس کو مروجہ املاء کے مطابق ''الٰہی'' کر دیا گیا ہے۔

۲۲۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''غافل'' چھپا ہے جس کی تائید نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ حمیدیہ نیز دیگر نسخوں سے ہوتی ہے۔ نسخۂ طباطبائی اور نسخۂ عرشی میں بھی یہی درج ہے۔ مگر نسخۂ حسرت اور نسخۂ مہر دونوں میں یہاں لفظ ''قاتل'' ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں یہ کتابت کی غلطی ہو۔

۲۳۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''رہے'' درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی اور بھی کئی دوسرے نسخوں میں یہاں ''رہی'' درج ہے۔ تصحیح کردی گئی ہے۔

۲۴۔ وثوقِ صراحت میں کتابت کی غلطی یا شارح کے نظرِ ثانی نہ کرنے کی وجہ سے جن جگہوں پر مفہوم کی رسائی میں شرح کا تسلسل رکتا ہوا یا تشنہ محسوس ہوا، وہاں بریکٹ کی صورت میں اس تشنگی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ قاری کے پڑھنے کا تسلسل برقرار رہ سکے۔

۲۵۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''تڑپھ'' درج ہے جس کو موجودہ املاء کے مطابق ''تڑپ'' کردیا گیا ہے۔

۲۶۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''ذوق'' درج تھا۔ نسخۂ حامد علی خاں میں بھی یہاں ''ذوق'' درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن، نسخۂ رضا اور دیگر قدیم نسخوں میں یہاں ''شوق'' درج ہے۔ تصحیح کردی گئی ہے۔

۲۷۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''پہ'' درج ہے جو کہ سہوِ کتابت معلوم ہوتی ہے اس کو نسخۂ انجمن کے مطابق ''بہ'' کردیا گیا ہے۔

۲۸۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''کا'' درج ہے جو کہ سہوِ کتابت معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو ''کی'' کردیا گیا ہے۔

۲۹۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''جواں میر'' کی جگہ ''جومیر'' لکھا گیا ہے جو کہ سہوِ کتابت ہے۔ درستی کر دی گئی ہے۔

۳۰۔ وثوقِ صراحت میں ''کی'' درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں ''کے'' درج ہے۔ تصحیح کردی گئی ہے۔

۳۱۔ وثوقِ صراحت میں ''سادہ دلی'' کو ''سادہ ذکی'' لکھا گیا ہے جو کہ سہوِ کتابت ہے۔ شعر کے مطابق یہاں ''سادہ دلی'' ہی آنا چاہیے۔ لہٰذا تصحیح کردی گئی ہے۔

۳۲۔ بعض نسخوں میں ''ادھر'' چھپا ہے بعض میں ''پرے''۔ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں ''ادھر'' ہی چھپا ہے جو درست ہے۔

maablib.org

ردیف بائے ابجد

۱۸۸۔ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

یہ غزل صفتِ باراں میں بعنوان بہاریہ ہے۔

پھر ہوا وقت: موسمِ برسات وقتِ مے کشی ہے۔

بطِ مے: صراحیٔ مے بصورت بط۔

۱۸۹۔ پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

یعنی سایۂ تاک کے اثر سے موجِ ہوا موجِ شراب ہو جاتی ہے یہ سبب ہے سیہ مستی گل و شجر کا۔ سیاہ رنگ سبزۂ اشجار و سایہ دونوں کے مناسب ہے۔

۱۹۰۔ جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

سر سے گزرنا بہ نسبت شراب کے حد سے تجاوز کرنا نشہ کا ہے اور بہ نسبت ہما کے دور ہونا سایۂ ہما کا ہے سر سے۔ لفظ رسا مناسب مقام ہے۔

۱۹۱۔ ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب: یعنی ہستی کو مستی شراب کی بخشے

۱۹۲۔ چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

چار موج: گرداب۔

۱۹۳۔ جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنۂ ناز دے ہے تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

جس قدر قوۃ نامیہ اپنی ترقی حسن پر ناز کرنے کی مشتاق ہے اسی قدر اس کو موجِ شراب

بہ دمِ آبِ حیات تسکین بخش ہے۔ شراب باعثِ آب و تابِ حسن اور لازم موسمِ باراں ہے۔

۱۹۴۔ موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

جوش و کثرتِ گل چراغاں ہے تو مقوّمِ چراغاں مذکور کی موجِ شراب ٹھہری، بمشابہ روغن کے۔

۱۹۵۔ نشّے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ بس کہ رکھتی ہے سرِ نشوونما موجِ شراب

لفظ پردہ مناسبِ دماغ و دماغ مناسب ہے سرِ نشوونما کے بطرزِ ایہام التناسب نشہ و نشو اشتقاق ہے۔

۱۹۶۔ ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

کیفیت: چگونگی۔ نشہ۔

۱۹۷۔ شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل: یعنی برہانِ حدوثِ عالم موسمِ بہار ہے۔

عرفی:

اے بطبعِ باغ کون از بہرِ برہانِ حدوث

طرحِ رنگ آمیزی از فصلِ خزاں

انداختہ۔ رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب۔ قطرہ: وجودِ آدمی۔

دریا: خود شراب یا ذاتِ پاک جنابِ باری۔

رہبر: رہبری بایں طریق کہ خودی سے باہر کردے اور اپنے کو بھلا دے ہے۔

۱۹۸۔ ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

مصرعِ اول مطلع کی تضمین ہے مقطع میں۔ موجِ شراب کی بال کشائی کو ہوش کا اُڑنا لازم ہے اور مطلق پرواز کی بال کشائی ملزوم۔

حواشی

(ردیف ب)

۱۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "اُٹھی ہے" درج ہے۔ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں "اُٹھی ہے" کی جگہ "اُٹھتی ہے" لکھا ہے اور یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ تصحیح کر دی گئی ہے۔

ردیف تائے قرشت

۱۹۹۔افسوس کہ دیداں[1] کا کیا رزق فلک نے جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

دیداں: بکسر دال مہملہ و یائے معروف جمع دودہ بمعنی کرم۔

۲۰۰۔کافی ہے نشانی تری[2] چھلّے کا نہ دینا خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

نشانی کا نہ دینا یہی عین نشانی ہے۔

۲۰۱۔رہا گر کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

اک روز: وہی روزِ قیامت۔

۲۰۲۔علی الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں مبارک مبارک، سلامت سلامت

دشمن: رقیب بے وفا ہونا۔

۲۰۳۔نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

نیرنگ: عجائب۔

۲۰۴۔مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ یار لائے میری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

یار مفعول۔لائے کے فاعل احباب۔ضمیر راجع یار کی طرف۔کس وقت کا بیان مصرع اول میں ہے۔مصرع ثانی کی ترکیب فارسی ہے نہ اردو۔

۲۰۵۔آمدِ خط[1] سے ہوا ہے سرد[2] جو بازارِ دوست دودِ[1] شمعِ کشتہ[2] تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

شمع کشتہ کنایہ ہے بجھی ہوئی شمعِ حسن سے جس کا دھواں خط ہے اور خط سے گرمیٔ ہنگامۂ حسن سرد ہو جاتی ہے۔

۲۰۶۔ اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر　　　　کون لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

شوق: شوقِ دیدار۔

۲۰۷۔ خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے　　　　صورتِ نقشِ قدم ہوں، رفتۂ رفتارِ دوست

جیسے خانہ ویرانی و پامالی نقشِ قدم کی بسبب اس کی حیرت سے بے حس و حرکت ہونے کی ہے۔ اُسی طرح مجھ محوِ رفتارِ دوست کا حال عالمِ بے خودی میں ہے یعنی اس کی رفتار سے خانۂ نقشِ قدم کی مانند میرا خانۂ تن بھی پامال و ویرانی ہو رہا ہے۔

۲۰۸۔ چشمِ ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے　　　　دیدۂ پر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر ہماری چشمِ خوں پالا کو دیکھ کر (غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُس کے ہجر میں) سے (جس کے کرتا ہے بیان شوخیِ گفتارِ دوست) تک قطعہ بند ہے۔

۲۰۹۔ جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ　　　　سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

عنبر مضعف دماغ ہے۔

۲۱۰۔ یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ　　　　ہے ردیفِ شعر میں غالب زبس تکرارِ دوست

زبس تکرارِ دوست: وجہ پسندیدگی۔

حواشی

(ردیف ت)

۱۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "دیداں" درج ہے۔ جس کی تائید نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی اور دوسرے کئی نسخوں سے ہوتی ہے۔ جبکہ نسخۂ حامد علی خاں مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں یہاں "دیداں" کی بجائے "دنداں" چھپا ہے۔ جس کی انھوں نے خود ہی توجیہ بھی پیش کی ہے۔ وضاحت کے لیے دیکھیے دیوانِ غالب مرتبہ حامد علی خاں (ص ۔ ۴۱)

۲۔ بعض نسخوں میں "ترا" بھی چھپا ہے جبکہ نسخۂ نظامی اور نسخۂ انجمن میں یہاں "تری" ہی چھپا ہے۔

ردیف جیم عربی

۲۱۱۔ گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج ‌ ‌ ‌ ‌ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آج ہمارا محبوب خوش قامت سرو اور شمشاد کا باعث غیرت سیرِ چمن کو آتا ہے۔ اس لیے قمری کو ممانعت اور اس کا طوقِ گلو حلقۂ بیرونِ در ہے۔

۲۱۲۔ آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ ‌ ‌ ‌ ‌ تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اس میں قسمتِ بد کی شکایت اور فغاں کے اثر بالعکس کی حکایت ہے۔ یعنی تار نالہ صیدِ مدعا کا کمند ہونے کے عوض پارۂ دل کا کمند ہے۔

۲۱۳۔ لو ہم مریضِ عشق کے بیماردار[۱] ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

حمایت کی راہ سے پوچھتے ہیں۔ سوال میں دو پہلو ہیں ایک یہ کہ مسیحا کا علاج کچھ اچھا نہیں دوسرا مسیحا علیہ السلام کو العیاذ باللہ کیا کی سزا دینی چاہیے۔ مسیحا کی جگہ طبیبوں کا لفظ ہو تو انسب اور مقتضائے پاسِ ادب ہے۔

حواشی

(ردیف ج)

۱۔ بعض مابعد نسخوں میں یہاں ''بیماردار'' کی جگہ ''تیماردار'' چھپا ہے۔ مگر نسخۂ نظامی مطبوعہ ۱۸۶۲ء اور نسخۂ انجمن ۱۹۸۹ء میں یہاں ''بیماردار'' چھپا ہے۔ نسخۂ مالک رام اور نسخۂ عرشی میں بھی ''بیماردار ہے۔'' نسخۂ حمیدیہ طبعِ اول میں یہاں ''تیماردار'' کا اندراج شاید سہوِ کتابت ہو۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے۔ دیوانِ غالب مرتبہ حامد علی خاں (ص۔۱۰۵)

ردیف جیم پارسی

۲۱۴۔ نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

آرزو کو انتظار لازم ہے۔ مصرعِ ثانی میں کھینچنا بدو معنی ہے ایک پینا (ایہام) دوسرا اُٹھانا اگر شراب کھینچنے کو نہ ہو سکے انتظار ہی کو کھینچ۔

۲۱۵۔ کمالِ گرمیٔ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ — بہ رنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

میرے آئینۂ دل کی نہایت گرم رفتاری تلاشِ دید میں نہ پوچھ کہ بیان سے باہر ہے۔ جوہر اس آئینے کے، جو کانٹے ہو کے پائے دل میں چبھ رہے ہیں ان کو کھینچ ڈال۔ ایسا نہ ہو کہ آتشِ گرمیٔ رفتار سے یہ خار سنگ جائیں۔

۲۱۶۔ تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل — کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

انتظار کو سکوں لازم ہے۔ سکوں کو راحت۔ راحت کو بستر۔ اور بستر کا ناز اُٹھانا مراد ہے بستر کی منت اُٹھانے سے حصولِ راحت میں۔

۲۱۷۔ تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس — بہ کوریٔ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

تری: خطاب بہ حبیب بقرینۂ رقیب۔

نرگس: جو ساغر بدست ہے

بہ کوریٔ دل و چشم: کنایہ ہے علی الرغم کسی کے کچھ کام کرنے سے۔

۲۱۸۔ بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز — نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

ودیعتِ ناز خنجر ہے۔ جو نیام میں پردۂ زخمِ جگرِ عاشق کے پنہاں ہے۔ اس کو کھینچ لے اور حق ودیعتِ مذکور کا نیم غمزہ سے ادا کر کیونکہ مطلوبِ عاشق یہی نیم غمزہ ہے۔ وہ کشتہ اسی خنجرِ بیداد کا ہے نہ خنجرِ فولاد کا۔

۲۱۹۔ مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں — بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

آتشِ پنہاں: آتشِ دل۔

ردیف دال غیر منقوطہ

۲۲۰۔ حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

بارے: بارے (نسخہ)

۲۲۱۔ منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا — ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

کوئی: کوئی عاشق۔

۲۲۲۔ شمع [۱] بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں [۲] اٹھتا ہے

شعلۂ عشق [۱] سیہ پوش [۲] ہوا میرے بعد

۲۲۳۔ خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی — ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

خاک: قبر۔

ان کے ناخن جو خونِ مذکور سے حنائی ہوتے تھے اور محتاج حنا نہ ہوتے تھے، میرے بعد محتاج حنا ہوئے۔

۲۲۴۔ درخورِ عرض نہیں جوہرِ [۱] بیداد کو جا — نگہِ ناز ہے سرمے سے [۱] خفا میرے بعد

یہاں عرض و جوہر حکمت کی مشہور اصطلاح ایہام تناسب ہے۔ لفظ جوہر مناسب بہ سنگ۔ جوہرِ بیداد کنایہ سرمے سے ہے یعنی نگاہِ ناز معشوق سرمہ سے میرے بعد خفا ہے۔ کیونکہ جوہر بیداد کے قابلِ اظہار اب کوئی جا نہ رہی۔

۲۲۵۔ ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع — چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

جنوں اہلِ جنوں سے اور چاک گریباں سے میرے بعد الوداع ہوتے ہیں کیونکہ دنیا میں اب کوئی دیوانہ لائقِ صحبت اور کوئی گریباں قابلِ چاک نہ رہا۔

ردیف رائے مہملہ

۲۲۶۔ وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

دیوار شق ہو کے بصورتِ در ہو گئی اور در بگل ولائے سے بند ہو کے بصورتِ دیوار ہو گیا۔

۲۲۷۔ جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ[1]
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

لفظ سودا بمعنی شوقِ مفرط و خریداری اس معنی سے مناسب دکان یعنی تجھے سودائے انتظار نظار گیانِ حسن کا خیال ہے تو آ جا کہ خریداری متاعِ نظارہ کی ہو جائے۔ نظر در و دیوار پر پڑتی ہے خصوصاً کوچہ محبوب میں دروازہ پر رہتی ہے۔ لہٰذا در و دیوار کو دکانِ متاعِ نظر کہا۔ واللہ اعلم۔

۲۲۸۔ وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

سایہ سے: سایہ سے اُس کے یا سایہ کی مانند۔

۲۲۹۔ نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

مقدم: آمد۔

۲۳۰۔ نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

اے غالب رازِ عاشق کسی سے نہ کہہ کیونکہ زمانے میں حریف یعنی ہمدم اس راز کا کوئی نہیں ہے بجز در و دیوار کے۔ در و دیوار سے راز کہنا کنایہ اخفائے راز سے ہے۔

۲۳۱۔ کہتے ہیں کہ جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن کمال، ضعف یا نزع میں۔

۲۳۲۔ جی میں ہی(۲) کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم | سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

جی: دل۔

۲۳۳۔ مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام | چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

گفتگو: شعر و سخن۔

دشنہ و خنجر: جو مشبہ بہ ناز و غمزہ ہیں۔

۲۳۴۔ ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو | بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مشاہدہ: یعنی مراقبہ۔

بادہ: کنایہ شراب معرفت الٰہی جل شانہ سے۔

ساغر: کنایہ دلِ عارف سے۔

۲۳۵۔ کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر | جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

جلتا ہوں: ایہام۔

سوز و گداز میں ہوں یا آتشِ غم میں جلتا ہوں۔

۲۳۶۔ کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جفا | رُکتا(۳) ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

عام ہو جفا: خاص عاشق پر نہ ہو بلکہ اہلِ ہوس پر بھی ہو۔

بے سبب: کیونکہ سببِ آزار عشق ہے نہ ہوس۔

۲۳۷۔ آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے | مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

جوشِ رشک: کہ تلوار کو دست بوسی نصیب ہوئی نہ مجھے یا رشک اپنا اپنے نفس پر کہ ایسے قاتل کے مقتول ہوئے۔

مرتا ہوں: بے تلوار مارے مرتا ہوں۔

۲۳۸۔ ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق | لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

کیونکہ تری رفتارِ مستانہ کا سبب شراب ہوئی اور اس رفتار کے مارے ہوؤں کا خون گردنِ مینا پر ثابت ہوا اس لیے موجِ مے بہ خوف گرفتاری کرزاں اور لرزائی موجِ مے کی عیاں ہے۔

۲۳۹۔ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ | لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

یعنی ہم خود مملوک و بندہ ہو جاتے ہیں اپنے خریدارِ سخن و طلب گارِ کلام کے مگر جب خریدار

موصوف عیارِ سخن بھی رکھتا ہو۔ وَالّا فلا۔

۲۳۰۔ زہ! رہا ندت، بسبھ ضعدوانہ توڑ ڈال رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

رشتۂ زنار میں ہمواری ہے بہ خلاف سبحہ کے اس میں نشیب و فراز ہر قدم پر ہے۔

۲۳۱۔ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر: کیونکہ کانٹوں سے آبلے پھوٹ جائیں گے۔

۲۳۲۔ کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

یعنی بدگمانی میری دلبستگی کی کرتا ہے صورتِ غیر کے ساتھ۔ زنگار و طوطی میں بوجہ سبزی مشابہت (ہے) اور طوطی و آئینہ میں الفت ہے جیسے بلبل و گل میں۔

۲۳۳۔ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی: کیونکہ ہم مصداق خر موسیٰ صعق نہ ہوتے۔

۲۳۴۔ سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

سر پھوڑنا: تری دیوار پر سر پھوڑنا۔

۲۳۵۔ لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

فکر خستگیٔ دستِ مہر سے جو میرے لینے میں متصور ہے۔ میرا دل لرزتا ہے کیونکہ شبنم کو نوکِ خار پر سے لینا خلش دست رنجی سے خالی نہ ہوگا۔

۲۳۶۔ نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

یعنی یوسف علیہ السلام نے خانۂ زنداں کو بھی خانۂ چشمِ یعقوب کی مانند سفید کیا۔ دیدۂ یعقوب علیہ السلام جو ہجرِ یوسفؑ میں روتے روتے سفید ہو گیا تو سفیدی اس کی چونا ہو کے زندانِ یوسف پر پھر گئی۔

۲۳۷۔ فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

تعلیم فنا یافتہ یا دہندہ درسِ بیخودی کا اُس زمانے سے ہوں کہ قیس دیوارِ مکتب پر ابتدائی مشق لام الف کی جو عبارت لا (یعنی) کلمۂ نفی سے ہے کر رہا تھا۔ لفظ فنا و تعلیم و درس و مکتب مناسب مجنوں۔ کیونکہ قیس فنا فی اللیلیٰ کے مقام میں اور تعلیم یافتہ مکتب صورت و معنی تھے۔

۲۳۸۔ فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

تشویش: فکر۔

تمکداں: جو باعث مضرت زخم ہے عموماً اور سبب لذت جراحت ہے خصوصاً عاشقوں کے لیے۔

۲۴۹۔ نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا　　　کہ پشت چشم سے جس کی[۵] نہ ہووے مہر عنواں پر

اقلیم الفت: اقلیم عاشقی۔

طومار ناز: طومار ناز معشوقی۔

پشت چشم: کنایہ تغافل و اغماض و چشم پوشی سے ہے جو لازم ناز معشوقی ہے۔ چشم کی تشبیہ اس حالت میں مہر سے ظاہر ہے۔ دراصل یہ محاورہ فارسی ہے۔ کہتے ہیں پشت چشم دیدن یعنی بے توجہی دیکھنی۔

بینش کشمیری:

غیر پشت چشم دیدن حاصلی بینش نداشت
ہمچو ابری بر سر ہر دیدہ منزل داشتم

اسی طرح پشت چشم نازک کردن و تنگ کردن ناز و اغماض و تغافل کرنا اور آزردگی ناز آمیز بے دماغی و رنجش ظاہر کرنی۔ ناز و غرور سے دیکھنا۔

طغرا[۱]
چناں پشت چشمی تنک کردہ است
کہ رطل گراں راسبک کردہ است

۲۵۰۔ مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا　　　کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

یاد آیا کہ وہ ابر شفق آلودہ نہ تھا بلکہ آتش برستی تھی۔

۲۵۱۔ بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا　　　قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

کیونکہ قیامت ہنجار ناز یا رفتار ناز سے معشوق کی شبیہ ہے اس لیے صرصر کی مانند خاک شہیدان عشق پر سے گزر کے ذرہ ذرہ کو اس خاک کے برباد کر گئی۔ اس طرح کہ خاک مذکور سے کچھ باقی نہ رہا۔ لا پرواز شوق یعنی رسائی اشتیاق ناز کی، کہ وہ ایک باقی رہ گئی۔ واللہ اعلم۔

۲۵۲۔ نہ لڑ ناصح سے غالب، کیا ہوا گر اس نے شدت کی　　　ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

شدت: سختی۔

ناصح منع عاشقی میں ہم سے جنگ بشدت کرے گا تو ہم بھی تنگ آ کر اپنے یا ناصح کے گریباں

سے شدت کریں گے۔ یعنی زور سے اُس کو چاک چاک کریں گے۔

۲۵۳۔ ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

گماں اور: تا معلوم کریں کہ یہ ہمارا عاشق ہے۔ پھر ناز و انداز معشوقانہ ہم سے شروع کریں۔

۲۵۴۔ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

دے اور دل اُن کو: تا کہ بات کا ادراک کر سکیں۔

۲۵۵۔ ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

مصرع ثانی یوں ہوتو لاثانی ہوگا۔

مصرع پر اور ہے یہ تیر اور اُس کی ہے کماں اور

۲۵۶۔ تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

جب تم جیسا دلبر جاں زبا شہر میں ہو تو ہمیں اپنی گرفتاری کا کچھ نہیں ہے۔ ہم بازار جائیں گے تو نقدِ دل و جاں کشتگانِ عشق تمھارے لیے اور لے آئیں گے۔ کوئی ہم سے مواخذہ نہ کرے گا کیونکہ معاملہ شہیدانِ محبت کی باز خواست ہوتی نہیں۔ دوسرا اور بہ معنی دیگران یعنی رقیبان لیا جائے۔ یعنی جب ہم دنیا سے اُٹھ جائیں گے تو ہمیں فکر کیا ہے۔ تمھیں دل دینے والے بوالہوس بازار سے دل و جاں مول لائیں گے۔ ظاہر ہے یہ چیزیں بازار میں بکتی نہیں۔ اس میں طعن و تعریض ہے واللہ اعلم۔

۲۵۷۔ ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

یعنی خود شکنی ہنوز نہ کی اور بتِ نفس کو نہ توڑا۔

۲۵۸۔ مرتا ہوں اُس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

کشتہ ان کی آواز ”ہاں اور“ کا ہوں کہ سر اُڑ جائے تو بھی وہ جلاد سے کہے جاتے ہیں کہ اور ہاتھ لگائے جا۔

۲۵۹۔ لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور

اِک داغِ نہاں: جس کو خورشید گماں کرتے ہیں۔

۲۶۰۔ لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

لیتا: چین لیتا۔

کرتا: آہ و فغاں کرتا۔

۲۶۱۔صفائے[۱] حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ[۲] آخر   تغیر آبِ بر جا[۱] ماندہ کا پاتا ہے رنگ[۲] آخر

یہ دعویٰ ہے کہ صفائے حیرت آخر کو سامانِ کدورت ہو جاتا ہے۔ مصرعِ ثانی اس کی دلیل ہے۔

صفائے حیرتِ آئینہ مبدل بزنگ کی تمثیل آبِ برجاماندہ سے جو متغیر ہو جائے ایک تازہ مضمون ہے۔

۲۶۲۔جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی   گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

جب عریانی دستگیر جنوں ہے تو مجنونِ گریباں چاک کا حق میری گردن پر ہو گیا ہے۔ گردن بھی جامہ سے باہر اور ننگی ہوا کرتی ہے اس لیے میں عریاں ہو کے لباس اپنی گردن سے کھینچ کے مجنوں کے گلے میں ڈال دیتا ہوں کہ وہ گریباں، بالائے گریباں حسب دل خواہ اپنے، چاک کرتا جائے۔

۲۶۳۔بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی   ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

نیرنگ یعنی شعبدۂ بیتابی بمقدار ہزار آئینۂ دل ہم رنگ کاغذِ آتش زدہ یک بالِ تپش پر باندھے ہے۔ بالِ تپش تمثیلِ کاغذِ آتش زدہ اور شرر افشانی کاغذِ مذکور تمثیلِ ہزار آئینۂ دل ہے۔

۲۶۴۔فلک[۱] سے ہم کو عیشِ رفتہ[۲] کا کیا کیا تقاضا ہے

متاعِ بُردہ[۲] کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر[۱]

۲۶۵۔ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے   شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی، چشمِ روزن پر

بے سبب رنج: آزردہ بے وجہ ہونے والا۔

آشنا دشمن: دشمن اپنے دوست کا۔

تہمت: بدگمانی۔

۲۶۶۔فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا   فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر(۱)

گلخن: آتش دانِ حمام۔

۲۶۷۔اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے   کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اے قاتل موافق اُس اندازِ دلپسند کے جس کا بسمل اسد ہے ناز کی مشق تو کیے جا۔ میں جو ترغیب اس قتل کی دلانے والا ہوں دو عالم کا خون میری گردن پر ہوگا نہ کہ تجھ پر۔

۲۶۸۔ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   تکلف بر طرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

پس میرا رقیب جو تجھ سا ہوگا میں اُس سے دل لگاؤں گا اور تجھے مارے رشک کے اپنے رقیب کا رقیب بناؤں گا۔ بنابریں مصلحت تیرا ستم کش محبت ہوں۔ اس مضمون میں ایک نیا انداز، واسوخت

کی ادا پر ہے۔

۲۶۹۔مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا　　ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور(۷)

تیرا سنگِ آستاں نہ گھسے گا۔ میرا سر تو گھس کے مٹ جائے گا۔ اس لیے ہوں در پہ ناخ۔

۲۷۰۔آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں　　مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

نہیں: نہ رہو گے۔

۲۷۱۔جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے　　کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اس دن کے سوائے جو آج جاتے ہو قیامت کا کوئی دوسرا دن نہیں ہے کہ ہمارے حق میں قیامتِ عظمیٰ یہی ہے۔

۲۷۲۔تم کونسے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

تقاضا: تم سے نقدِ جان کا تقاضا۔

۲۷۳۔مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی　　بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

۲۷۴۔گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش　　کرنا تھا جواں(۸) مرگ گزارا کوئی دن اور

قطعہ بند ہے۔

خوش و ناخوش: نفرت و لڑائی میں۔

۲۷۵۔ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ　　قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

تمنائے مرگ میں تلخ کامی سے بسر کرنا کوئی دن اور قسمت میں غالب کی ہے۔

maablib.org

حواشی

(ردیف ر)

۱۔ وثوقِ صراحت میں یہاں " آہ" درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں " آہ" کی جگہ " آ" لکھا گیا ہے۔ تصحیح کردی گئی ہے۔

۲۔ نسخۂ حسرت میں "جی میں ہی" کی جگہ "جی ہی میں" درج ہے۔ جبکہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں "جی میں ہی" درج ہے۔

۳۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "رکھتا ہوں" درج ہے جس کی تائید دوسرے کسی نسخے سے نہیں ہوتی۔ یہ سہوِ کتابت ہے جس کی تصحیح نسخۂ انجمن کے مطابق "رکتا ہوں" کردی گئی ہے۔

۴۔ وثوقِ صراحت میں سہوِ کتابت کے باعث "پہ" رہ گیا تھا۔ چنانچہ "پہ" کا اضافہ کردیا گیا ہے۔

۵۔ وثوقِ صراحت میں "جسکی" درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں "جھکے" درج ہے۔ لہٰذا درستی کردی گئی ہے۔

۶۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "گلشن کا" درج تھا جو کہ سہوِ کتابت ہے اس کی تصحیح جو کہ "گلشن پہ" ہے کر دی گئی ہے۔

۷۔ یہ "زین العابدین خاں عارف" کا مرثیہ ہے۔

۸۔ وثوقِ صراحت میں "کرتا تھا" درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں "کرتا تھا" درج ہے۔ تصحیح کردی گئی ہے۔

ردیف زائے معجمہ

۲۷۶۔ فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح[۱] و مہر[۲] ہے داغ[۲] عشق زینتِ جیبِ کفن[۱] ہنوز

فارغ: بعد مُردن عشق سے فارغ۔

۲۷۷۔ ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز

ناز: کہ ہم بھی کبھی ایسے زردار تھے۔

۲۷۸۔ مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیدادفن ہنوز

خاک بھی نہیں: خاک بھی نہیں چہ جائے خوں۔

خمیازہ کھینچے ہے: ہمارے خونِ جگر کی شراب پینے کے لیے انگڑائی لیتا ہے۔

۲۷۹۔ حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

ہمارا افسونِ نیاز مدعیٔ مطلبِ مشکل نہیں۔ عمرِ خضر جو خود دراز ہے ہم دعا گو اُس کے ہیں۔ اس (سے) دعا کی قبولیت اور مطلب کی سہولت ظاہر ہے۔

۲۸۰۔ نہ ہو، بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

بے ہودہ وہم وجود کا صحرا نورد نہ ہو کہ یہ بیاباں پُر از نشیب و فراز ہے۔ نشیب و فراز کنایہ زمین و آسماں سے ہے۔ دوسرا تیرا تصور ہنوز ناہموار اور اُس میں پستی و بلندی باقی ہے۔ تو زمین و آسمان کو جو موہوم اور معدوم ہیں یا ہونیوالے ہیں موجود تصور کرتا ہے۔

۲۸۱۔ وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

جلوہ تماشا: تماشا جلوۂ جمال کا دکھانے والا۔

پرواز: بدالِ مہملہ صیقل۔

۲۸۲۔ ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست　　گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

ایک ایک ذرہ خاکِ عاشقِ آفتابِ جلوۂ نازِ معشوق کا پرستار ہے۔ ذرات کا آفتاب پرست ہونا یعنی ہوائے مہر میں پرواز کرنا آشکار ہے۔

۲۸۳۔ نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ　　جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

جنون: عشق۔

خاک انداز: بسکونِ کاف ظرفی است از آہن کہ خاک وخاشاک خانہ را پس از روبیدن در آں کردہ بیرون ریزند۔

خواجہ حافظ گفتہ:　　خیز و در کاسۂ زر آبِ طرب ناک انداز
　　پیشتر زانکہ شود کاسہ سر خاک انداز(۱)

انجمن آرا۔

۲۸۴۔ وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک　　گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز

کریموں کی فراخیِ کوششِ کرم کو دیکھ کر تمام روئے زمین پر ابرِ گہر بار آبلہ پا گزرتا ہے۔ آبلہ کنایہ قطراتِ باراں سے اور گوہر بھی کنایہ انہی قطروں سے ہے جو صدف میں جا کر موتی بنتے ہیں۔ فافہم۔

۲۸۵۔ یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت　　نقشِ پا میں ہے تبِ(۲) گرمیٔ رفتار ہنوز

ہمارے نقشِ قدم میں گرمیٔ رفتار کا بخار ہنوز باقی ہے۔ جس سے صفحۂ دشت یکسر کاغذِ آتش زدہ کی مانند جل رہا ہے۔

۲۸۶۔ کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

وہ صنم میرا ایمان ہے تو جان ایمان پر سے قربان ہے۔

۲۸۷۔ دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے　　ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

نکلا بہ سبب نکالنے کے اور نہ نکلا یعنی بھولا نہ گیا بہ سبب عزیز ہونے کے۔

شیخ فرماتے ہیں:

ای مونس روزگار سعدی
رفتی و نہ رفتی از ضمیرم

۲۸۸۔ تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ　　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

واقعہ سخت ہے: جیسے ہنگامۂ غدر ہندوستان کا اور جان کا بچا لے جانا اس سے بے تحملِ شدید نا گزیر تھا۔

۲۸۹۔ نہ (۳) گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

شکست کی آواز: اس میں ایہام ہے بمعنی صیتِ ہزیمت یا اپنے شیشۂ دل کی شکست کی آواز ہوں نہ نغمۂ خوشدلی۔

۲۹۰۔ تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　　میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز (۴)

اندیشہ ہائے دور ودراز: بمقتضائے بدگمانی عشق کہ اغیار کی بزم آرائی وصال یا عاشقانِ نو کی دل ربائی کے واسطے یہ سنگھار ہو رہا ہے۔ لطفِ دور و دراز بہ رعایتِ کاکل ہو یدا ہے۔

۲۹۱۔ لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی　　　ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ایسے دلگداز اسرارِ عاشقی کا میں راز دار ہوں کہ سامع اُن کو سن کر اگر لافِ صبر وتحمل مارے (تو) لاف زنی اُس کی فریبِ نادانی سے ہوگی۔

۲۹۲۔ ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد　　　ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

گرفتارِ الفتِ صیاد ہوں اس لیے اُڑ نہیں جاتا۔

۲۹۳۔ وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے　　　ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

حسرت: ارمان۔

حواشی

(ردیف ز)

۱۔ ترجمہ: اُٹھیے اور سونے کے پیالے میں آبِ طرب ناک ڈالیے
اس سے پہلے کہ سرِ انساں خاک نشیں ہو جائے۔

۲۔ وثوق صراحت میں یہاں "تپ" درج ہے۔ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ رضا اور دوسرے کئی نسخوں میں "تب" درج ہے۔ چند نسخوں میں "تب" چھپا ہے جو کہ "تپ" ہی کا ہم معنی ہے۔ تاہم یہاں نسخۂ انجمن کے مطابق درستی کر دی گئی ہے۔

۳۔ بعض نسخوں میں "نہ" کی جگہ "نے" بھی چھپا ہے۔ نسخۂ نظامی (۱۸۶۲ء) میں "نہ" ہی چھپا ہے۔

۴۔ وثوق صراحت میں یہاں "دُور و دراز" درج ہے۔ بالکل اسی طرح نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ طباطبائی، نسخۂ حسرت موہانی، نیز مہر، بیخود اور نشتر جالندھری کے نسخوں میں ہمیں "دُور و دراز" ملتا ہے۔ لیکن نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام نیز متعدد نسخوں میں یہاں "دُور دراز" ملتا ہے۔ بقول حامد علی خاں "دُور دراز" (بلا عطف) صحیح فارسی ترکیب ہے۔ جس کی شہادت فرہنگ آنند راج اور سٹائین گاس کی فارسی انگریزی لُغات سے بھی ملتی ہے۔

maablib.org

ردیف سین مہملہ

۲۹۴۔ مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے — دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

چاہتے (ہیں) کہ ہم بھی مرغِ مذکور کی مانند اسیرِ دام مستورِ سطور ہو جائیں۔

۲۹۵۔ جگرِ تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا — جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

جوئے خوں بہائی آبلوں سے۔

۲۹۶۔ میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے — دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

غمخوار: ناصح۔

۲۹۷۔ دیکھ کر تجھکو چمن بسکہ نمو کرتا ہے — خودبخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

نمو: بالیدگی۔

ردیف شین معجمہ

۲۹۸۔ فروغِ[۱] حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق — نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش[۱]

خار یعنی رشتۂ شمع۔ خار مفعول۔ آتش فاعل۔

نہ نکلے: خار نہ نکلے۔

ردیف عین مہملہ

۲۹۹۔ جادۂ[۱] رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ[۱] شعاع   چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

خور: خورشید۔

۳۰۰۔ رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع   ہوئی ہے آتشِ گل، آبِ زندگانیِ شمع

رُخِ نگار: جو بمنزلہ آتشِ گل ہے۔

آتشِ گل: سرخیِ گل یعنی رُخِ نگار گلزار۔

۳۰۱۔ زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی   یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

یہ بات: مرگِ خاموشی۔

۳۰۲۔ کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ، قصہ تمام   بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

۳۰۳۔ ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے   بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پر فشانیِ شمع

اہتزاز: جنبشِ خوشحالی۔

بہ جلوہ: بائے تشبیہ۔

پر فشانی: بال افشانی۔

۳۰۴۔ نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ   شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

شگفتگی: بہار کی شگفتگی۔

شہید: کشتہ۔

گلِ خزانیِ شمع: گلِ خزاں زدہ شمع یعنی سوختہ و پژمردہ جس کو گلگیر قطع کرتا ہے۔

۳۰۵۔ جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو   نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ عشق

بدگمانیِ عشق: عشقِ شمع کی بدگمانی یار کے ساتھ۔

ردیف فا

۳۰۶۔ ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش مجبور، یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

مجبور: ناچار۔

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش: کیونکہ رقیب محبوب کے روبرو بے ہوش دیکھ کے سمجھے گا کہ عاشق ہے۔

۳۰۷۔ جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

ناتمامی: نقص۔

maablib.org

ردیفِ کافِ عربی

۳۰۸۔ گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

نمک دنیا میں ایسا کتنا ہوتا ہے، جو سامانِ نازِ اپنے زخمِ دل کا ہوتا۔ یہ صفت سامان ہونے کی صرف غبارِ راہِ یار ہی میں ہے۔

۳۰۹۔ مجھ کو[۱] ارزانی رہے تجھ کو[۲] مبارک ہوجیو نالۂ بلبل کا درد[۱] اور خندۂ گل کا نمک[۲]

ارزانی: میسر۔ میں جو عاشقِ نالاں ہوں میرے نالہ کو یا دل کو درد نالۂ بلبل میسر ہو جائے۔ تو جو معشوقِ خنداں ہے ترے لب یا چہرہ کو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو جائے(۱)۔ یہ دونوں دعائیہ جملے متضمنِ صنعتِ تقسیم ہیں۔

۳۱۰۔ شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

گردِ ساحل ہے الخ: بہ تاثیر اس شور کے۔

۳۱۱۔ داد دیتا[۱] ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ(۲) یاد کرتا[۱] ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

۳۱۲۔ چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

چھوڑ جانا قاتل کا۔

۳۱۳۔ غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ(۳) درد زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

منت: احسانِ نمک پاشی۔

زخم: خود اپنا زخم۔

۳۱۴۔ یاد ہیں غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں	زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

وجدِ ذوق: شیفتگی و حالتِ شوق۔

۳۱۵۔ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہوتے تک (۴)	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

سر ہوتے تک: رہا ہوتے یعنی دراز ہوتے تک۔

۳۱۶۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب	دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

مصرعِ ثانی ایسا ہوتا تو اچھا ہوتا۔

مصرع	رنگ اس دل کا ہو کیا خونِ جگر ہوتے تک

۳۱۷۔ غم [۱] ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ [۲] علاج
شمع [۱] ہر رنگ میں جلتی ہے سحر [۲] ہوتے تک

حواشی

(ردیف ک)

۱۔ وثوقِ صراحت میں یہاں قدیم اُردو املاء کے مطابق "جیو" لکھا تھا۔ جس کو آج کے اُردو املاء کے مطابق "جائے" کر دیا گیا ہے۔

۲۔ اکثر قدیم وجدید نسخوں میں "واہ واہ" درج ہے۔ جبکہ بعض نسخوں میں "واہ وا" بہ تخفیف لکھا گیا ہے۔

۳۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "توقیر" درج ہے۔ جبکہ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ رضا اور دیگر کئی نسخوں میں یہاں "توفیر" درج ہے۔ تصحیح کر دی گئی ہے۔

۴۔ مالک رام صاحب نے کہا ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں جتنے بھی دیوان شائع ہوئے ان کی ردیف "ہوتے تک" ہی ہے۔ اگرچہ یہ بات درست معلوم ہوتی ہے تاہم مولانا غلام رسول مہر نے "ہونے تک" کی ردیف میں ایک نیم مشروط سی دلیل دی ہے۔ قدیم نسخوں میں بھوپال کے نسخۂ حمیدیہ میں ردیف "ہونے تک" ہے۔ یہاں سہوِ کتابت کا امکاں خارج از امکاں نہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، "دیوانِ غالب" مرتبہ "حامد علی خاں" (ص۔ ۶۳)

ردیف کاف فارسی

۳۱۸۔ گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
دعا نہ مانگ کسی مدعا کے لیے۔

ردیفِ لام

۳۱۹۔ ہے[ا] کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل بلبل[ا] کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
ہلاک: کشتہ۔

۳۲۰۔ آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
ٹوٹے پڑے ہیں فصلِ خزاں میں۔

۳۲۱۔ جو تھا سو موجِ رنگ[ا] کے دھوکے میں مر گیا اے وائے نالۂ[ا] لبِ خونیں نوائے گل
وَاَلا موجِ مذکور نالۂ خونیں گل تھا۔ مرنے والے پہ نالۂ مذکور گویا نوحۂ ماتم ہے۔

۳۲۲۔ ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
اے گل یا بوئے گل کو تیری ہم آغوشی یا شانہ افروزی کے لیے۔
نفس: بو۔ نکہت۔

۳۲۳۔ تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل
چونکہ موسمِ بہار کی جلوہ گری میں تیرے ہی جلوۂ حسن کا دھوکا تھا اس کے دیکھنے کو گل پسِ گل دوڑے جاتے ہیں۔

ردیف میم

۳۲۴۔ غم [۱] نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس [۲]
برق [۲] سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ [۱] ہم

۳۲۵۔ محفلیں [۱] برہم کرے ہے گنجفہ [۲] بازِ خیال [۳]
ہیں ورق گردانیٔ [۱] نیرنگِ یک بت خانہ [۲] ہم [۳]

گنجفہ بازِ خیال: یعنی شاعر۔

نیرنگ: یعنی نیرنگِ خیال۔ بت خانہ باعتبار بتانِ مضامین کہا۔

۳۲۶۔ باوجودِ یک جہاں [۱] ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ [۱] شبستانِ دلِ پروانہ ہم

۳۲۷۔ ضعف [۱] سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہ [۱] ہمتِ مردانہ ہم

۳۲۸۔ دائم الحبس [۱] اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ [۱] پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

۳۲۹۔ بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر، بجز صدا معلوم

دلبستگی: عاشقی

۳۳۰۔ مجھ کو دیارِ غیر میں مارا [۱] وطن [۲] سے دور
رکھ لی مرے خدا [۱] نے مری بے کسی [۲] کی شرم

بے کسی: جو وطن میں بے کس تھا۔

۳۳۱۔ وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم

کمیں: قابو یا گھات میں مری گرفتاری کے۔

وارستگی: آزادی۔

ردیف نون

۳۳۲۔ دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

وہ دماغ: جس میں شورِ سودائے خال و خط رہا کرتا تھا۔

۳۳۳۔ تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایک شخص کے: محبوب یا آشنا کے۔

رعنائی: زیبائی و آراستگی۔

۳۳۴۔ فکرِ دنیا میں سر[۱] کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال[۱] کہاں

۳۳۵۔ آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

کیا کہتے ہیں: ہم یا وہ۔

۳۳۶۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

مے و نغمہ اب اندوہ فزا ہیں۔

۳۳۷۔ دل میں آ جائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے — اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے: محبوب دل میں آجاتا ہے نہ (کہ) آنکھوں میں۔ دوسرے مصرعے میں تعریض ہے نارسائی پر نالہ کی۔

۳۳۸۔ پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے — خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا[۱] کہتے ہیں

مہر گیا: ایک جڑی (بوٹی) ہے الحب کی۔

۳۳۹۔ اِک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا　　آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

شرر: سوزِ عشق۔

ہوا: عشق و محبت۔

۳۴۰۔ دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ　　اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

نامِ خدا: کلمۂ تحسین بحذف باے موحدہ

پیر نہیں میر جی کاہل اللہ رے

نام خدا ہو، جوان کچھ تو کیا چاہیے

نامِ خدا: ماشاءاللہ

۳۴۱۔ آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں　　ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

دامن میں نہیں: بسبب صد چاک ہونے کے۔

۳۴۲۔ ضعف سے اے گریہ، کچھ باقی مرے تن میں نہیں　　رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

گریہ کی جگہ اشک بمعنی قطرۂ آبِ چشم ہوتو کلام مطابق اقتضائے مقام ہوگا۔

۳۴۳۔ ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ[۱] آفتاب　ذرّے[۱] اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع نظارے کی محویت میں۔

۳۴۴۔ قطرہ قطرہ ایک ہیولیٰ[۲] ہے نئے ناسور کا　　خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

ہیولیٰ: مجملِ صورت جسمی۔

۳۴۵۔ عُہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا　　گر اِک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

ایک عہدہ مدحِ مذکور کا ادا ہو یا ایک ادائے ناز تیری ہو تو اپنی موت ہے۔ ادائیں بکثرت ہوں تو اللہ کی پناہ۔

۳۴۶۔ حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بہ سُوئے دل　　ہر تارِ زلف کو نگہِ سُرمہ سا کہوں

حلقے: حلقے زلف کے۔

نگہ سرمہ سا: نگہ سرمہ آلود حلقہ ہائے زلف کے آنکھوں کی۔

۳۴۷۔ میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش　　تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

اور: عطفِ لازمہ۔

نوائے جگر خراش: باتیں دل و جگر کی خستہ کرنے والی۔
نہ شنیدن کہ کیا کہوں: نہ سننا نوائے جگر خراش کو جس کے نہ سننے کی تعریف کیا کروں یا تیرا ہی تجاہلاً کہنا کہ کیا کہوں۔

۳۴۸۔ ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے، خدا نہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں
گماں سے: ظنِ خیر سے جس کا بیان مصرع ثانی میں ہے۔

۳۴۹۔ مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں
گیا وقت: زمانۂ ماضی۔

۳۵۰۔ ضعف[۱] میں طعنۂ[۲] اغیار کا شکوہ کیا ہے بات[۲] کچھ سر[۱] تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
اُٹھا بھی نہ سکوں: ایہام برداشت۔

۳۵۱۔ زہر[۱] ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستم گر ورنہ کیا قسم[۱] ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں
کھا بھی نہ سکوں: زہر کو۔

۳۵۲۔ ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
عذرِ مستی: بہانۂ بدشرابی۔

۳۵۳۔ غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
غرہ: مغرور و فریفتہ۔

بنا: مرتبہ۔

عالمِ امکاں: دنیا۔

۳۵۴۔ نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کی جگہ نالہ ہائے غم ہو تو مناسب مقام ہے۔

۳۵۵۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں اک چھیڑ ہے و گرنہ مراد امتحاں نہیں
جفائے محبوب سے ہماری ترکِ وفا کا گماں کہ ہم کو عاشقِ بے وفا سمجھ کے جفا کرتا ہے، نہیں ہے بلکہ جفا کاری لازم حسن کی ہے۔ مقصد محبوب کا ہمارا امتحاں نہیں ہے۔

۳۵۶۔ کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں: ہمارے پوچھنے کو آئے ہیں مگر مارے شرم کے بات نہیں

کرتے۔

۳۵۷۔ ہم کو ستم[۱] عزیز[۲]، ستم گر کو ہم عزیز نامہرباں[۲] نہیں ہے اگر مہرباں نہیں[۱]

۳۵۸۔ بوسہ[۱] نہیں، نہ دیجے دشنام[۲] ہی سہی آخر زباں[۲] تو رکھتے ہو تم گر دہاں[۱] نہیں

دہاں معدوم ہے تو بوسہ معلوم یعنی بوجہ تنگیٔ دہاں گویا نہیں ہے تو بوسہ اُس کا کہاں۔

۳۵۹۔ ہرچند[۲] جاں گدازیٔ[۱] قہر و عتاب ہے ہرچند پشت گریٔ تاب و تواں نہیں

ق

۳۶۰۔ جاں مطربِ ترانۂ[۱] ھَل مِن مَزِید ہے لب پردۂ[۲] سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

قطعہ بند ہے۔ جاں گدازی قہر و عتاب: محبوب کے قہر و عتاب کی جاں گدازی۔

پشت گریٔ تاب و تواں: ہم کو پشتی بانیٔ تحمل و طاقت۔

۳۶۱۔ خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم دل میں چھری چبھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں

ق

۳۶۲۔ ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں

قطعہ بند ہے۔ چیر: خطابِ عام لِعُشّاق۔

آذر: آتش۔

۳۶۳۔ نقصاں نہیں جنوں[۲] میں، بلا سے ہو گھر[۱] خراب

سو گز[۱] زمیں کے بدلے بیاباں[۲] گراں نہیں

سو گز زمیں: گھر۔

بدلے: عوض۔

بیاباں گراں نہیں: صحرا گراں قیمت نہیں ہے باایں وسعت جو سو گز زمیں کے عوض ہاتھ آئے۔

۳۶۴۔ کہتے ہو(۳) کیا لکھا ہے، تری سرنوشت میں گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

سجدۂ بت: خطِ سرنوشت یہی ہے۔

۳۶۵۔ پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

جبرئیل علیہ السّلام میرے کلام کی داد دینے والے ہیں۔

روح القدس: جبرئیل علیہ السّلام۔

۳۶۶۔ جاں ہے بہاے بوسہ دلے کیوں کہے ابھی غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

نیم جاں نہیں: ابھی شوقِ بوسہ میں نیم جاں نہیں ہے۔

۳۶۷۔ مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے میرے پانوں میں، زنجیر نہیں

چکر: ایہام بمعنیٔ گردش وحلقۂ زنجیر۔

۳۶۸۔ شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں جادہ، غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

دشت: دشتِ بے کنارو سرور گم۔

جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں: جادہ معدوم و ناپید ہے جیسے نگاہ دیدۂ تصویر میں۔

۳۶۹۔ حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رہی جاتی ہے: اگر اس جادہ پر سلوک نہ کریں۔

۳۷۰۔ رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

زبونی کش: عاجزی اُٹھانے والا۔

۳۷۱۔ سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے لذّتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

سر کھجاتا ہے: ایہام پھر زخمِ سنگ کھانے کے لیے اور خراش میں جو ایک مزہ ہوتا ہے معلوم ہے۔

سنگ: سنگِ طفلاں جس کے مار میں جراحت والتیام دونوں کا اثر ہے۔

سر کھجانا: کنایہ ہے دوبارہ مار کھانے کی خواہش پیدا ہونے سے۔ نظیر اس کی سر توقع خاریدن یعنی متوقع شدن۔

۳۷۲۔ جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

کرم: کرمِ محبوب۔ کوئی تقصیر الخ بیباکی تقصیر سے شرمندہ ہونا یہی بڑی تقصیر ہے۔

۳۷۳۔ مت مردُمکِ [۱] دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں [۲] ہیں جمع سویدا [۱] ے دلِ چشم میں آہیں [۲]

مردمک: پتلی۔

سویدا: نقطۂ سیاہ۔

۳۷۴۔ اُلفتِ گل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

وارستگی: رہائی یعنی دعویٔ آزادی اُلفتِ گل سے اگر سرو بھی کرے تو غلط ہے۔ ثبوت اس کا دوسرے مصرع میں دیکھو۔

۳۷۵۔ عشق[۱] تاثیر[۲] سے نومید نہیں — جاں سپاری، [۱] شجرِ بید[۲] نہیں

شجرِ بید نہیں کہ بے ثمر ہو۔

۳۷۶۔ سلطنت[۱] دست بدست آئی ہے — جامِ مے[۲] خاتمِ جمشید نہیں

دست بدست: یہ لفظ تلازماتِ جام سے ہے۔ خاتمِ جمشید نہیں کہ صرف جمشید کی انگشت پر منحصر ہو۔

۳۷۷۔ بے تجلی[۱] تری سامانِ[۲] وجود — ذرہ[۲] بے پرتوِ خورشید[۱] نہیں

۳۷۸۔ رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

رسوا ہو جائے کہ فلانے معشوق کا عاشق مرگیا اور رازِ معشوق کھل گیا۔

۳۷۹۔ گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

محرومیٔ جاوید: کہ اس میں رنگِ طرب کے تغیر کا کچھ ڈر ہی نہیں۔

۳۸۰۔ جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

خیاباں: کیاریاں چمن کی۔

ارم: باغِ شداد۔

۳۸۱۔ دلِ آشفتگاں[۱] خالِ کنجِ[۲] دہن کے — سویدا[۱] میں سیرِ عدم[۲] دیکھتے ہیں

۳۸۲۔ تماشا کر[۳] کہ اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

آئینہ داری: آئینہ بینی۔

۳۸۳۔ سراغِ[۱] تفِ نالہ لے داغِ دل[۲] سے — کہ شب رو[۲] کا نقشِ قدم[۱] دیکھتے ہیں

۳۸۴۔ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

خوئے یار سے: تیزیٔ خوئے یار سے۔

نار: دوزخ۔

کافر ہوں: قسمیہ۔

عذاب: عذابِ دوزخ۔

۳۸۵۔ قاصد کے آتے آتے خط اِک[۵] اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

یعنی وہ لکھیں گے کہ مطلبِ خط معلوم نہ ہوا یا نویسندہ کون ہے؟

۳۸۶۔ جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

جو منکرِ وفا ہو: یعنی محبوب۔

فریب: فریبِ وفاداری رقیب۔

دوست: حبیب۔

دشمن: رقیب۔

۳۸۷۔ میں مضطرب ہوں وصل میں، خوفِ رقیب سے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

۳۸۸۔ میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

قطعہ بند ہے۔ خوف: کہیں وصل سے مطلع نہ ہو جائے۔

وہم: وہم اس کا کہ بہ خیالِ وصال، دوسرے محبوب کے میں مضطرب ہوں۔

اور: عطفِ استبعاد۔

حظِ وصل: اشعار مابعد میں حظِ وصل کا بیاں ہے۔

خدا ساز بات ہے: اتفاقی امر ہے جو کسی قدر حظِ وصل پایا اور اضطراب میں جاں دینی بھول گیا تو پھر حظِ کاملِ وصل کیا اُٹھایا ہوگا۔

۳۸۹۔ ہے تیوری[۱] چڑھی ہوئی اندر نقاب کے[۲] ہے اک شکن[۱] پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

تیوری چڑھی ہوئی محبوب کی۔

طرف: کنارہ۔

۳۹۰۔ لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

لگاؤ: دلبستگی۔

چرانا نگاہ کا: شرم کے مارے چرانا نگاہ کا۔

ایک بگڑنا: ایک بگڑنا محبوب کا کہ ان لاکھوں کو برباد کر دے۔

۳۹۱۔ وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

جگہ: منزلت۔

شگاف پڑے آفتاب میں: شگاف پڑے آفتاب میں مگر محبوب کے دل میں اثر نہ کرے۔

۳۹۲۔ وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے: وہ افسوں وجادو طلب وصل میں کام نہ آئے۔

۳۹۳۔ کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

کل: ایہام۔ کل قیامت کے روز ساقیِ کوثر تنگ دل نہ فرمائیں گے۔

۳۹۴۔ جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

سماع: راگ۔

وہ صدا: صدائے نغمہ جو جاں بخش ہے یا صدائے الست بہ مذہب صوفیہ۔

۳۹۵۔ اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اپنی حقیقت: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ۔

وہمِ غیر سے: عالم کو غیر اللہ جاننے سے۔

۳۹۶۔ اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود: دیدن۔

شاہد: بینندہ۔

مشہود: دیدہ شدہ۔

مشاہدہ: دیدن۔

حیراں ہوں: کیونکہ مشاہدہ میں دوئی پائی گئی بلحاظ مشاہدہ و مشہود کے۔

۳۹۷۔ ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

یہاں کیا دھرا ہے بجز بحر کے۔

۳۹۸۔ شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

ناز ہے: نازِ محبوب ہے کہ اپنے سے شرماتا ہے۔

ہیں کتنے بے حجاب: ہیں کتنے بے حجاب در باطن۔

ہیں یوں حجاب میں: ہیں یوں حجاب میں بظاہر۔

۳۹۹۔ آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

فارغ نہیں: فارغ نہیں حجاب میں بھی۔

۴۰۰۔ ہے غیب [۱] غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود [۲]

ہیں خواب[۱] میں ہنوز، جو جاگے[۲] ہیں خواب میں

غیبُ الغیب: وجودِ باری تعالیٰ یعنی عالمِ ظاہر بھی از روئے ماہیتِ عالمِ غیبُ الغیب ہے۔

۳۰۱۔ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ساتھ رکھوں نوحہ گر کو رونے پیٹنے کے لیے۔

۳۰۲۔ چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

پوچھتا ہوں بطریقِ تجاہل۔

۳۰۳۔ جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ ترے رہگزر کو میں

جانا پڑا پکڑے ہوئے یا از راہِ خوشامد۔

۳۰۴۔ ہے کیا جو کس کے باندھیے، میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میری بلا ڈرے اس بات سے کہ کمر لچک جائے گی۔

۳۰۵۔ لو وہ بھی کہتے ہیں یہ بے ننگ و نام[۱] ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا[۱] نہ گھر کو میں

وہ: جن کے لیے گھر کو لٹا دیا۔

۳۰۶۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو[۱] کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر[۱] کو میں

پہچانتا نہیں ہوں: تعریض ہے ہادیانِ شریعت پر۔

۳۰۷۔ خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

خواہش: ہوا پرستی۔

اُس بتِ بیداد گر کو نہیں پوجتا بلکہ اپنی خواہشِ نفس کو پوجتا ہوں۔

۳۰۸۔ پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار — جاتا و گرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

جاتا و گرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں: یعنی اپنے کو وہیں چھوڑ آیا۔

۳۰۹۔ اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

اہلِ زمانہ کو اپنی مانند ہنر مند سمجھا ہوں کہ اَلْمَرءُ یَقِیسُ عَلٰی نَفْسِہ۔(۲)

۳۱۰۔ ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

از بسکہ میرا ذکر بہ بدی بھی ناگوارِ طبعِ معشوق ہے تا بہ نیکی چہ رسد (تو ذکرِ نیک کی رسائی کہاں)

پس بات رقیب کی میری بدی کی بابت بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں۔

۳۱۱۔ وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

سیرِ گلستاں: کنایہ خوں ریزیِ عاشق سے ہے۔

شوق: یعنی آرزوے عاشق قتل ہونے پر دستِ معشوق سے۔

مذکور نہیں: مذکور نہیں وعدۂ سیر گلستاں میں۔

۳۱۲۔ شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

ہستیِ مطلق: باری تعالیٰ بقول صوفیۂ وجودیہ۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہے: یعنی محبوب کی کمر ہے۔

ہمیں منظور نہیں: کیونکہ کمر معدوم ہے۔ مفروض موہوم ہے۔

۳۱۳۔ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

تنگ ظرفی: کم ظرفی۔

۳۱۴۔ حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی (۸) عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

گوں: بوزنِ عوں۔ مونث۔ قابو فرصت۔ گونا بالفتح۔ مذکر۔ بخانہ آوردن عروس ۱۲ دلیل ساطع۔

۳۱۵۔ ظلم کر ظلم، گر لطف دریغ آتا ہو تُو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

ہر چند تغافلِ ظلم میں ایک امر پسندیدہ ہے مگر تجھ سے پسندیدہ نہیں کیونکہ تیرا ظلم مطلوبِ عاشقان ہے۔

کسی رنگ سے: ظلم سے خواہ لطف سے پس بوجہ تغافل جو تیری خاص صفت ہے نہ ظلم ہوگا نہ لُطف لُطف۔

۳۱۶۔ صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

جمشید موجد شراب اور یہ قصہ طلب بات ہے۔

وائے وہ بادہ کہ الخ: پس ہم کو شراب انگوری چاہیے۔

۳۱۷۔ ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

مشہور نہیں: میں مشہور نہیں۔

۳۱۸۔ نالہ جُز حسنِ [۱] طلب، اے ستم ایجاد، نہیں ہے تقاضائے [۱] جفا، شکوۂ بیداد نہیں

۳۱۹۔ عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

عشرت گہ: مکانِ بے ستوں۔

ہم کو تسلیم نکونامی الخ: کیونکہ فرہاد عشرت گہ پرویز کا کہ رقیب فرہاد ہے مزدور ٹھہرا۔

۴۲۰۔ کم نہیں وہ[۱] بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر[۱] یاد نہیں

وسعت: گھر کی وسعت مقابلہ میں صحرا کے۔

۴۲۱۔ اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

مکتب: مدرسۂ کسبِ دیدہ وری و حصول آگہی۔

۴۲۲۔ وائے محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا — جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

ہم تسلیم و وفاداری کے سبب فریاد نہیں کرتے اور اس وجہ سے محروم ہیں یعنی با آنکہ محبوب جانتا ہے بہ تقاضائے وفا ہم فریاد نہیں کرتے۔ نہ کرنا فریاد کا باعثِ محرومی ہوا۔ کیونکہ وہ دادرسی ہمارے عشق کی نہیں کرتا۔ دوسرا یہ کہ جانتا ہے کہ ہم فریاد نہیں کرتے اس لیے ظلم و بیداد ہم پر زیادہ کرتا ہے۔ حالانکہ فریاد نہ کرنا ہمارا بنا بر وفا ہے جو سبب ہماری محرومی و ناکامی کا ہوا۔ واللہ اعلم۔

۴۲۳۔ سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گل چیں — مژدہ، اے مرغ، کہ گلزار میں صیاد نہیں

رہے قسمتِ بلبل کہ گل چیں اس کو سبدِ خالی کے نیچے بند کرتا ہے۔ کیونکہ گلزار میں اگر صیاد ہوتا تو قفس میں بند کرتا۔

۴۲۴۔ نفی سے کرتی[۹] ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اس کو، دمِ ایجاد نہیں

یعنی قضا و قدر نے محبوب کو دہن دینے کی جگہ لفظ نہیں کا دیا ہے کہ کلمہ نفی کا ہے جس کے دینے سے نہ دینا ثابت ہوا۔

۴۲۵۔ کم نہیں جلوہ گری میں ترے[۱] کوچے سے بہشت[۲]

یہی[۱] نقشہ ہے، و لے اس قدر آباد نہیں[۳]

۴۲۶۔ دونوں جہان دے کے وہ سمجھے کہ یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تکرار کیا کریں اس بضاعتِ اندک کے دینے پر در عوض اپنی ذات کے۔

۴۲۷۔ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ناچار کیا کریں (وہ) جو رہ نہ پائیں۔

۴۲۸۔ کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم — ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

غم: شعلۂ شمع

۳۲۹۔ ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

دعویٰ عشق میں غیر گرچہ کاذب ہے مگر بسبب اُس کی شیریں بیانی کے معشوق اُس کو صادق جانتا ہے اور ہم پہ عشق کا گماں بھی نہیں کرتا بسبب ہماری بے زبانی کے، اگرچہ ہم عاشقِ صادق ہیں۔

۳۳۰۔ قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا تعجب سے وہ بولا، یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

وہ: قیس۔

۳۳۱۔ دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

نہ کر سرگرم اُس کافر کو امتحاں میں میرے عشق کے کہ اُس کا دلِ نازک اس کی تاب نہ لا سکے گا۔

۳۳۲۔ دل[۱] لگا کر لگ گیا اُن[۱] کو بھی تنہا بیٹھنا[۲] بارے اپنی بیکسی[۳] کی، ہم نے پائی داد یاں

بارے اپنی بیکسی الخ: کہ وہ بھی ہماری مانند عاشقِ بے کس بن بیٹھے۔

۳۳۳۔ یہ ہم جو ہجر میں دیوار[۱] و در[۲] کو دیکھتے ہیں کبھی صبا[۱] کو کبھی نامہ بر[۲] کو دیکھتے ہیں

صبا کو راستہ بالائے دیوار اور قاصد کا اندرونِ در تو یہ لف و نشرِ مرتب ہے۔

۳۳۴۔ کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے بلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

کیا برائی ہے شراب پینے میں۔

۳۳۵۔ جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

خیر باد: خدا حافظ۔ یہ کلمۂ رخصت ہے۔ مرحبا کی اصل یہ ہے رَحُبَتْ الدَّارُ لَکَ مَرحَبًا۔ (دوست اپنے گھر آئے تو کہتے ہیں) یعنی "ہمارا گھر کشادہ ہے تمہارے لیے۔"

۳۳۶۔ کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کہ آج بزم میں الخ: غالب کے نہ ہونے سے۔

۳۳۷۔ تم اُن کے وعدے[۱] کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ

یہ کیا کہ تم کہو[۱] اور وہ کہیں کہ یاد[۱] نہیں

۳۳۸۔ تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

توسن: بچھیرا۔

۳۳۹۔ آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی اِک اپنی ہوا باندھتے ہیں

ہوا: خواہش۔

۴۴۰۔ تیری فرصت کے مقابل اے عمر | برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں
پابہ حنا: بے رفتار۔

۴۴۱۔ قیدِ ہستی سے رہائی معلوم | اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں
قیدِ مذکور سے کسی کو رہائی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ آنسو کو حالت بے سروپائی میں باندھتے ہیں۔
باندھتے ہیں: ایہام بمعنی قید میں باندھنے کے اور مضمون میں لانے کے یعنی اشک بے سروپا پر بھی رحم نہیں کرتے۔

۴۴۲۔ غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ | لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
لوگ نالے کو الخ: حالانکہ نارسا ہے۔

۴۴۳۔ اہلِ تدبیر کی واماندگیاں | آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
واماندگیاں: ایک تو آبلہ کی واماندگی دوسری آبلہ پر حنا لگانے کی۔

۴۴۴۔ سادہ پُرکار ہیں خوباں غالب | ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار: بظاہر سادہ بہ باطن پُرکار۔

۴۴۵۔ زمانہ سخت کم آزار ہے بہ جانِ اسد | وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں (۱۰)
توقع: توقع آزار کی۔

۴۴۶۔ کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل | انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
گردش: ایہام۔
مدام: ایہام یعنی ہمیشہ و شراب۔

۴۴۷۔ یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے | لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں
حرفِ مکرر: حرف دوبارہ نوشتہ شدہ۔ یہ کنایہ اپنی یکتائی سے ہے۔

۴۴۸۔ حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے | آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
عقوبت: عذاب۔

۴۴۹۔ کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے | لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
از قسم جمادات ہوتا تو عزیز ہوتا۔ یا استفہامِ استحقاری ہے۔

۴۵۰۔ کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے | کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

آسماں کو منع نہ کریں اور مجھے منع کریں۔

۳۵۱۔سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خاک میں الخ یعنی کیسی کیسی صورتیں ہونگی کہ زیرِ خاک پنہاں ہو گئیں۔

۳۵۲۔یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

یعنی ہم بزم آرائیوں کو بھول گئے حوادثِ زماں یا نسیاں پیری سے۔

۳۵۳۔قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

لی گو نہ یوسف کی خبر: گو کہ خبر نہ لی یا کسی قدر یادِ شب و روز سے خبر لی۔

لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں: یعنی مگر روتے روتے آنکھیں کور ہو گئیں۔

۳۵۴۔سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

رقیب: عاشق ایک معشوق کے۔ زنانِ مصر سے زلیخا خوش ہے کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں اور زلیخا کو عشقِ یوسف میں معذور رکھا۔

۳۵۵۔جوئے خوں آنکھوں[۱] سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق

میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں [۱] دو فروزاں ہو گئیں

۳۵۶۔ان پری زادوں[۱] سے لیں گے خلد[۲] میں ہم انتقام

قدرتِ حق سے یہی[۱] حوریں اگر واں[۲] ہو گئیں

پری زاد: محبوبانِ دنیا۔

ہو گئیں: آ گئیں یا بن گئیں۔

۳۵۷۔میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

کھل گیا: چمن میں کھل گیا۔

۳۵۸۔وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

وہ نگاہیں باوجود کوتاہ ہونے کے مژگاں کی مانند دل کے پار ہوئی جاتی ہیں۔

۳۵۹۔بسکہ روکا میں نے اور سینے پہ اُبھریں پے بہ پے میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اُبھریں: بلند ہوئیں۔

۳۶۰۔دیوانگی سے دوش پہ زُنار بھی نہیں یعنی، ہماری جیب میں اِک تار بھی نہیں

تارِ جیب کو زُنّارِ دوش قرار دیا ہے بسبب صنم پرستی کے۔

۳۶۱۔ دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

نیازِ حسرتِ دیدار: نذرِ حسرتِ دیدار نہ (کہ) دیدار۔

۳۶۲۔ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی ملنا تیرا اگر مشکل ہوتا تو یہ امر بہ مجبوری مجھ پر آساں ہوتا با آنکہ تیرا ملنا آساں ہے مگر تو نہیں ملتا یہ امر دشوار ہے۔ دیگر ہر ایک سے تیرا ملنا اگر مشکل ہوتا یہ امر مجھ پر بھی آساں ہوتا مگر مشکل یہ ہے کہ اغیار سے ملنا آساں اور یہ امر مجھ پر دشوار ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۶۳۔ بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں[11] — طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

لذتِ آزار: مزۂ رنجِ عاشقی۔

۳۶۴۔ شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا[12] کوئی دیوار بھی نہیں

شوریدگی: آشفتہ سری۔

کوئی دیوار بھی نہیں: جس سے سرِ شوریدہ کو پھوڑیے۔

۳۶۵۔ ذرّ نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان — آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

آخر نوائے مرغ الخ: کیا میرا نالۂ زار نوائے مرغِ گرفتار کے برابر بھی نہیں ہے۔

۳۶۶۔ دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی — حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

روکشی: مقابلہ۔

۳۶۷۔ ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ [۱] ویرانی — کفِ سیلاب [۱] باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

کفِ سیلاب جس سے خانہ ویرانی ہوئی۔

۳۶۸۔ ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں [۲] ہوں
نگینِ [۱] نامِ شاہد [۲] ہے، مرے[13] ہر قطرۂ [۱] خوں تن میں

میں سراپا امانت خانہ ہوں کاوشِ مژگانِ شاہد کا۔ میرے تن میں ہر قطرۂ خوں کا نام معشوق کا نگینہ ہے کہ اس کے مژگانِ سر تیز کی کاوش سے نگینے پر میرے ہر قطرۂ خوں کے، نام محبوب کا کندہ ہے۔

۳۶۹۔ نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی — ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ، جیب و دامن میں

نکوہش: احباب کی ملامت جس کا خندۂ اہانت لازم ہے۔

خندہ: خندۂ دنداں نما جو بخیہ سے شبیہ ہے۔

۲۷۰۔ ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے پرافشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں

تمثال: صورت۔

۲۷۱۔ نہ جانوں نیک [۱] ہوں یا بد [۲] ہوں، پر صحبت مخالف [۳] ہے

جو گل [۱] ہوں تو ہوں گلخن [۳] میں، جو خس [۲] ہوں تو ہوں گلشن [۳] میں

گل: جس کی جگہ گلشن ہے۔

خس: جس کی جگہ گلخن ہے۔

۲۷۲۔ ہزاروں [۱] دل [۲] دیے جوشِ جنونِ [۳] عشق نے مجھ کو

سیہ [۳] ہو کر سویدا [۲] ہو گیا ہر قطرۂ [۱] خوں تن میں

۲۷۳۔ اسدؔ زندانیٔ [۱] تاثیرِ اُلفت [۲] ہائے خوباں ہوں

خمِ دستِ [۲] نوازش ہو گیا ہے طوق [۱] گردن میں

۲۷۴۔ مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

دنیا کے مزے کچھ نہیں ہیں مگر خونِ جگر کا پینا عاشقی میں با مزہ تھا سو وہ خوں بھی اب جگر میں نہ رہا۔

۲۷۵۔ مگر، غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

غبار ہوئے پر: بال و پر غبار ہوئے پر۔

۲۷۶۔ یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے کہ غیرِ جلوۂ گل، رہگزر میں خاک نہیں

خاک: گرد۔

۲۷۷۔ بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

اُسے نہ سہی: محبوب کو مجھ پر رحم نہ سہی۔

رحم آتا: میرے حال پر رحم آتا۔

۲۷۸۔ خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

گل: ایہام۔ مقصود شراب ہے۔

خراب: مست۔

۲۷۹۔ دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رُلائے کیوں
کوئی: یار دل آزار یا ناصح ملامت شعار۔

۲۸۰۔ جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
صورتِ مہرِ نیم روز: دوپہر کے آفتاب کی مانند۔
آپ ہی ہو الخ: نگاہِ بینندگان کو جلا دے اور یہ دیکھ نہ سکیں۔ پھر روپوشی کس لیے۔

۲۸۱۔ دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں
ناوکِ ناز بے پناہ: ناوکِ ناز تیرِ بے زنہار ہے۔
تیرا ہی عکسِ رُخ الخ: یعنی تو ہی سہی آئینہ میں اپنا مقابل کیوں ہو (کہ) جس دشنہ و ناوک سے اپنے تو خود دل فگار ہو جائے۔

۲۸۲۔ حسن اور اُس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
حسنِ ظن: محبوب کا حسنِ ظن بوالہوس کی نسبت۔
اپنے پہ: اپنی عفتِ حُسن پر یا حُسنِ ظن پر۔

۲۸۳۔ واں [۱] وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں [۲] یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ [۲] میں ہم ملیں کہاں، بزم [۱] میں وہ بلائے کیوں
حجابِ پاسِ وضع: شرمِ وضع داری۔

۲۸۴۔ ہاں وہ نہیں خدا [۱] پرست، جاؤ وہ بے وفا [۲] سہی
جس کو ہو دین [۱] و دل [۲] عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں
وہ: محبوب۔
جاؤ: خطاب بناصح۔
جسکو: جس شخص کو۔

۲۸۵۔ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں
طنز آمیز گفتگو ہے دوست کے ساتھ۔

۲۸۶۔ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا، کہ یوں

غنچۂ ناشگفتہ کو چمن میں دور سے مت دکھا کہ ایسی صورت بوسی چینی ہے بلکہ اپنے دہن ولب سے بتا کہ بوسہ یوں لیتے ہیں۔

۳۸۷۔ پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے اُس کے ہراک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

یہ ادا کہ یوں: یہ بیان کہ یوں ہوا کرتی ہے طرزِ دلبری۔

۳۸۸۔ رات کے وقت مے [۱] پیے، ساتھ رقیب [۲] کو لیے

آئے وہ یاں خدا کرے، [۱] پر نہ کرے خدا کہ یوں [۲]

تمہارے پیے آئے۔ ساتھ رقیب کو لیے نہ آئے۔ یہ لف ونشر مرتب ہے۔

۳۸۹۔ غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھیے سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

سامنے آن بیٹھنا الخ: سامنے ناز سے آن بیٹھنا اور منہ بنا کے کہنا کہ ایسی بنی۔

۳۹۰۔ بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

بزم: جو محفلِ یار و اغیار ہے۔

خامشی میں: چپ بیٹھنے میں جو شیوہ محبوب کا ہے۔

یوں: خاموش بیٹھیے۔

۳۹۱۔ میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یوں: ایسی تہی چاہیے۔

۳۹۲۔ مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

باہر سر چلنے لگی اور بتانے لگی کہ ہوش عاشقوں کے معشوقوں کے روبرو یوں اُڑے جاتے ہیں

۳۹۳۔ کب مجھے کوئے یار میں رہنے [۲] کی وضع یاد [۱] تھی

آئینہ دار [۱] بن گئی حیرت [۲] نقشِ پا کہ یوں

آئینہ دار: نمائندہ۔

حیرت نقشِ پا: رہنے کی وضع ہے۔

۳۹۴۔ گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی خیال اس کا کہ وصل مزیلِ شوق ہے تو دیکھ موج کو کہ دست و پا مارے ہے کہ یوں محیط سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حواشی

(ردیف ن)

۱۔ فارسی میں گھاس کے لیے "گیاہ" اور "گیا" دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ بعض لغت نویسوں کی رائے کے مصداق "گیا" صرف خشک گھاس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ بقول حامد علی خاں "مہر گیاہ" یا "مہر گیا" جس کو "مردم گیاہ" بھی کہتے ہیں، اس کے بارے میں لغت نویس کسی بھی ایک خیال پہ متفق نہیں۔ اس کے دیگر مفاہیم میں محبوب، رُخِ نگار، سبزۂ خط، گلِ آفتاب پرست یعنی سورج مکھی اور لکھمنی نیز مردم گیاہ کی دوشاخ جڑ شامل ہے۔ قدیم اعتقاد کے مطابق عوام کا خیال تھا کہ جو شخص اس گھاس کی جڑ اپنے پاس رکھتا ہے، محبوب اُس پر مہربان اور ہر شخص اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "اِک" لکھا گیا ہے۔ جبکہ نسخۂ انجمن میں "اِک" کی جگہ "ایک" ہے۔ واضح رہے کہ یہاں نسخۂ نظامی میں "اِک" ہی ہے۔

۳۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کہتے ہیں" درج ہے جس کی تائید کسی بھی نسخے سے نہیں ملتی۔ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ رضا اور دیگر کئی نسخوں میں یہاں "کہتے ہو" درج ہے۔ یقیناً یہ سہوِ کتابت ہے۔ تصحیح کر دی گئی ہے۔

۴۔ بعض نسخوں میں "کر" کی جگہ "کہ" ہے جیسا کہ نسخۂ نظامی، جبکہ نسخۂ انجمن میں "کر" ہی ہے۔

۵۔ نسخۂ انجمن میں "اِک" کی جگہ "ایک" ہے جبکہ نسخۂ نظامی میں یہاں "اِک" ہی ہے۔

۶۔ وثوقِ صراحت میں یہ مصرع کچھ اس انداز سے لکھا گیا تھا ''تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے'' جو کہ سہوِ کتابت ہے۔ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ رضا نیز دوسرے سبھی نسخوں میں یہ مصرع کچھ اس طرح سے ہے ''ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے''۔ لہٰذا درستی کردی گئی ہے۔

۷۔ ترجمہ: ہر شخص دوسرے کو اپنی مانند ہی خیال کرتا ہے۔

۸۔ وثوقِ صراحت میں ''کہ طاقت نہ رہی'' درج تھا جبکہ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ رضا اور کئی دوسرے نسخوں میں یہاں ''کہ وہ طاقت نہ رہی'' درج ہے۔ سو یہاں بھی تصحیح کردی گئی ہے۔

۹۔ ''اثبات'' مذکر لفظ ہے۔ غالب نے خود دوسری جگہ اس لفظ کو بہ صیغۂ مذکر استعمال کیا ہے۔ تاہم غالب کا یہ شعر اس لفظ کی تانیثیت کا جواز بھی فراہم کرتا ہے۔ مگر آج کل یہ لفظ مذکر ہی مستعمل ہے۔

۱۰۔ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ عرشی نیز کئی نسخوں میں یہ مصرع اس طرح سے درج ہے، ''وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں''۔ یہاں اصلاح کردی گئی ہے۔

۱۱۔ بعض نسخوں میں ''اور یہاں'' چھپا ہے مثلاً نسخۂ نظامی میں۔ جبکہ بعض میں ''اور یاں'' درج ہے مثلاً نسخۂ انجمن میں۔

۱۲۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''بخدا'' لکھا گیا تھا جبکہ سبھی نسخوں میں یہاں ''اے خدا'' درج ہے۔ تصحیح کردی گئی ہے۔

۱۳۔ تقریباً سبھی قدیم نسخوں میں یہاں ''مرے'' ہی چھپا ہے، جبکہ صرف نسخۂ حمیدیہ میں یہاں ''مرا'' درج ہے۔

maablib.org

ردیف واؤ

۴۹۵۔ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو　　　　کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

خطاب بزاہد جو خوب رویوں کو دیکھ نہ سکے۔

۴۹۶۔ بقدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی　　　　بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

آبِ ہفت دریا: تر دامنیٔ معاصی کے لیے۔

۴۹۷۔ اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آجاوے　　　　کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو

کفِ ہر خاکِ گلشن: ہر کفِ خاکِ گلشن۔

۴۹۸۔ طاعت میں تا، رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ[1]　　　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

لاگ: خلاف۔

دوزخ میں بہشت کو ڈال دو تا کہ مے اور انگبیں کی لاگ نہ رہے کیونکہ مے آتش دیدہ ہے اور جوئے عسلِ جنت آتش دیدہ نہیں ہے۔ جب یہ بھی آتش دیدہ ہو جائے تو دونوں مساوی ہو جائیں گے۔

۴۹۹۔ ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے　　　　ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلمِ سرنوشت کو

منحرف: برگشتہ۔

۵۰۰۔ غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے　　　　خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

لہنا: یافت و نصیب۔

خرمن جلے الخ: یعنی ملخ سے اپنا کشت بچے تو برق سے نہ بچے۔

۵۰۱۔ وارستہ اُس سے ہیں کہ محبّت ہی کیوں نہ ہو — کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

وارستہ: آزاد۔

۵۰۲۔ چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا — ہے دل پہ بار، نقشِ محبّت ہی کیوں نہ ہو

دل یہاں تک ضعیف ہو گیا ہے کہ نقشِ محبّت کو بھی اُٹھا نہیں سکتا۔

۵۰۳۔ ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ — ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو تذکرۂ غیر۔

۵۰۴۔ پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا — یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے الخ: حدیث لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ۔

یوں ہو تو الخ: ہر درد کی دوا ہو اور علاج غمِ اُلفت ہی کا نہ ہو یعنی چہ گویا غمِ مذکور درد نہیں۔

۵۰۵۔ ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ — اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

معاملہ یعنی کام اپنا نہ بن آنے کی شرمندگی آپ سے کھینچتا ہوں نہ (کہ) دوسرے سے۔

۵۰۶۔ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

خلوت انجمن ہے کیونکہ آدمی خود محشرِ خیال ہے۔

۵۰۷۔ ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

زبونی: عجز۔

انفعال: خجالت۔

عبرت بھی زمانے سے نہ لیجے کہ لینا عجزِ ہمت اور اُس کا حاصل نجات ہے۔

۵۰۸۔ وارستگی[۱] بہانۂ بیگانگی[۲] نہیں — اپنے[۲] سے کر، نہ غیر سے، وحشت[۱] ہی کیوں نہ ہو

۵۰۹۔ مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی — عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

گو عمر بھر عبادت میں رہے تو بھی اَلَا لَیُعْرِفُوْنَ کے مقام کو نہ پہنچے۔

۵۱۰۔ قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو — مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

مرا ہونا برا کیا ہے: کیونکہ میں اُن کا ہمصفیر اور شریک تمتع نہیں ہوں۔

۵۱۱۔ نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے — نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست، دشمن کو

اگر ہمدمی دوست کی آساں نہیں، خیر، مگر رشک اس ہمدمی کا جو رقیب کو حاصل ہے، کیا کم ہے۔
پس اے خدا آرزوئے یار اغیار کو ہونے نہ دے۔

۵۱۲۔ نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر کیا سینے میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو

تیرے: خطاب بہ معشوق۔

جراحت: زخم۔

سینے: ایہام۔

۵۱۳۔ خدا شرمائے ہاتھوں کو رکھتے ہیں کشاکش میں کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہاتھوں کو: ان اپنے یا اس کے ہاتھوں کو۔

۵۱۴۔ ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

قتل گہ: مقتلِ عشاق۔

آساں سمجھتے ہیں: کیونکہ اپنا خوں بہنے کی نوبت نہ آئی اور بسبب اس کے، تیرے توسن کو جوئے خوں میں شناور نہیں دیکھا ہے۔

۵۱۵۔ ہوا چرچا جو میرے پانوں کی زنجیر بننے کا کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

کان میں: معدن آہن میں جنبشِ شوق جو جوہر کو ہونے لگی۔

۵۱۶۔ خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

ابھی سے: کھیت تیار ہونے سے پہلے۔

۵۱۷۔ وفاداری بشرطِ استواری، اصلِ ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

برہمن کا بت کدہ میں مرنا وفاداری ہے اور وفا اصل ایماں ہے، پس اس صفت کے صلے میں برہمن کو کعبے میں گاڑو، اگرچہ بت خانہ میں مر جائے۔

۵۱۸۔ شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خو مجھ کو جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

خو: خصلت۔

۵۱۹۔ نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

چوری کا: رات کی رہزنی کا۔

۵۲۰۔ سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

سخن: شعر۔

جگر کیا ہم اِلخ: بلکہ اپنی جگر کنی سے جواہرِ سخن پیدا کر لیتے ہیں۔

۵۲۱۔ مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ — فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

شاہِ سلیماں جاہ: شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ ہوں گے۔

۵۲۲۔ دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے، باہر لگن کے پانو(؟)

لگن: تشت۔

۵۲۳۔ دی سادگی سے جان، پڑوں کوہ کن کے پانو — ہیہات، کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

ہیہات: ایہامِ تناسب۔

۵۲۴۔ اللہ رے ذوقِ دشت نوردی، کہ بعدِ مرگ — ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

گویا عدم کی صحرا نوردی میں ہیں۔

۵۲۵۔ ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اُڑتے ہوئے، اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

اُلجھتے ہیں: جوشِ گل سے اُلجھتے ہیں۔

۵۲۶۔ غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو — پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

خسروِ شیریں سخن: یعنی شاہ ظفر۔

۵۲۷۔ اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ — آئینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

جب تک چشمِ قربانی سے آئینہ نہ ہو اپنی صورت کو دیکھتا نہیں۔ لطف یہ کہ چشمِ مذبوح میں ذابح کی صورت آئینہ کی مانند نقش پذیر ہوتی ہے۔

۵۲۸۔ واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو — صدرہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

پئے ہم: پس یک دیگر یعنی پیاپے۔

صدرہ: سو مرتبہ۔

آہنگ: قصد۔

۵۲۹۔ دل کو میں اور مجھ کو دل محوِ وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہم کو

گرفتاریٔ ہم: گرفتاریٔ یک دیگر۔

دل کو میں: یعنی میں دل کو محوِ وفا رکھتا ہوں۔

۵۳۰۔ ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن — تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

پئے: پائے۔

۵۳۱۔ جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

جان کر: عمداً۔

امید: توقعِ دلبری

غلط انداز: سہواً، بے جانے۔

۵۳۲۔ رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں — نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دودم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی: ایک دم۔

دردِ اثرِ بانگِ حزیں: دوسرا دم۔

۵۳۳۔ سر اڑانے کے وعدے کو جو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم کو

ہنس کے بولے الخ: سر اڑا دیں گے یا نہ اڑائیں گے کیونکہ پھر قسم کس کے سر کی کھائیں گے۔

۵۳۴۔ دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، ولیکن ناچار — پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

یعنی لہو رونے کی کوئی وجہ نہیں مگر یہ کہ ناگزیر (ہے کیونکہ) اگر لہو نہ روئیں (تو) دیدہ بے رونق رہتا ہے۔

۵۳۵۔ تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

ہماری خموشی بھی تمھاری بارِ خاطر ہے پس ہم بے صبر تمھارے تغافل سے کیا فریاد کر سکیں۔

۵۳۶۔ مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

مقطع: جائے انقطاع۔

یہ شہر: لکھنؤ۔

۵۳۷۔ لئے جاتی [۱] ہے کہیں ایک توقع [۲] غالب — جادۂ [۱] رہ کششِ کافِ [۲] کرم ہے ہم کو

جادہ کو کشش کافِ کرم سے تشبیہ تام ہے۔

۵۳۸۔ تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

رسم و راہ: رسم و راہِ باطنی۔

پوچھتے رہو: بہ پرسشِ ظاہری پوچھتے رہو۔

۵۳۹۔ بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے | قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

بچتے نہیں: ہم۔

تم گواہ ہو: تم ایسی گواہی دو گے کہ قاتل بچ جائے گا اور مقتول گرفتار ہو جائے گا۔

۵۴۰۔ کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس[۲] ہیں | مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو

وہ: خورشید و ماہ۔

۵۴۱۔ اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار | مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اُبھرا ہوا رُخ: اور تاروں میں نقاب کے۔

کسی کی: عاشق کی۔

۵۴۲۔ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید | مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

جگہ کی قید شراب نوشی کے لیے۔

۵۴۳۔ غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں | دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

مرا بادشاہ: ظفرؔ

۵۴۴۔ گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو | کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیونکر ہو

کہے سے: گفتگو سے۔

کہو تو: استفسار از ہم نفس۔

۵۴۵۔ ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال | کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو

گر نہ ہو: وصال اگر نہ ہو۔

ہو تو کیونکر ہو: اگر وصال حاصل ہو تو کس طرح ہو۔

۵۴۶۔ ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے | حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

ادب ہے ہم کو اور حیا ہے محبوب کو۔

کشمکش: کشاکشِ شوق۔

۵۴۷۔ تم ہی کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا | بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو، تو کیونکر ہو

گزارا: گذران۔

۵۴۸۔ اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ | جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اُلجھتے ہو: رشک سے اس کے کہ اپنا شغل کدھر سے پیدا ہوا۔

۵۴۹۔ جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا　　　وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

وہ شخص دن الخ: کیونکہ اُس کے روزِ سیاہ کے مقابلے میں رات اندھیری روزِ روشن ہے۔

۵۵۰۔ ہمیں پھر اُن سے اُمید اور اُنھیں ہماری قدر　　　ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہمیں پھر الخ: ہمیں اُمید اور اُنھیں قدر کیا ہو گی۔

ہماری بات ہی پوچھیں نہ: ہمارا ذکر ہی نہ کریں۔

وہ: ضمیرِ واحد غائب۔

۵۵۱۔ غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا　　　نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

تسلّی: تسلّی دل کے لیے۔

نہ مانے: خط کو نہ مانے۔

دیدار جو: دیدار طلب۔ (۴)

۵۵۲۔ بتاؤ، اُس مژہ کو دیکھ کر، ہو مجھ کو قرار (۵)　　　یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

یہ نیش ہو رگِ جاں الخ: اس مصرع میں تعقید لفظی ہے۔ یعنی نیشِ فرو شدہ برگِ جاں پر قرار کیونکر ہو۔

۵۵۳۔ مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور　　　"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

بقولِ حضور: بقول شاہ ظفرؔ (دوسرا مصرع بہادر شاہ ظفر کا ہے)۔ (۶)

۵۵۴۔ کسی کو دے کے دل [۱] کوئی نوا سنجِ فغاں [۲] کیوں ہو

نہ ہو جب دل [۱] ہی سینے میں تو پھر منہ [۲] میں زباں کیوں ہو

۵۵۵۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے: وہ اپنی خو جو سرگرانی ہے نہ چھوڑیں گے۔

ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں: ہم اپنی وضع جو خودداری ہے کیوں چھوڑیں۔

سبک سر: احمق۔ سرگراں۔ متکبّر۔

۵۵۶۔ کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اِس محبّت کو　　　نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

غمخوار نے: میرے ہمدرد نے۔

جو: غمخوار۔

۵۵۷۔ وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　　　تو پھر، اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق: واسوخت کے طور پر دل جلی بات ہے۔

۵۵۸۔ یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ

کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

ہم دل میں نہیں ہیں: ہم دل میں تمہارے نہیں ہیں۔

دل میں تمہیں تم ہو: دل میں ہمارے تمہیں تم ہو۔

۵۵۹۔ غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے؟　　　　نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

جذبِ دل کا شکوہ: ہماری کششِ دل کا شکوہ۔

جرم کس کا ہے: جرم تمہارا ہے۔

نہ کھینچو گر تم اپنے کو: اگر تم کنارہ کشی نہ کرو۔

۵۶۰۔ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　　　ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہ فتنہ: دوستی تمہاری۔

۵۶۱۔ یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں　　　　عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

امتحاں: امتحانِ محبت۔

۵۶۲۔ کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی　　　　بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

ہاں کیوں ہو: رسوائی کیوں ہو۔

۵۶۳۔ بے در [۱] و دیوار سا [۲] اک گھر بنایا چاہیے　　　　کوئی ہمسایہ نہ ہو [۲] اور پاسباں [۱] کوئی نہ ہو (ط)

حواشی

(ردیف و)

۱۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "لاگ" درج ہے۔ جس کی تائید سوائے نسخۂ انجمن کے سبھی نسخوں سے ہوتی ہے۔ وہاں سہوِ کتابت کا احتمال ہونے کے باعث یہاں وثوقِ صراحت میں اسے "لاگ" ہی رہنے دیا گیا ہے۔

۲۔ "پانو" کا یہ املا اب قریب قریب متروک ہے۔ دراصل مرزا صاحب صحتِ املا کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اُن کے نزدیک "پانو، گانو، چھانو" صحیح املا ہے۔ جبکہ "پاؤں" لکھنے کو وہ غلط مانتے تھے۔ ایک شاگرد کو لکھا کہ "پانو قافیہ گانو، چھانو کا ہے، اس کے آگے نونِ غنہ لکھنا غلط ہے، ہاں بہ صیغۂ جمع "پانوؤں" درست ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، "رشید حسن خاں"؛ "املائے غالب" ادارہ یادگارِ غالب کراچی ۲۰۰۰ء (ص۔ ۱۱)

۳۔ نسخۂ انجمن میں یہاں "ناشناس" ہی ہے۔ جبکہ نسخۂ نظامی طبعِ اول میں "حق ناسپاس" چھپا ہے۔ ایک آدھ اور قدیم نسخے میں بھی یوں ہی ملا ہے۔ مگر بعض دوسرے قدیم نسخوں میں "ناشناس" بھی چھپا ہے۔ جدید نسخوں میں مالک رام نے "ناسپاس" جبکہ طباطبائی، حسرت موہانی، عرشی اور مہر نے "ناشناس" ہی درج کیا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ شعر میں 'دیدار جو' ترکیب نہیں بلکہ 'دیدۂ دیدار' ترکیب ہے۔ شعر میں 'جو' حرف ہے۔ یہاں عبدالعلی والہ نے 'جو' کے معنی میں شرح کی ہے جو کہ درست معلوم نہیں ہوتی۔

۵۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کہ" درج ہے۔ جبکہ نسخۂ انجمن میں یہاں "ہو" درج ہے۔ تصحیح کر دی گئی ہے۔

۶۔ یہ مصرع بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ "فراقِ یار میں تسکیں ہو تو کیونکر ہو"۔

۷۔ وثوقِ صراحت میں اس شعر کی شرح درج نہیں۔ البتہ عبدالعلی والہ نے اعداد کے استعمال سے کافی حد تک شعر کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ یعنی در کا تعلق پاسباں سے جبکہ دیوار کا تعلق ہمسائے سے بتایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ شرح میں اور بھی بے شمار جگہوں پر یہ عددی صراحت موجود ہے جو شعر کی شرح میں معاون ہے۔

ردیف ہائے ہوز

۵۶۴۔ از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ: باعتبار سوزش و تپش آفتاب سے ذرہ تک مانند دل اور دل بصورت آئینہ ہے۔

طوطی کو: ہر پرستار آئینۂ دل کو۔

۵۶۵۔ ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ　　جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ہے سبزہ زار: ہے سبزہ زار کثرت گریہ سے۔

خزاں: کنایہ شکست و ریخت سے غمکدہ کے۔

۵۶۶۔ ناچار بے کسی کی بھی حسرت اُٹھائیے　　دشواریٔ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

رہ: راہِ بے کسی۔

ہمرہاں: یکسان ہمراہ۔

maablib.org

ردیف یائے تحتیہ

۵۶۷۔ صد جلوہ روبرو ہے، جو مژگاں اُٹھائیے | طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

جلوۂ صد رنگ: دید کا احسان اس قدر ہے کہ اُٹھا نہ سکے۔

۵۶۸۔ ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق | یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے

برات: چک روزی۔

۵۶۹۔ دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم | اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

دیوار: دیوار جو حالتِ افتادگی میں ہو۔

اے: خطابِ عام۔

۵۷۰۔ یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے | یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

رسوا نہ کیجیے: خندۂ بے پردہ و آشکار سے رسوا نہ کیجیے۔

یا پردۂ تبسم الخ: یا غیر کے ساتھ تبسمِ پنہاں کو ترک کیجیے تا کہ میرے زخمِ رشک کا خندہ آشکار نہ ہو۔

۵۷۱۔ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے | بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات، چاہیے

بھوں کنایہ طاقِ مسجد سے اور آنکھ میخانہ سے ہے۔

۵۷۲۔ عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اِک اور شخص پر | آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

ستم کی: ستمِ معشوق کی۔

۵۷۳۔ دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی | ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیے

دلِ حسرت پرست کی: عاشق کے دل کی۔

تلافیِ مافات چاہیے: معشوق سے تلافیِ مافات چاہیے۔ (عاشق ہوئے ہیں) سے (تلافیِ مافات چاہیے) تک قطعہ بند ہے۔

۵۷۴۔ سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

تقریب: یہی نقاشی کی تقریب۔

۵۷۵۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بیخودی: واسطے فراموشیٔ مکارۂ دنیا کے۔

ساقی بدہ آں بادہ کہ از ہوشِ خود اُفتم

من بار خودم یک نفس از دوشِ خود افتم

۵۷۶۔ ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اِثبات چاہیے

بہار کا اثبات چاہیے: بہارِ قدرتِ صانع کا شہود چاہیے۔

۵۷۷۔ سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی — رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

۵۷۸۔ یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مستِ مےِ ذات چاہیے

(سرپائے خم الخ) سے (عارف ہمیشہ الخ) تک قطعہ بند ہے۔

بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات: بہ کیفیاتِ جداگانۂ لطف و قہر۔

۵۷۹۔ نشو و نما ہے اصل [۱] سے غالب فروع کو [۲] — خاموشی [۱] ہی سے نکلے ہے جو بات [۲] چاہیے

نشو و نما: بالیدگی۔

خاموشی ہی سے الخ: کیونکہ فکر کو خاموشی سے تعلق ہے۔

۵۸۰۔ بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرۂ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

بساطِ عجز میں: بساطِ انسانی میں۔

سرنگوں: دل سینہ میں منقلب ہے۔ اسی لیے اس کو قلب کہتے ہیں۔

۵۸۱۔ رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

تکلف سے: بناوٹ سے۔

تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی: آزردہ رہنا بھی ایک اندازِ جنوں تھا۔

وہ: آزردہ رہنا۔

۵۸۲۔ نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

اے ہمدم مجھ کو معلوم نہ تھا کہ اثرِ نالہ سے دردِ دل بڑھ جائے گا۔ اگر معلوم ہوتا (تو) نالہ نہ کرتا۔

۵۸۳۔ نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ مرے دریائے بیتابی میں ہے اِک موجِ خوں وہ بھی

وہ: تیغِ جفا۔ گویا موجِ دریائے بیتابی بُرّش میں تیغِ جفا سے سوا ہے۔ جس کے مقابل تیغِ جفا موجِ خوں آسا ہے۔

۵۸۴۔ مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اِک دو چار[؟] جامِ واژگوں وہ بھی

جامِ واژگوں: جامِ تہی جس میں مے عشرت کہاں۔

دو چار: کنایہ سبعہ سیارہ سے ہے۔

۵۸۵۔ مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ[۱] وصل و شکوہ[۲] ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ[۱] بھی کہوں، وہ[۲] بھی

۵۸۶۔ ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے بزمِ بتاں الخ: خوشامد گوئی سے جن کے لب خستہ ہو گئے اُن خوشامد گویوں کا ذکر ہے یا یہ کہ نفسِ سخن بفرطِ خوشامد گوئی لبوں سے خوشامد گویوں کے آزردہ ہے۔

۵۸۷۔ ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا یک بار لگا دو خُم نے میرے لبوں سے

وجہِ پریشانیِ صہبا: سببِ تفرقۂ شراب۔

۵۸۸۔ رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

طرف: مقابل۔

۵۸۹۔ بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

عہدِ وفا نے جو معشوق کے ساتھ تھا جانِ بر لب رسیدہ کے ربط کو لبوں کے ساتھ رہنے نہ دیا اور پاسِ عہد میں جان جاتی رہی۔

۵۹۰۔ تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

سُن لیتے ہیں: ہمارا ذکر دوسروں سے سُن لیتے ہیں۔

۵۹۱۔ گھر میں تھا کیا، کہ تیرا غم اُسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم حسرتِ تعمیر، سو ہے

تھا کیا: اسباب واثاث البیت نہیں تھا۔

حسرت: حسرت کو کوئی کیا غارت کرے۔

۵۹۲۔ غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی　　فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

سر اُٹھانے کے فلک ستم گر کی طرف حسرت سے دیکھنا تیرے یاد آنے کی تقریب ہے۔

۵۹۳۔ کُھلے گا کِس طرح مضموں مرے مکتوب کا یا رب　　قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

کھلے گا: ایہام۔

۵۹۴۔ لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے　　ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چُھپانے کی

پیچیدگی یعنی پوشیدگی شعلہ کی پرنیاں میں جو مشکل ہے وہ بھی آساں تر ہے بہ نسبت اس کے کہ سوزِ غم یعنی عشق کو حکمت سے دل میں چھپایئے۔

۵۹۵۔ اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا[۲] دیکھ آنا تھا　　اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا، شوخی بہانے کی

اپنے زخمیوں کا: اپنے خستگانِ عشق کا کہ از آں جملہ گل بھی ہیں۔

۵۹۶۔ لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی　　مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

تحمل کر نہیں سکتی: اب تحمل کر نہیں سکتی۔

ضامن تھی: پہلے ضامن تھی۔

۵۹۷۔ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی　　دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

حاصل سے: حصولِ اسامی مذکور سے۔

اسامی: اصطلاحِ اہلِ دفتر۔

۵۹۸۔ اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بُجھا دے　　میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

اُس شمع الخ: اُس جلتی شمع کی مانند جس کو خاموش کر دیں۔

داغِ ناتمامی: اپنی نقصِ سوختگی کا داغ بدل ہوں۔

۵۹۹۔ کیا تنگ [۱] ہم ستم زدگاں کا جہان ہے　　جس میں کہ ایک بیضۂ [۱] مُور آسمان ہے

۶۰۰۔ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　پرتو سے آفتاب کے، ذرّے میں جان ہے

ذوق: شوق۔

۶۰۱۔ حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ　　غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

سیلی: طمانچہ۔

خارا: سنگِ سخت جس سے شیشہ بنتا ہے۔

۶۰۲۔ کی اُس نے گرم سینۂ[۱] اہلِ ہوس میں جا　　　آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا[۱] مکان ہے

اُس نے: معشوق نے۔

اہلِ ہوس: مردمِ بوالہوس جن کا سینہ گرمیِ عشقِ صادق سے خالی ہے۔

۶۰۳۔ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا　　　بس چُپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

نہیں دیا: طنز آمیز گفتگو ہے۔

زباں ہے: اس بات کے اثبات کے لیے یا بوسہ طلب کرنے کے لیے زباں ہے۔

۶۰۴۔ بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں　　　فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

ہر ایک بیٹھنے والا بادشاہ ہے یا خود بادشاہِ ہند بیٹھا ہوا ہے۔ ہندوستاں کو یہاں کے لوگوں کی سیاہی و سبزیِ رنگ کے بلحاظ سایہ سے تشبیہ تام ہے قائل۔

۶۰۵۔ ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا　　　کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

ہستی کا اعتبار الخ: عشق نے خوار و بے اعتبار کر دیا۔

جگر کا نشان ہے: یادگار یا فرزند جگر کا ہے۔

۶۰۶۔ ہے بارے اعتماد وفاداری اس قدر　　　غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

دوست کی نامہربانی پر خوش ہیں با اعتماد اپنی وفاداری کے کہ ترکِ محبت نہ کریں گے۔

۶۰۷۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے　　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

میرے حال سے جو میں اس درد کو پہنچا غفلت شعاری تیری کدھر گئی جو تو بے قراری کر رہا ہے اور اس بے قراری پر افسوس ہے۔

۶۰۸۔ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ　　　تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

حوصلہ: ظرف و تحمل۔

۶۰۹۔ کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال　　　دشمنی اپنی تھی، میری دوستداری ہائے ہائے

دشمنی اپنی تھی الخ: مجھ سے جو دوستداری کی گویا اپنے ساتھ دشمنی کی۔

۶۱۰۔ عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا　　　عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

عمر کو بھی الخ: پھر پیمانِ وفا کی کیا پائداری۔

٦١١۔ زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

اسے: آب و ہوائے زندگی کو تجھ سے مخالفت تھی۔

٦١٢۔ گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

گل فشانی تیرے نازِ جلوہ کی کدھر گئی کہ وہ بالائے زمیں ہوتی تھی سو اب زیرِ زمیں ہو گئی۔

٦١٣۔ شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

رسوائی: بدنامی۔

خاک: قبر۔

٦١٤۔ خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی — اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

خاک میں الخ: تیرے مرنے سے خاک میں۔

اُٹھ گئی الخ: تیرے مرجانے سے اُٹھ گئی۔

٦١٥۔ ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا — دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

تیغ زن کا ہاتھ ہی بسبب نازکی کے چند وار کرنے میں شل ہو گیا۔

یہ کنایہ اس کی موت سے ہے۔

٦١٦۔ کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال — ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے الخ: کیونکہ اختر پردۂ ابر میں چھپے رہتے ہیں۔

ہے نظر: ہے اپنی نظر۔

٦١٧۔ گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال — ایک دل، تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

نا اُمیدواری: گوش و چشم کی نا امیدواری۔

٦١٨۔ عشق نے پکڑا نہ تھا، غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ — رہ گیا تھا دل میں کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

دل میں جو کچھ خواری عشق کا شوق تھا نکلنے نہ پایا یا یوں ہی رہ گیا اور عشق کی رسوائی ہنوز نہ ہوئی تھی۔

٦١٩۔ سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے — تسکین[٣] کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

ہستی: زندگی۔

نوید: خوشخبری۔

۶۲۰۔ لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر　　　اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

میرے ہی پاس ہے: حالانکہ دلِ آوارہ میرا اُس کے پاس ہے۔ میرے پاس نہیں۔ یا میرا دل اُسی کے پاس ہے۔ جان کر خبر گیری نہیں کرتا۔

۶۲۱۔ کیجے بیاں سرورِ تپ (۲) غم کہاں تلک　　　ہر مُو میرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

سرورِ تپِ غم: تپ میں قشعریرہ کی سی حالت ہوا کرتی ہے۔

۶۲۲۔ پی جس قدر ملے، شبِ مہتاب میں شراب　　　اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

شبِ ماہ کو بلغمی مزاج ٹھہرایا۔ بلغمی مزاج سفید رنگ ہوتے ہیں چاندنی کے مانند۔

۶۲۳۔ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

میری بات سمجھنی محال ہے: یعنی بیان و زبانِ خامشی یا آنکہ میری گفتگوے زبانی۔

۶۲۴۔ کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ　　　دل فردِ جمع و خرچ زبان ہائے لال ہے

یعنی اپنے اظہارِ دردِ دل کی شکایت حسرت کس سے کروں کہ زباں ہائے گنگِ مردم سے اس اظہار کی کہیں داد نہ پائی اور دل اپنا فردِ حسابِ زباں ہائے مذکور کا ہے یعنی بہتیری زبانوں کا اس فرد میں داخلہ ہے۔

موسوی خانِ فطرت کا ایک مطلع اس مضمون سے ملتا ہوا ہے۔

ہیچ کس آگہ ز شرحِ اشتیاقِ ما نشد
نامۂ ما چوں زبانِ لال ہرگز وا نشد

۶۲۵۔ کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا　　　رحمت، کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے

کس پردہ میں ہے: فَلِلرَّحْمٰنِ اَلْطَافٌ خَفِیَّۃ۔

آئینہ پرداز: آمادۂ ظہور۔

رحمت: رحمتِ الٰہی۔

لبِ بے سوال: لبِ خاموشِ مظلوم۔

۶۲۶۔ ہے ہے، خدانخواستہ، وہ اور دشمنی　　　اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے

اور: عطفِ استبعاد یعنی بعید ہے کہ محبوب دشمنی کرے۔

شوقِ منفعل: شرمندہ شوق باضافتِ مقلوب یا صفتِ شوق یعنی اے شوقِ پشیماں۔

۶۲۷۔ مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان — نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

نافِ زمیں: کعبہ۔

۶۲۸۔ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا — دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

دریا زمیں را لخ: بسبب تنگی زمیں کے۔

۶۲۹۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

خیال: وہم۔

۶۳۰۔ تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو — حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

کھودو گے تو دبی ہوئی آگ شکوہ کی نکل آئے گی۔

۶۳۱۔ دلا، یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر — نہ گریہ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

درد و الم: دردِ والمِ عاشقی۔

مغتنم ہے: کیونکہ چند روزہ ہے۔

آخر: انجامِ کار یعنی زوالِ عمر۔

۶۳۲۔ ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا، غلط بردار ہے

غلط بردار: غلطی کو مٹانے والی چیز جیسے ربڑ۔

۶۳۳۔ جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتش بار ہے

نفس: نالہ ہمارا یا شعر ہمارا۔

۶۳۴۔ آگ سے پانی میں بجھتے (۵) وقت اُٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

نالے سے: نالہ کرنے سے۔

۶۳۵۔ ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

جلوہ: شرابِ تجلی۔

سرشار: لبریز۔

۶۳۶۔ مجھ سے مت کہہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی — زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی: خطاب بہ غالب۔

اپنی زندگی: اپنا سرمایۂ حیات۔

۶۳۷۔ آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

سرنامہ: عنوانِ خط۔

اس کو: غالب کو۔

۶۳۸۔ پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

پینس: پالکی۔

کندھا بھی کہاروں الخ: اتنی شتابی سے گزرتے ہیں۔

۶۳۹۔ مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے — جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

حیرت آبادِ تمنا: عالمِ موہوم۔

عنقا ہے: بلحاظ بلند پروازی و گردن درازی۔

۶۴۰۔ خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

کوئی موسم ہو: ہر موسم میں۔

۶۴۱۔ وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم — اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

ہے اتفاقی: اتفاقی ہے نہ بتاثیرِ فریادِ دل ہائے عشاق۔ اتفاقی وہ کام جو یوں ہی بے سبب ہو جائے۔

۶۴۲۔ نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی — کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

عاشقِ ناامید کا کفِ افسوس ملنا تازگیِ تمنا کا پیمان باندھنا ہے۔ عہد باندھتے وقت ہاتھ ہاتھ میں دیتے ہیں۔ یہ کفِ افسوس ملنے سے مشابہ ہے۔

۶۴۳۔ رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے — نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

رحم کر بیمارِ وفا پر جس کی ہستی چراغِ کشتہ کی مانند ہے۔

۶۴۴۔ دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں — ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی: عشق و تعلقِ دلی۔

بے رونقی: خاموشی۔

چراغِ کشتہ: تمثیلِ دلِ بے سوزِ عشق کی ہے۔

۶۴۵۔ چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے — سُرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلہ آواز ہے

نوا پرداز: سخن گو اشاروں سے۔

سرمہ: چشمِ خوباں کا سرمہ۔

۶۴۶۔ پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے　　نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

پیکرِ عشاق الخ: تن عاشقوں کا طالعِ ناساز کا ساز ہے۔

سیارہ: ستارۂ طالعِ ناساز۔

۶۴۷۔ دستگاہِ دیدۂ[۱] خونبارِ مجنوں دیکھنا　　یک بیاباں جلوۂ گل،[۱] فرشِ پا انداز ہے

دستگاہ: قدرت وساماں۔

پا انداز ہے: پا اندازِ لیلیٰ ہے۔

۶۴۸۔ عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی　　میری وحشت، تیری شہرت ہی سہی

میں تیرا عاشق نہ سہی۔ وحشی مزاج سہی۔ میری وحشت سبب تیری شہرت کا سہی کہ فلاں معشوق کی بزمِ محبت کا یہ عاشق رمیدہ طبع ہے۔ واسوخت کی گفتگو ہے۔

۶۴۹۔ قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

تعلق: وابستگیِ خاطر۔

کچھ نہیں ہے: محبت کچھ نہیں ہے۔

۶۵۰۔ میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی　　اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

میرے ہونے میں الخ: کیونکہ میں عاشقِ پاکدامن ہوں

۶۵۱۔ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

ہم بھی اپنے دشمن تو نہیں ہیں کہ تجھ سے دوستی کر کے اپنے ساتھ دشمنی کریں گے۔ غیر کو تجھ سے محبت سہی۔ ہم کو نہ سہی۔ واسوخت کا مضمون ہے۔

۶۵۲۔ اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

اپنی ہستی ہی الخ: اپنی ذات ہی سے ہو نہ غیر سے۔ یا اپنی ہی کیفیتِ شرابِ ہستی سے ہو۔

۶۵۳۔ عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

برق خرام: زود وگذر رندہ۔

دل کے خوں الخ: سفر کی فرطِ شتابی سے دل خوں ہو جاتا ہے۔

۶۵۴۔ ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں　　نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

ہمارے حق میں عشق نہ ہوا۔ ایک مصیبت ہی ہوئی۔ مگر جھیل لیں گے (پر) وفاداری نہ چھوڑیں گے۔

۶۵۵۔ کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

سائل کو کچھ دینا چاہیے۔ داد نہ دے فریاد کی رخصت تو دے۔

۶۵۶۔ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

تسلیم کی خو: خصلت مان لینے کی تیری بے نیازی و استغنا کو۔

۶۵۷۔ یار سے چھیڑ چلی جائے اسد　　گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

حسرت: ارمانِ وصل۔

۶۵۸۔ بے آرمیدگی [۱] میں نکوہش [۲] بجا مجھے　　صبحِ وطن [۱] ہے خندۂ دنداں [۲] نما مجھے

آرام طلبی میں ملامت کرنا مجھ پر بجا ہے۔ گویا صبحِ وطن جو سببِ استراحت ہے میری نکوہشِ غفلت کے لیے خندۂ دنداں نما ہے۔ صبحِ وطن کی تشبیہ خندۂ دنداں نما کے ساتھ لطف نمایاں رکھتی ہے۔

۶۵۹۔ ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی　　جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مغنیٔ آتش نفس: ایسا مغنی جس کا نغمہ جان سوز ہو اور اس کی آواز برق کی مانند میرے خرمنِ ہستی کو جلا دے۔

۶۶۰۔ مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال　　تا، بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

خیال: فکرِ شعر۔

تا بازگشت سے الخ: مست اپنی راہ کی بازگشت نہیں جانتا کہ کہاں سے آیا تھا اور کدھر کو جاتا ہے۔

۶۶۱۔ کرتا ہے بسکہ باغ میں تُو بے حجابیاں　　آنے لگی ہے نکہتِ گل (۱) سے حیا مجھے

آنے لگی ہے الخ: کیونکہ نکہتِ گل کی بے پردگی باغ میں ایسی نہیں ہے جیسے تیری۔

۶۶۲۔ کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

دل کا معاملہ: یعنی تعلقِ خاطر و گرفتاریٔ دل۔

شعروں کے انتخاب الخ: کیونکہ عاشق لوگ شعرِ حالی کو پسند کرتے ہیں۔

۶۶۳۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ھَفَوَاتِ الشُعَرَاء۔ (۷)

۶۶۴۔ اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

بیٹھا رہا اگرچہ الخ: بے حیا بن کے بیٹھا رہا اگرچہ غیروں سے اشارے ہوا کیے۔

۶۶۵۔ دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

ڈر کے چپکا چلا گیا ورنہ میرا تیرے در سے صدا نہ کیے ہوئے جانا بعید بات ہے۔

۶۶۶۔ رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

آب و ہوا: شراب وغیرہ۔

۶۶۷۔ بے صرفہ ہی گذرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

حضرت: خضر علیہ السلام۔

۶۶۸۔ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم (۸) تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

مقدور ہو تو پوچھوں: پوچھ سکوں۔

لئیم: بخیل۔

گنج ہائے گراں مایہ: کنایہ اجسادِ مقبوریں سے ہے۔ جن کا (کوئی) پتہ نہیں۔

۶۶۹۔ کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

تراشنا تناسبات سے آرے کی ہے۔

۶۷۰۔ صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

یہ خو: خصلتِ بے شرمی۔

بغیر التجا کیے: بے مانگے۔

۶۷۱۔ ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

خو: بھولے سے وعدہ وفا کرنا۔

۶۷۲۔ غالبؔ تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

ملے گا جواب کیا: تمہارے کہنے کا کیا جواب ملے گا۔

۶۷۳۔ رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

روانیٔ عمر کی راہ نوردی بیقراری کی ہے بجلی کی مانند۔ عمر کی تقویم کے حساب کو جو آفتاب سے

یعنی شمع کا ہوا کرتا ہے برقِ بجائے آفتاب ہے۔

۶۷۴۔ مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہارے (۴۹) بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

بالِ تدرو الخ: تدرو کہ عاشق ہے سرو کا اس کے بال کو موجِ مے سے تشبیہ دی ہے۔

۶۷۵۔ زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

گوں بوزنِ جوں۔ سونت۔ قابو فرصت۔

۶۷۶۔ جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

جاداد: جائداد۔

غافل گماں الخ: ہوشیار کے پاس خراب نہیں بلکہ خرابات ہے۔

۶۷۷۔ نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

نظارہ اس برقِ حسن کو کیا دیکھ سکے جس کے جلوۂ حسن کے لیے جوشِ بہار نقاب ہے یا جس کے جلوۂ حسن سے نقاب بمنزلۂ جوشِ بہار ہے۔

۶۷۸۔ میں، نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

دل: دل جو طالبِ وصل ہے۔

مانا: فرض کیا۔

۶۷۹۔ گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

سوال و جواب: سوال و جواب جو قاصد نے یار سے کیے ہیں۔

۶۸۰۔ دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

دیکھنا قسمت: دیکھنا خوبی و بلندیِ قسمت۔

۶۸۱۔ ہاتھ دھو دل[۱] سے یہی گرمی[۲] گر اندیشے میں ہے

آبگینہ[۱] تندیِ صہبا[۲] سے پگھلا جائے ہے

۶۸۲۔ غیر کو یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

اپنی حیا کے آنے سے جو آپ شرما جائے وہ منعِ گستاخیِ غیر کیونکر کرے۔

۶۸۳۔ دور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

نغمہ ہو جاتا ہے بتاثیر بزم یا بیدردی اہلِ بزم۔

۶۸۴۔ گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق	پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

طرزِ تغافل: عاشق کی طرزِ تغافل۔

کھوئے جاتے ہیں: تغافل میں کھوئے جاتے ہیں۔

وہ پا جائے ہے: ہمارے عاشق ہونے کو وہ پا جائے ہے۔

۶۸۵۔ اس کی بزم آرائیاں [۱] سُن کر دلِ [۲] رنجور، یاں

مثلِ نقشِ مدّعائے [۱] غیر بیٹھا جائے [۲] ہے

بیٹھنے میں دو پہلو ہیں۔ بیٹھنا نقشِ مدعا کا: صورت پذیر ہونا مدعا کا۔

بیٹھنا دل کا: بے طاقتی و پستی دل کی۔

۶۸۶۔ ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا	رنگ کھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

اُڑنا پری کے مناسب ہے۔

۶۸۷۔ نقش کو اُس کے، مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں	کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

کھنچتا جائے ہے: اکڑتا جائے ہے۔

۶۸۸۔ گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے	تب اماں ہجر میں دی بَردِ لیالی نے مجھے

تصورِ تصویرِ نہالی نے بہ رشک ہم آغوشیٔ یار مجھے گرمِ فریاد رکھا تو بسبب گرمیٔ فریاد کے سردیٔ شب ہائے ہجر نے مجھے اماں دی۔

۶۸۹۔ نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم	لے لیا مجھ سے، مری ہمّتِ عالی نے مجھے

دام و نقدِ دو عالم کا ناچیز تھا بجز حقیقتِ آدم کے کہ مظہرِ اتم ہے۔ اس لیے میری ہمت نے اس نسیہ و نقدِ بے حقیقت سے دست بردار ہو کے صرف مجھ کو مجھ سے لے لیا کہ لینے کے لائق میرا ہی نقدِ وجود تھا اور باقی ناچیز۔

۶۹۰۔ کثرت [۱] آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم	کر دیا کافر ان اصنام [۱] خیالی نے مجھے

وحدت کی جلوہ گری کثرت میں پرستش وہم کی ہے۔ ان بتانِ وہم یعنی مخلوقاتِ موہومہ کی پرستش نے مجھے کافر بنا دیا۔

۶۹۱۔ ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا	عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اپنے کو ایسا بلبلِ بے بال و پر چمنِ دنیا کا قرار دیا کہ جس کا گل تک پہنچنا[؟] ایک طرف، آرزوئے گل بھی کبھی اُس کے تصور میں نہ گزری۔

۶۹۲۔ کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے　　　برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

کارخانۂ دنیا میں گلِ لالہ سامانِ داغ رکھنے والا ہے۔ گویا گرم جوشیٔ دہقاں کی تربیتِ گلہا میں اُن کے خرمنِ راحت کے جلا دینے کو بجلی ہے۔

۶۹۳۔ غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم　　　باوجودِ دل جمعی خوابِ گل پریشاں ہے

غنچۂ ناشگفتہ سے شگفتن ہا تک برگِ عافیت ندارد۔ دیکھو باوصفِ خاطر جمعی کہ گل بادشاہِ چمن ہے۔ خوابِ گل جو کنایہ اوراقِ گل سے ہے پریشاں ہے۔

۶۹۴۔ ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے　　　داغ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

پشتِ دست رکھنا زاری و فروتنی کرنی۔ خس بدنداں پکڑنا یعنی تنکا دانتوں میں لینا پناہ و امن چاہتا ہے۔ یعنی داغ سراپا بصورت پشتِ دستِ عجز ہے اور شعلہ خس بدنداں ہے۔ جہاں رنجِ بیتابی اُٹھانے سے یہ عاجز ہیں (پھر) ہم کیونکر اُٹھا سکیں۔

۶۹۵۔ اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب　　　ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ جیسے خانہ ہائے اُفتادہ و خراب و ویراں میں۔ اس اعتبار سے ہم صحرا میں ہیں اور بلحاظ روئیدگی کے بہارستان میں۔

۶۹۶۔ سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے　　　بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

یعنی سادہ لوحیٔ محبوب پہ مرجانے کا ارماں ہے۔ کہ اپنے کشتۂ عشق کو خنجر سے مارا چاہتا ہے یا اُس کی سادہ روئی پر مرنے کی حسرت ہے مگر خنجر قاتل کے ہاتھ میں ہونے سے بمجبوری کشتۂ خنجر ہونا پڑا۔

پھر: مرادف بھی کا ترجمہ نیز۔

۶۹۷۔ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا　　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ بھی: یہ تقریر یا مقرر یا لذت۔

۶۹۸۔ گرچہ ہے کس کس برائی سے و لے با ایں ہمہ　　　ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

۶۹۹۔ بس ہجومِ نا اُمیدی، خاک[۱] میں مل جائے گی

یہ جو اک لذت [۱] ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

سعیِ بے حاصل: وہ سعی جو حصولِ مدعا کی توقع پر کی جاتی ہے۔

۷۰۰۔ رنجِ رہ کیوں کھینچیے، واماندگی کو عشق ہے — اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم، منزل میں ہے

رنجِ سفر کیوں اُٹھائیں۔ ہم عاشقِ واماندگی ہیں۔ یا ہماری تحیت واماندگی کو ہے جس کی بدولت جو قدم ہمارا اُٹھ نہیں سکتا وہ منزلِ مقصود میں ہے۔ (یعنی) منزل (پر) پہنچ کے ٹھہر جاتے ہیں۔

۷۰۱۔ جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی — فتنۂ شورِ قیامت کس کی [۱] آب و گل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی باعتبارِ سوزِ عشق۔ فتنۂ شورِ قیامت بہ لحاظ ہنگامہ پردازیِ حسن تمہاری طینت میں ہے۔

۷۰۲۔ ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب — رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

رحم کر: خطاب محبوب۔ یعنی تیری آرزو پر جو غالب کے دلِ پُر پیچ و تاب میں ہے۔ رحم کر اور دیکھ تمنائے مذکور کس مشکل و آفت میں پڑی ہے۔

۷۰۳۔ دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی — دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

تبدیل مصرعِ ثانی از والا غفرلہ۔ مصرع — تیغِ اجل تھی دم میں کئی کام کر گئی

۷۰۴۔ شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

فراغ: فراغت پردہ داریِ زخمِ جگر سے۔

۷۰۵۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

۷۰۶۔ اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی

بارے اب الخ: جو آرزو تھی حاصل ہوئی۔ ہوا بمعنی باد و خواہش ایہام ہے۔

۷۰۷۔ دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

موجِ خرامِ یار: یعنی موجِ بہارِ خرامِ یار۔

۷۰۸۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

بوالہوس: عاشقِ کاذب۔

اہلِ نظر: عاشقانِ صادق۔

۷۰۹۔ نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

بکھرنا رعایت نقاب کی ہے۔

۱۰۷۔ فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا   کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

فردا: روزِ آئندہ۔

دی: روزِ گذشتہ۔

۱۱۷۔ تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے   حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

شاید تری صورت حورانِ جنت میں ملے اور اس ملنے سے مزہ نظر بازی کا حاصل ہو مگر ہم تجھے (اگر) نہ دیکھیں تو تسکیں کا کیا ماتم نہ کریں گے۔

۱۲۷۔ اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل   میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

میرے پتے سے: میرے مدفن کے پتے سے۔

۱۳۷۔ ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم   ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے، جس قدر ملے

شرم کرو اور مے باندازۂ حوصلہ دو۔

۱۴۷۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم   میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

یعنی بجز سلام پہنچانے کے تو اور کچھ نامہ بر سے کلام نہ کرنا۔ یہ رشک آمیز گفتگو ہے۔

۱۵۷۔ تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

کشاکشِ غمِ پنہاں سے اگر فرصت ملے تو ظاہراً ابھی مجنوں کی سی سرگزشتِ دیوانگی ہم بھی تم کو دکھائیں گے۔

۱۶۷۔ اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا   تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

آشفتہ سر: شوریدہ سر۔ دیوانہ۔

۱۷۷۔ کوئی دن گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

کوئی دن: چند روز۔

اپنے جی میں الخ: اس میں کئی پہلو ہیں۔ متوارد مختلفہ پر کہا جا سکتا ہے۔ ظاہراً واسوخت کا مضمون ہے کہ تیرے عشق سے دست بردار ہوں گے اور کوئی دوسرا یار اختیار کریں گے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

۱۸۷۔ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں   سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

نہانی: دلی۔

۷۱۹۔ دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر　　　کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

منہ دیکھتا ہے کہ مضمون مخالفِ مقصود مکتوب الیہ ہے یا کیا ہے۔ کوئی زبانی پیام تو برخلاف ہے۔

۷۲۰۔ قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم　　　وہ بلائے آسمانی اور ہے

وہ بلائے آسمانی: محبوبِ رشکِ ستارگان۔

۷۲۱۔ ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

مرگِ ناگہانی: معشوقۂ تازہ یا حادثۂ نو۔

۷۲۲۔ کوئی امید بر نہیں آتی　　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

کوئی صورت: برآمد مدعا کی یا محبوبِ ماہ سیما کی صورت۔

۷۲۳۔ موت کا ایک دن معیّن ہے　　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کیا نیند موت ہوگئی ہے جو روزِ معیّن پر ہی آئے گی اور رات بھر آتی نہیں۔

۷۲۴۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

اب ہم ایسے متحیّر و مبہوت ہو گئے۔

۷۲۵۔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کچھ ایسی حیرت انگیز بات ہے جس سے میں خاموش ہو رہا ہوں وَالّا وہ کونسی بات ہے جو مجھے کرنی نہیں آتی۔

۷۲۶۔ کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں　　　میری آواز گر نہیں آتی

میری آواز محبوب یا اہلِ محلّہ کے کان میں۔

۷۲۷۔ داغِ دل گر نظر نہیں آتا　　　بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہمارے دل کا داغِ پنہاں اگر تجھے دکھتا نہیں تو کیا اُس کی بو بھی مشموم نہیں ہوتی۔ دوسرے معنی ہمارا داغِ پوشیدہ خارجِ حس اور اُس کی بوئے سوختہ بھی نا محسوس۔ پھر اے چارہ گر تو کیا چارہ گری کرے گا۔

۷۲۸۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

وہاں: اُس عالمِ بے خبری میں۔

۷۲۹۔ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　　موت آتی ہے، پر نہیں آتی

موت آتی ہے الخ: ہجرِ دوست میں موت کی سی تو حالت ہے مگر اجل موعود جو موقوف وقت ہے نہیں آتی۔

۷۳۰۔ کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب — شرم تم کو مگر نہیں آتی

کعبہ کس الخ: کیونکہ تمام عمر صنم پرستی میں بسر کی۔

۷۳۱۔ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

بقرینۂ لفظ زبان۔ ہم زبانی۔ یار سے مانند اغیار کے مدعا ہے۔

۷۳۲۔ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہنگامہ: عالم ہستی۔

(جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود) سے (ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے) تک قطعہ بند ہے۔

۷۳۳۔ ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے

صدا: آواز۔

۷۳۴۔ کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے — یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے [۴]

بتِ غالیہ مو آئے: صنمِ خوشبو گیسو کے آنے کی تمنا کرتے ہو۔ یہ آئے صیغۂ تمنا ہے۔

کہو: خبر دو۔

وہ آئے: وہ آیا یہ صیغۂ ماضی مطلق۔

۷۳۵۔ ہوں کشمکشِ نزع [۱] میں ہاں جذبِ [۲] محبت

کچھ کہہ نہ سکوں [۱] پر وہ میرے پوچھنے [۲] کو آئے

کچھ کہہ نہ سکوں: بحالتِ نزع کچھ کہہ نہ سکوں۔

پوچھنے کو آئے: باثرِ جذبِ محبت پوچھنے کو آئے۔

۷۳۶۔ ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

اُس شوخ کی آمد عالم برق وغیرہ کی مانند سراپا بیقرار و بے تاب ہے اور جس کا یہ آنا صاعقہ وغیرہ کے مانند پُر اضطراب ہے تو آنے میں محسوب ہو نہیں سکتا۔

۷۳۷۔ ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

نکیرین مجھ سے قبر میں خائف ہو کے بھاگ نہ جائیں گے۔ اِلّا اُس وقت کہ شاید میرے منہ

سے شراب شب گزشتہ کی بو آئے۔

۷۳۸۔ جلا دے سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آئے

یہ شعر مسئلۂ وحدت الوجود پر مبنی ہے۔

اُسے: ایہام یعنی خدا کو یا جو آئے اُس کو۔

۷۳۹۔ ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنے ہی کو کھو آئے: فنا فی اللہ ہو کے انا الحق کے مقام میں ہو آئے۔

۷۴۰۔ اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اُس در پہ نہیں بار تو کعبے کو ہی ہو آئے

اُس در پہ: درِ محبوب پر۔

۷۴۱۔ کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اثرِ گریہ میں: عاشقوں کے اثرِ گریہ میں۔

اُس سے: اُس تقریر سے یا محبوب سے۔

مجھ کو ڈبو آئے: باظہارِ خرابی میرے گریہ کی مجھ کو ڈبو آئے۔

۷۴۲۔ پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

بے قراری ہے: آرزوئے حسن میں بے قراری ہے۔ زخمِ کاری: زخمِ عشق۔

۷۴۳۔ پھر جگر کھودنے لگا ناخن آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

جگر خراشی محبت کی با ناخنِ داغ یا شوق ہونے لگی۔

۷۴۴۔ قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز پھر وہی پردۂ عماری ہے

نگاہِ نیاز: نگاہِ عاشق۔

وہی پردۂ عماری: یعنی وہی پردۂ عماری جس میں وہ محبوب پردہ نشیں ہے۔

۷۴۵۔ چشم دلالِ جنسِ رسوائی دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

نظارہ پسند آنکھ عاشق کی متاعِ رسوائی عشق کی بکانے والی ہے۔ اور دل خریدنے والا شوقِ خواری عشق کا (خریدار) ہے۔

۷۴۶۔ وہی صد رنگ نالہ فرسائی وہی صد گونہ اشکباری ہے

نالہ فرسائی: نالہ فرسائی جس کو رسوائی لازم ہے۔

اشکباری: اشکباری جس کو خواری لازم ہے۔

۷۴۷۔ دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر   محشرستانِ بے قراری ہے

قیامت میں باعتبار اُٹھنے اور پریشاں ہونے کے یہ لفظ محشر مناسب خرام ہے۔

۷۴۸۔ جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے   روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

جلوہ معشوق کا پھر اظہارِ متاعِ ناز کر رہا ہے۔ گرمیٔ بازارِ جاں سپاریٔ عاشق ہے، خریداریٔ متاعِ ناز میں معشوق کے۔

۷۴۹۔ پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے

وہی زندگی: جس کو محبت میں مرنا کہتے ہیں۔

۷۵۰۔ ہو رہا ہے جہان میں اندھیرا   زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

اندھیرا: تاریکی، ظلم۔

یہ لفظ اور سررشتہ تناسبات سے زلف کے ہیں۔

۷۵۱۔ پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب   اشکباری کا حکم جاری ہے

گواہِ عشق: آہ و اشکباری۔

جاری: مناسب اشک ہے۔

۷۵۲۔ دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا   آج پھر اُس کی روبکاری ہے

دل عاشق کا اور کاوشِ معشوق کے مژگاں کی یا دل و مژگاں دونوں عاشق کے۔ توجیہ اول اس طور پر کہ مقدمۂ دلِ عاشق و کاوشِ مژگانِ معشوق جس نے اس دل کو خون کر کے عاشق کے منہ پر بہایا۔ توجیہ ثانی یہ کہ دلِ خوں گشتۂ عاشق کو خود مژگانِ عاشق نے جو اُس کے منہ پر بہایا آج اُس کی روبکاری ہے۔ روبکاری کا لطف رنگیں بلحاظ خونِ دل بہنے کے چہرۂ عاشق پر نمایاں ہے۔ واللہ اعلم۔

۷۵۳۔ بے خودی [۱] بے سبب نہیں غالبؔ   کچھ تو ہے جس کی پردہ داری [۱] ہے

کچھ تو ہے الخ: یعنی خیال روئے دوست کا ہے، جس کی پردہ پوشی بے خودی کر رہی ہے۔

۷۵۴۔ جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو، گر شادمانی کی   نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

اگر ہم نے اس لذتِ زندگانی پر شادمانی کی تو عشق متہمِ تسکیں نہ ہوگا کیونکہ لذتِ مذکور نمک پاشِ خراشِ دلِ خستۂ محبت ہے، جس سے آزارِ دل صد چند ہو جائے (گا) اور مزہ باعث بے مزگی

ٹھہرے (گا)۔

۷۵۵۔ کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

بالفرض زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی بھی ہوئی مگر کشاکشِ ہستی سے زنجیرِ مذکور کو رہائی کہاں۔ کشاکش کی نسبت زنجیر سے آشکار اور کشاکش میں ہونا زنجیرِ آب کا پدیدار ہے۔

۷۵۶۔ پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

(یہ) نئے رنگ کی گل فشانی ہے۔

۷۵۷۔ نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

فریادیٔ بیدادِ دلبر جو کوئی عاشقِ احمق ہوگا نکوہش اُس کی سزا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اُس کی تضحیک کے لیے صبحِ محشر خندۂ دنداں نما ہو جائے۔

۷۵۸۔ رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

دہقاں خاکِ دشتِ مجنوں میں بجائے دانہ اگر نوکِ نشتر بوئے تو تاثیر اس خاک کی رگِ لیلیٰ کو ریشۂ دانۂ نوکِ نشتر بنا دے۔ یہ اتحادِ حسن و عشق کا مضمون ہے اور نشتر و فصدِ رگِ لیلیٰ کی حکایت بکمال شہرت مقرون ہے۔

۷۵۹۔ پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

گویا پرِ پروانہ کے بادبانِ آتشیں سے کشتیٔ مے چلنے لگی اور گرمیٔ مجلس سے دورِ ساغر میں روانی پیدا ہوئی۔

۷۶۰۔ کروں بیدادِ ذوقِ پر فشانی عرض، کیا قدرت کہ طاقت اُڑ گئی، اُڑنے سے پہلے، میرے شہپر کی

شوقِ پر فشانی جو مجھ پر ستم کر رہا ہے اُس کے عرض کرنے کی قدرت کہاں کیونکہ اُڑنے سے پہلے میرے شہپرِ پرواز کی طاقت اُڑ گئی۔

۷۶۱۔ کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے، قیامت ہے
مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

خیمے کی دیوار قنات کی ہوتی ہے نہ پتھر کی (کہ) جس سے سر نہ پھوڑ سکے۔

۷۶۲۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

زیادہ: فضول و زیادہ سر۔

۷۶۳۔ پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے　　　اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سخت: شدید یا نہایت۔

۷۶۴۔ ہستی ہماری اپنی [۱۴] فنا پر دلیل ہے　　　یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

اپنی قسم: اپنی گور کی قسم۔

۷۶۵۔ تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

تیری وفا سے تیری ہی ستم گریوں کا بدلا ہوگا۔ دوسرے ستموں کا بدلہ نہ ہوگا۔

۷۶۶۔ لکھتے رہے جنوں کی [۱۵] حکایاتِ خوں چکاں　　　ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہر چند اس میں الخ: ہر چند لکھنے میں ہاتھ ہمارے بجائے قلم ہوئے یا بریدہ ہوئے۔ (یہ) عشق کی حکایتِ خوں چکاں کی تاثیر ہے۔

۷۶۷۔ اللہ رے، تیری تندی خو جس کے بیم سے　　　اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

رزقِ ہم: خورشِ یکدیگر۔

۷۶۸۔ اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق　　　جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علَم ہوئے

اہلِ ہوس: عاشقانِ کاذب۔

جو پاؤں اُٹھ گئے: جو پاؤں ترکِ نبردِ عشق میں اٹھ گئے۔

۷۶۹۔ نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے　　　جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

دم: سانس۔

۷۷۰۔ چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی [۱]　　　سائل ہوئے تو عاشقِ [۱] اہلِ کرم ہوئے

۷۷۱۔ جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی　　　تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

اگر نقدِ داغِ دل کی پاسبانی گرمی محبت نہ کرے تو افسردگی ہجراں کی جس کو خاموشی لازم ہے اور وہ کمینِ بے زبانی میں چھپی بیٹھی ہے، نقدِ مذکور کو تاراج و تلف کرے گی۔ واللہ اعلم۔

۷۷۲۔ مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی　　　کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی میری کہانی

کبھی کودکی الخ: حالانکہ لڑکے کہانی سننے کے شائق ہوا کرتے ہیں۔

۷۷۳۔ یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا　　　کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

کسی کو: کسی کو گو اپنا عدو ہو۔

میری زندگانی: میری زندگانی جو سراسر دکھ ہے۔

۷۷۴۔ ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ظلمت کدہ: خانۂ تاریک۔

دلیل: رہبر۔

۷۷۵۔ نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مژدۂ وصال: مژدۂ وصال گوش کو۔

نظارۂ جمال: نظارۂ جمال چشم کو۔

مدت ہوئی الخ: مدت ہوئی کہ رشک باہمی سے شنید و دید مذکور کہ یہ دونوں فارغ ہیں اور فی مابین چشم و گوش صلح ہے۔

۷۷۶۔ نے کیا ہے حسنِ خود آراہ کو بے حجاب اے شوق ہاں (۱۶) اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

اے شوق الخ: اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے جو لازمِ تاثیرے مذکور ہے یعنی حسنِ بے حجاب از مے کے نظارہ کو تسلیمِ ہوش چاہیے۔

۷۷۷۔ گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

عقدِ گردنِ خوباں: سلک مروارید جو گردنِ خوباں میں ہو۔

اوج: یہ لفظ مناسب گردن ہے۔

کیا اوج پر الخ: کس بلندی پر اخترِ طالع جوہری کا ہے، جس کے گوہر نے عقدِ مذکور میں جا پائی۔

ستارہ میں دو پہلو ہیں۔ اول اخترِ بخت۔ ثانی گوہرِ عقد۔

۷۷۸۔ دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

یعنی بزمِ تصورِ دوست یا بزمِ مراقبہ کی شرابِ دید باطنی اور بینندہ کا حوصلہ ساقی اور نظرِ مشاہدہ یا نظرِ فکر اس کی بمشابہ مست ہے۔

۷۷۹۔ اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

بساط: فرشِ بزم۔

ہوا: خواہش۔ زنہار بمعنی ہاں کلمۂ تاکید ہے۔

نائے و نوش: نغمہ و شراب۔

۷۸۰۔ دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　　　میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

دیکھو مجھے: میری حالت دیکھو۔

عبرت نگاہ: عبرت میں۔

نصیحت نیوش: نصیحت سنو۔ نصیحت کا بیان بیت مابعد میں ہے۔

عبرت: عبور طبیعت کا غفلت سے طرف آگہی کے۔

۷۸۱۔ ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی　　　　مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

ساقی کے جلوہ کو بے ہوشی لازم اور یہ دونوں صفات ایمان و آگہی کی دشمن ہیں۔ اسی طرح مصرع ثانی۔

تمکیں: بردباری۔

۷۸۲۔ یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　　　دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

بساط: فرشِ بزم۔

داماں: یعنی دامانِ پُر از گل ہائے رنگا رنگ۔

۷۸۳۔ لطفِ [۱] خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے [۲] چنگ　　　　یہ [۱] جنتِ نگاہ وہ [۲] فردوسِ گوش ہے

ذوق: مزہ۔

یہ جنتِ نگاہ: جنت باعتبار حرکتِ اشجار کے۔

وہ فردوسِ گوش: فردوس بلحاظ آوازِ خوشِ حوراں کے۔

۷۸۴۔ یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں　　　　نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

سوز: برائے مہملہ بمعنی جشنِ شادی۔

۷۸۵۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　　　غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

صریر: آواز۔

سروش: فرشتہ۔

۷۸۶۔ آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے　　　　طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

قرار نہیں ہے: ہجر میں قرار نہیں ہے۔

بیداد: ستم۔

۷۸۷۔ دیتے ہیں جنت[۱] حیات[۳] دہر کے بدلے نشہ[۱] باندازۂ خمار[۲] نہیں ہے

نشہ باندازۂ الخ: شرابِ طہور جنت کی مستی باندازۂ دردِ سرِ حیات دنیا نہیں ہے۔

۷۸۸۔ گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہائے کہ الخ: گریہ کے ضبط پہ قادر نہیں ہوں اس لیے بے اختیار روتا ہوں۔

۷۸۹۔ ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

گمانِ رنجشِ خاطر: محبوب یا احباب کو گمان مذکور۔

غبار: کینہ و کدورت۔

۷۹۰۔ دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے

دل سے اُٹھا لطف الخ: کیونکہ دل آئینہ دار بہارستانِ معانی کا ہے جو ہمیشہ بہار ہے۔ بمضمونِ

ایں مصرع۔ویں گلستاں ہمیشہ خوش باشد۔

غیرِ گُل الخ: آئینہ دار بہار کا گُل ہے مگر۔

ع گُل ہمیں پنج روز و شش باشد

۷۹۱۔ قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے وائے اگر عہد اُستوار نہیں ہے

عہد: اقرار۔

بارے: حاصلِ کلام۔

۷۹۲۔ تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

مے کشی: ترکِ مے خواری۔

۷۹۳۔ ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

تارِ دامن: تارِ دامن کا وہ سرا جو بجانب پائیں ہو مراد ہے۔ دیکھنے والا جتنا سرنگوں ہوگا (اُتنی

ہی) نظر نیچی ہوگی۔

۷۹۴۔ رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

دیوانہ: دیوانہ جو خستۂ سنگِ طفلاں ہے۔

۷۹۵۔ وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ چٹکنا غنچۂ گُل[۱۶] کا صدائے خندۂ دل ہے

یعنی شگفتگی غنچہ کے دل کی عاشقانہ و باخبرانہ ہے نہ (کہ) غافلانہ۔ غنچے کے چٹکنے کو صدائے خندہ

سے اور غنچہ کو دل سے تشبیہ تام ہے۔

۷۹۶۔ پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد — خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

از بسکہ میں صحرا نورد پا بہ دامنِ عزلت یا پا بہ دامنِ صحرا ہو رہا ہوں۔ پہلی حالت میں جوہر میرے آئینۂ زانو یعنی کاسۂ زانو کے میرے خارِ پا بن گئے ہیں۔ دوسری حالت میں خار ہائے شکستۂ پا آئینۂ زانو کے جوہر بن گئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۷۹۷۔ دیکھنا حالت میرے دل کی، ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہِ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

یعنی کمالِ شوقِ دلی سے تیرے ہر سر مو کو نگاہِ آشنا دیکھتا ہوں۔ اور ہر مُو سے نگاہِ آشنا کا لطف پاتا ہوں۔ تارِ مُو کی تشبیہ تارِ نگاہ سے باعتبار اشتراکِ صفتِ درازی و باریکی ظاہر ہے۔

۷۹۸۔ ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ — ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

آہنگ: نغمہ۔

نہ چھیڑے: ایہام۔

۷۹۹۔ جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

اس شعر میں جاں بخشیِ گفتارِ یار کا ذکر ہے۔ بسبیلِ مبالغہ تو جاں بخشی و جاں فزائی گفتار ناز سے صورتِ دیوار جس میں استعدادِ زندگی نہیں ہے جی اُٹھے۔ جاں بخشیِ گفتارِ محبوب میں غلو کیا ہے۔

۸۰۰۔ تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے — جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

گراں مایگی: گراں قدری۔

جب لختِ جگر الخ: یعنی اشک کے ساتھ جگر کے ٹکڑے بھی ہوں۔

۸۰۱۔ دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

گلہ ہائے آزاری کی رخصت دے تا کہ اے ظالم کچھ تجھ کو مزہ بھی اس شکایت کے سننے سے آئے۔ کیونکہ ظالم اپنے ظلم کے سننے سے محظوظ ہوتے ہیں۔

۸۰۲۔ اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

وہ چشمِ جادوگر جو جادو کا آئینہ ہے اگر اشارہ کرے تو جیسے طوطی آئینہ کو دیکھ کے باتیں کرتی ہے آئینہ اشارۂ چشمِ مذکور سے باتیں کرنے لگے۔

۸۰۳۔ کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب — اِک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے

مصرعِ ثانی جملۂ دعائیہ ہے۔

۸۰۴۔ مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک　　آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے

آغوش سے تشبیہ حلقۂ زنّار کی ظاہر ہے۔

۸۰۵۔ غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر　　کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

زر: زرِ قیمتِ گل نہ زرِ گل۔

۸۰۶۔ تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ نالاں[۱۸]　　جب اِک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

نفس: تارِ نفس۔

ہر تار میں آوے ہر تارِ گریبانِ چاک چاک میں آوے۔

۸۰۷۔ آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے　　اے وائے، اگر معرضِ اظہار میں آوے

رازِ نہاں: رازِ جاں سوزِ محبت و عشق۔

اے وائے الخ: اے وائے اگر آتش کدہ یا رازِ مذکور معرضِ اظہار میں آوے۔

۸۰۸۔ حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے　　اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بہ ہنگامِ کمال: بدر ہونے کے زمانہ میں۔

اُس سے: مہ سے۔

خورشید جمال: جمالِ خورشید دارندہ۔ اسمِ صفت۔

میرا مہ: میرا محبوب۔

اُس سے الخ: کیونکہ خورشید کو کاہش نہیں۔ ہمیشہ بدر کے مانند کامل رہتا ہے۔

۸۰۹۔ بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں: بہائے دل میں بوسہ نہیں دیتے۔

مفت آئے تو مال اچھا ہے: دلِ عاشق بغیر بہائے بوسہ کے مل جائے تو اچھا ہے۔

۸۱۰۔ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ [۱] گیا　　ساغرِ جم سے مرا جامِ [۱] سفال اچھا ہے

جامِ سفال اچھا ہے: باعتبار ارزانی و فراوانی کے۔

۸۱۱۔ بے طلب دیں تو مزہ اُس میں سوا ملتا ہے　　وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اچھا ہے: خبر گدا کی۔

۸۱۲۔ اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بیمار: بیمارِ عشق۔

۸۱۳۔ دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

برہمن: جوتشی۔

۸۱۴۔ ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا — جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

شیریں سے: یعنی صورتِ شیریں سے تراشیدہ تیشۂ فرہاد کی یا گفتگوے کوہ کی ہم سخنی سے مراد ہے۔

کمال: مراد سنگ تراشیِ فرہاد سے ہے۔

۸۱۵۔ قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے

مآل: انجام کار۔

۸۱۶۔ خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

نہال: شاہزادہ۔ (۱۹)

۸۱۷۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہ رندانہ گفتار ہے۔ اس سے انکار جنت ملتا ہے یا یوں تاویل کیجیے کہ جنت میں ہم جیسے بد عملوں کا دخل نہ ہوگا۔

۸۱۸۔ نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی، نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

نہ ہوئی تسلی: اُس شوخِ جفاجو کو تسلی نہ ہوئی۔

امتحان: آزمائشِ جاں نثاری۔

یہ بھی نہ سہی: کیونکہ مرنے کے بعد اور کیا امتحاں ہوگا۔ ایسا امتحان نہ ہونا بھی نہ سہی۔

۸۱۹۔ خار خارِ الم حسرت دیدار تو ہے — شوق گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

یعنی شوق کو خلشِ حسرت دیدار بس ہے۔ گلزارِ تسلیِ وصال کی گل چینی حاصل نہ ہوئی نہ سہی۔

۸۲۰۔ مے پرستاں، خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے — ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

منہ سے لگائے: اپنے ہاتھوں منہ سے لگائے۔

۸۲۱۔ نفسِ قیس [۱] کہ ہے چشم و چراغِ صحرا — گر نہیں [۱] شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

سیہ خانہ: خیمۂ پلاسِ سیاہ جو مسکنِ لیلیٰ تھا۔

شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ: رونق افروز خانۂ لیلیٰ۔ پہلا مصرع ایسا ہوتا تو اچھا تھا۔

مصرع: قیس دل سوختہ ہے چشم و چراغِ صحرا

۸۲۲۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

ایک ہنگامے پہ: کوئی ایک ہنگامے پر۔

۸۲۳۔ عشرتِ صحبتِ خوباں ہی (۲) کو غنیمت سمجھو — نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

عشرتِ صحبت الخ: گویہ عشرتِ عمر کاہ ہے۔

عمرِ طبیعی: زندگی دراز جو سو برس کے قریب یا اس سے متجاوز ہو۔

۸۲۴۔ عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے — کہ اپنے سایہ سے، سر پانو سے ہے دو قدم آگے

یعنی اپنے سایہ سے اپنا سر اپنے پاؤں سے دو قدم آگے چل رہا ہے۔ سر کا قدم سے آگے ہونا کٹانے کے ذوق و شوق میں جلاد کے روبرو سراسر لطف کی بات ہے حالانکہ سایہ پر شخص کے تقدیم اُس کے قدم کو نہیں ہو سکتی۔

۸۲۵۔ قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت — فقط خراب لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

فقط خراب لکھا الخ: بادۂ الفت لکھ نہ سکا بتاثیر مستی شرابِ عشق۔

۸۲۶۔ غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی — وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

جھاڑی: اُتاری۔

لذتِ الم: لذتِ المِ عاشقی۔

۸۲۷۔ خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا — کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

داد اس جنونِ شوق کی دینا: اس جنونِ عشق کی دادرسی کرنی چاہیے۔

۸۲۸۔ یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائیں ہیں ہم نے — تمھارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

ظاہراً بددعا معلوم ہوتی ہے۔ در باطن دعائے نیک ہے کہ ہماری عمر بھر کی پریشانیاں طرہ ہائے پُر خمِ محبوباں کے پیش آئیں تو زینت و آرائش اُن کی صد چند ہو جائے گی۔ لفظِ عمر نے بھی جو مشبہ بہ زلف دراز ہے لطفِ شعر کو رسا کر دیا۔

۸۲۹۔ دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے — ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

پر افشاں: بال افشاں یعنی حرکت کناں۔

زمّ: کہاں۔

دم: ایہامی لفظ ہے بمعنی نفس و روح فارسی میں و بمعنی خوں عربی میں۔

۸۳۰۔ قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

قسم جنازہ الخ: یعنی قسم کھاتے ہیں کہ غالب کے جنازہ پر نہ آئیں گے۔

ہمیشہ کھاتے تھے: نہایت محبت سے ہمیشہ کھاتے تھے۔

۸۳۱۔ شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے یہ بھی مت کہہ، جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

یہ بھی: یعنی خفا ہونا۔

۸۳۲۔ پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

باجا: ساز۔

چھیڑیے: ایہام۔

کیا ہوتا ہے: شور و غوغا ہوتا ہے۔

۸۳۳۔ گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

پر حسنِ تلافی دیکھو: کیونکہ محبوب کا سرگرمِ جفا ہونا عین مدعائے عشاق باوفا ہے اگر اس بات کو سمجھتا تو ایسا نہ کرتا۔

۸۳۴۔ کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد، کہ ہم آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

آپ اُٹھا لاتے ہیں الخ: اس سے ہمارا ناوک انداز سمجھتا ہے کہ ہم کمال آرزو مند ہدفِ تیرِ بیداد ہونے کے ہیں۔

۸۳۵۔ خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

بتقاضائے واژونی بخت یا آسماں اگر اپنا برا چاہتے تو شاید بھلا ہوتا۔ یا دوست کا بھلا چاہتے ہیں اپنا بھلا جان کے اور وہ برا ہوتا ہے۔

۸۳۶۔ نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

ایسا ہی: بہت ہی۔

قطعہ

۸۳۷۔ خامہ میرا کہ وہ ہے باربُدِ بزمِ سخن شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

باربد: مطربِ خسرو پرویز جو ہمیشہ باریاب رہتا تھا۔

۸۳۸۔اے شہنشاہِ کواکب سپہ مہرِ علم   تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

مہرِ علم: بلند نشان۔

اکرام: بزرگی۔

۸۳۹۔سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے   تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

نعل بہا: وہ زر جو مراجعت کے لیے لشکرِ بیگانہ کو دیں۔

۸۴۰۔ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال   آستاں پہ ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

آستاں پہ ترے الخ: بدر کی پیشانی گھستے گھستے ہلال ہو جاتی ہے۔

۸۴۱۔میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں   یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

ذوق فزا: شوق افزائے گستاخی۔

۸۴۲۔رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

تلخ نوائی: شکوہ کی گفتگو۔

۸۴۳۔یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے   وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

مجھے صرف یہ رشک ہے کہ میرا عدو تم سے ہم کلام ہوتا ہے۔

۸۴۴۔چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن   ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

ہمارے جیب الخ: کیوں کہ گریباں کی دھجیاں چپکنے سے اُن کے خون سے باہم مل جاتی ہیں۔

۸۴۵۔جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا   کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

کریدتے ہو الخ: دل سوختۂ عاشق کی تلاش ہے دوبارہ جلانے کے لیے۔

۸۴۶۔رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جب آنکھ سے ہی (۲) نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

آنکھ سے ہی نہ ٹپکا: اشک خونیں ہو کے آنکھ سے ہی نہ ٹپکا۔

۸۴۷۔وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز   سوائے بادۂ گلفامِ مشک بو کیا ہے

بادۂ گلفامِ مشک بو: شرابِ طہورِ جنت۔

۸۴۸۔رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی   تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

تو کس امید الخ: کیونکہ امید بر آمدِ آرزو کی کچھ نہ رہی۔

۸۴۹۔ ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اتراتا: ناز کرتا۔

اتراتا: خودنمائی۔

۸۵۰۔ میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

میں انھیں الخ: کیونکہ اپنے میں ہیں۔

چل نکلتے: ازخودرفتہ یعنی اپنے (آپ) سے باہر ہوتے۔

چل نکلنا: آوارہ ہونا اور حد سے گزر جانا۔

۸۵۱۔ قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو — کاش کے تم مرے لیے ہوتے

کاش کے تم الخ: یہ تمنا بسبب کمالِ محبوبیتِ حسن کے ہے۔

۸۵۲۔ میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

اتنا غم کھانے (کو) کئی دل درکار ہیں۔

۸۵۳۔ آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

وہ: محبوب۔

جیے ہوتے: ہم جیتے ہوتے۔

۸۵۴۔ غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

محفل میں: تمھاری محفل میں۔

تشنہ لب پیغام کے: خواہشمند تمھارے پیغام کے۔

۸۵۵۔ خستگی کا تم سے کیا شکوہ، کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خستگی: خستہ دلی۔

ہتھکنڈا: دستور، عادت و تجربہ۔ ترکیبی معنی تیغہ یا چھرا ہاتھ کا۔

۸۵۶۔ خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

خط لکھیں گے: تمہارے نام خط لکھیں گے۔

۸۵۷۔ رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

زمزم: چاہِ معروف۔

جامۂ احرام: دو چادر سفید جو حج میں ایک باندھیں ایک اوڑھیں۔

۸۵۸۔ دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر — یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

مگر: شاید۔

یہ بھی: آنکھیں۔

۸۵۹۔ شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر — دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

دن پھریں: دن اچھے آئیں۔

۸۶۰۔ پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوے مہر و مہ تماشائی

بہار آئی: زمیں پر بہار آئی۔

مہر و ماہ: ساکنانِ آسمان۔

قطعہ

۸۶۱۔ دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

۸۶۲۔ کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

روکش: مقابل یا خجل کن۔

۸۶۳۔ سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

بن گیا: سبزہ بن گیا۔

کائی: جامۂ غوک۔

۸۶۴۔ سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

دی ہے: کرشمۂ بہار کی مسیحائی نے دی ہے۔

۸۶۵۔ ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

یعنی ہوا خوری میں اس موسم کی شراب خوری کی تاثیر ہے پس بادہ نوشی کار بے فائدہ ہے۔

ہوا میں: یعنی بادِ بہار میں۔

۸۶۶۔ کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ — شاہِ دیندار نے شفا پائی

دنیا: تمام اہلِ دنیا۔ دنیا و دین صنعت طباق ہے۔

۸۶۷۔ تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے — اگر پہلو تہی کیجیے تو جا میری بھی خالی ہے

اپنی عالی دماغی سے تغافلِ احباب کو بزمِ عشرت میں پسند کرتا ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے پہلو تہی کریں تو میری جائے بھی خالی ہے۔ پہلو تہی میں جائے کا خالی ہونا ایک بدیہی نیا مضمون پُر لطف ہے۔ پس تغافلِ یار اپنی ہم بزمی کا مخل نہ ہوا۔ ایسے تغافل کا کیا مضائقہ۔ جائے کسی بزم میں خالی ہونا کنایۃً اس سے ہے کہ اہلِ بزم اس کے منتظر ہیں۔ جائے فلانی پیدا و سبزو خالی است ہر سہ مقام یاد شخصی گویند۔ بہارِ عجم۔

۸۶۸۔ رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یعنی اہلِ ہمت کا ہونا موجب ویرانیٔ عالم ہے کہ یہ لوگ حاصلِ روئے زمیں اور دنیا بھر کے خزانے خالی کر دیتے ہیں۔ تمثیل اہلِ ہمت کی جام و سبو ہے کہ یہ جس کثرت سے میخانے میں ہوں گے، شراب خانہ اُسی قدر خالی ہو جائے گا۔

۸۶۹۔ خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ — دیکھ خونابہ فشانی میری

خلشِ غمزہ: خلش تیرِ غمزہ میرے دل میں۔

خونابہ فشانی: دیدۂ گریہ سے خونابہ فشانی۔

۸۷۰۔ کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار — مگر آشفتہ بیانی میری

روئیں گے: میرے بعد روئیں گے۔

یار: احباب۔

آشفتہ بیانی: پریشاں سخنی شاعری میں۔

۸۷۱۔ ہوں ز خود رفتۂ بیداۓ خیال — بھول جانا ہے نشانی میری

بیدا: بالفتح بیاباں۔

خیال: بلند فکر شعر جس کو ہر کوئی نہ پا سکے اور نہ پہنچ سکے۔

بھول جانا: راہ سے بھٹک جانا یا گم گشتگی۔

نشانی: سنگِ نشاں یا علامت و پہچان۔

۸۷۲۔ متقابل ہے مقابل میرا — رُک گیا دیکھ روانی میری

متقابل: متضاد۔

تقابل: باہم دیگر روبرو شدن۔

متقابل ہے: یعنی میرا ضد ہے۔

مقابل: طرفِ سخن۔

روانی: روانیٔ طبع و فکر۔

۸۷۳۔ قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں　　　　سخت ارزاں ہے، گرانی میری

گرانی: ایہام بمعنی گرانی ہائے و گراں وزنی۔

۸۷۴۔ گردباد رہ بیتابی ہوں　　　　صرصرِ شوق ہے بانی میری

صرصر: بادِ تند ہوائے تیز۔

شوق: عشق۔

بانی: بنیادگری گردباد کی بادِ صرصر سے ظاہر ہے۔

۸۷۵۔ نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب　　　　پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

نقشِ نازِ صنمِ طناز کا رقیب کے آغوش میں ایسا بد نشین و بدنما ہے کہ اُس کی تصویر کھینچنے کو پائے زشتِ طاؤس واسطے خامۂ مانی مصورِ چین کے چاہیے کیونکہ نگارِ طناز بمشابہ نقشِ بالِ طاؤس اور آغوشِ رقیب بمنزلہ پائے طاؤس یا پنجۂ طاؤس ہے لہٰذا پائے طاؤس کا خامۂ نقاشیٔ نقشِ مذکور کے لیے ضرور ہوا۔ واللہ اعلم۔

۸۷۶۔ تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے　　　　غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

تحیر کو: حیرانیٔ عاشق کو جس کا لازم سکوت ہے۔

غم: غمِ عشق۔

آشفتہ بیانی مانگے: پریشاں گفتاری چاہے، جو ضدِ حیرانی ہے۔

۸۷۷۔ وہ تپ (۳) عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع　　　　شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

تمنا ہے: مجھے آرزو ہے۔

شعلہ: تپِ مذکور کا شعلہ۔

نبضِ جگر: نبضِ جگرِ شمع کنایہ ہے رشتۂ شمع سے جس میں ریشہ دوانی شعلہ کی روشن ہے۔

۸۷۸۔ واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر　　　　یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

یاں نالہ کو: ہمارے نالۂ نارسا کو۔

(۴۳)

۸۷۹۔ از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز ے   جو داغ نظر آیا اِک چشم نمائی ہے

غم: غمِ عشق۔

داغ: داغِ عشق۔

چشم نمائی ہے: یعنی تہدید ہے تعلیمِ ضبط میں۔

چشم نمائی: ترسانیدن باشارہ و گردشِ چشم۔ اشرف بہ رقیبان نظرت چشم نمائی است بمن۔ بہارِ عجم۔

۸۸۰۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی   لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

رقیب کے لیے ظاہراً دعائے نیک ہے۔ حقیقتاً دعائے بد ہے کیونکہ زخم رفو پذیر عاشقِ کاذب کے لائق ہے نہ (کہ) صادق کے۔

۸۸۱۔ اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور   دل میں نظر آتی تو ہے اِک بوند لہو کی

تصورِ مذکور دل میں بجائے ایک بوند لہو کی ہے یا ایک بوند لہو جو دل میں ہے اس تصور سے وہ بھی اشکِ خونیں ہو کے بجھائے۔

۸۸۲۔ کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے   یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

بے حوصلگی: یعنی مظنہ کم ظرفیٔ عشاق سے ستم کشی میں۔

یاں: عالمِ جاں نثاری محبت و عاشقی میں۔

کوئی: یعنی دشنہ و خنجر۔

کسو کی: یعنی جگر و گلو کی۔

۸۸۳۔ دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو   خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

دشنہ نے کبھی الخ: یہاں کی یہ حالت ہے۔

۸۸۴۔ صد حیف وہ ناکام کہ اِک عمر سے غالب   حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

صد افسوس کہ وہ عاشقِ نامراد کہ مدتِ دراز سے اے غالب حسرتِ عربدہ میں صنمِ عربدہ جو کے رہ جائے اور وہ اُس کے نصیب نہ ہو۔ عربدہ جو کی معنی جنگ جو (کیوں ڈرتے ہو) سے (بتِ عربدہ جو کی) تک قطعہ بند ہے۔

۸۸۵۔ سیماب [۱] پشت گرمیٔ آئینہ [۲] دے ہے، ہم

حیراں [۲] کیے ہوئے ہیں دلِ [۱] بے قرار کے

پشت گری آئینہ حیرانی میں سیماب سے عیاں اور تعلق سیماب کا پشتِ آئینہ سے نمایاں ہے۔

۸۸۶۔ ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں — معشوقِ شوخ (۳۳) و عاشقِ دیوانہ چاہیے

ان دو صفتوں سے جو معشوق و عاشق متصف ہوں اُن کے لیے وصل عین ہجر ہو جاتا ہے لہٰذا بر خلاف ان صفتوں کے شوخی معشوق میں اور دیوانگی و شورشِ عشق عاشق میں چاہیے۔

۸۸۷۔ چاہیے، اچھوں کو، جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

جتنی محبت کیجئے اچھے لوگوں سے کیجئے یہ لوگ در عوض ہم سے محبت کریں گے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ اس مضمون کا ضد حسنِ مطلع ہے۔

۸۸۸۔ صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

کھینچا چاہیے: ایہام ہے یعنی پینا چاہیے اور روک رکھنا چاہیے۔

۸۸۹۔ چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

ع کہ عشق آساں نمود اول وے افتاد مشکل ہا

سمجھا چاہیے: انتقام لیا چاہیے۔

۸۹۰۔ چاک مت کر جیب، بے ایامِ [۱] گل — کچھ اُدھر [۱] کا بھی اشارا چاہیے

اُدھر کا: گل کا یا خالقِ فصلِ بہار کا۔

۸۹۱۔ دوستی کا پردہ ہے بیگانگی [۱] — منہ چھپانا [۱] ہم سے چھوڑا چاہیے

۸۹۲۔ دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

محبوب کی دشمنی نے میرے ساتھ رقیب کو کھو دیا (کہ) جس دشمنی کے دیکھنے سے رقیب بھی آوارہ ہو گیا۔ بوجہ کھو بیٹھنے رقیب کے، جیب میرا کس قدر دشمن ہے۔ دیکھنا۔ یا خود رقیب کی دشمنی نے میرے ساتھ رقیب کو جیب کی صحبت سے گم گشتہ کیا۔ اس پر رقیب میرا کتنا دشمن ہے خیال کیا چاہیے۔ واللہ اعلم۔

۸۹۳۔ اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

اپنی: عاشق کی۔

ہنگامہ آرا: رسوائی کا ہنگامہ آرا۔

۸۹۴۔ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے

یعنی مریں گے تو امید برآئے گی۔

۸۹۵۔ غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے   چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

غافل: منادی اے غافل۔

مہ طلعتوں کے واسطے: معشوقانِ ماہ صورت کے لیے۔

چاہنے والا بھی الخ: ان کا عاشق بھی ان جیسا خوبصورت چاہیے۔

۸۹۶۔ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ   آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

صورت: حیثیت و حالت۔

۸۹۷۔ ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے   میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

میری بے راہ روی یا رفتارِ سست سے بیاباں دور ہوا جاتا ہے۔ بمصداق شعر سعدیؒ

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی

کایں رہ تو میروی بہ ترکستان است

۸۹۸۔ درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر   ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

دیباچۂ کتابِ دیدارِ یار کا درس یعنی محبوب کا دیدار انجانے سے بہت اچھا ہے کہ ہم بتغافل یعنی انجان اُس کو دیکھیں اور وہ اس دیکھنے کو نہ دیکھے۔ لہٰذا تماشائے تغافل کے سبب اپنی نگاہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں بن گئی ہے۔ یعنی طرفِ ثانی کو محسوس نہیں ہوتی۔

۸۹۹۔ وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں   صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

شبِ تنہائی: شبِ فراق۔

صورتِ دود: جیسے آتش سے دود گریزاں ہوتا ہے۔

۹۰۰۔ غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں   کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

غمِ عاشقوں کا معشوقوں کو سادہ وضعی کی تعلیم نہ کرے کہ وہ اپنی آراستگی کو بھول جائیں اور خانۂ آئینہ ویراں پڑا رہے۔

۹۰۱۔ اثرِ آبلہ[۱] سے جادۂ صحرائے[۲] جنوں   صورتِ رشتۂ گوہر[۳] ہے چراغاں[۱] مجھ سے

اثر: سوزش۔

۹۰۲۔ بیخودی، بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو   پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

بہ طفیل بیخودی جو بستر تمہید فراغت ہو جوایسے پاؤں پھیلا دیے ہیں کہ اپنا شبستاں اپنے سے پُر ہو گیا ہے۔ جیسے سایہ کا شبستاں سایے سے۔

۹۰۳۔ شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے — ہو نگہ، مثلِ گُلِ شمع، پریشاں مجھ سے

اگر تو شمع کی طرح میری گردن مارے تو شوقِ دیدار میں میری نگہ گلِ شمع کی مانند شاخ شاخ ہو جائے یعنی ایک نگہ کی کئی نگاہ ہو جائیں گی۔

۹۰۴۔ بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے — سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجرت کی وحشت کیا کہوں کہ میرا سایہ بھی مجھے تنہا چھوڑ کے خورشیدِ محشر میں جا چھپا ہے۔ پنہاں ہونا سایہ کا تاریکیٔ شب میں پیدا ہے۔ خورشیدِ محشر میں پنہاں ہونا کنایہ بالکل نمایاں نہ ہونے سے ہے۔

۹۰۵۔ گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے — آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

گردشِ ساغر الخ: جلوہ تیرے سے علاقہ رکھتا ہے۔

دیدۂ حیراں: جو دیدہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔

آئینہ داری: جلوہ دہی و نمائش۔

۹۰۶۔ نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ — ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

نگہِ گرم: اپنی نگہِ گرم۔

۹۰۷۔ نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

نکتہ چیں ہے: محبوب نکتہ چیں ہے۔

۹۰۸۔ کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے — کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے: ستانے کو کھیل سمجھا ہے۔

۹۰۹۔ غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

یوں: یوں آشکارا۔

۹۱۰۔ اس نزاکت کا برا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

ہاتھ لگائے نہ بنے نزاکت کے سبب۔

۹۱۱۔ کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

نمائشِ حسن کس محبوب کی ہے مجازی خواہ حقیقی۔ شق ثانی میں پردہ سے کائنات مراد ہے۔

۹۱۲۔ موت کی راہ نہ دیکھوں، کہ بن آئے نہ رہے　　　تم کو چاہوں، کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

موت کا آنا تمہارے آنے سے بہتر ہے کہ اس کا انتظار نہ کروں تو بھی آئے بغیر نہ رہے گی۔ بر خلاف اس کے تمہارا آنا کسی موقع پر نہ چاہوں تو پھر کبھی بلانا نہ بنے گا۔ ہر چند ہمیں انتظار ہو تمہیں نہ آنے میں وہی اصرار ہو گا۔ واللہ اعلم۔

۹۱۳۔ بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے　　　کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

بنائے نہ بنے: کارسازی ہو نہ سکے۔

۹۱۴۔ عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ　　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اے غالب عشق پر زور نہیں ہے بلکہ یہ وہ آتش ہے کہ ہاتھوں کے سلگانے سے نہ سلگے مگر سوزِ عشق سے سلگے اور جیسے آتشِ دنیا کو خاموش کرتے ہیں اس کا خاموش کرنا نہ بنے۔

۹۱۵۔ چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے　　　صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

اگر ہماری وحشتِ جنوں برہنگی میں چاک گریباں کی خواہش کرے تو مانند صبح کے ہمارا زخمِ دل گریباں ہو جائے۔ صبح کا زخمِ دل کنایہ ہے آفتاب یا سفیدۂ صبح سے اور گریباں خطوطِ شعاع یا خیوطِ ابیض سے۔ تمام 'یا' اس غزل کی ردیف کے مصدری ہیں۔

۹۱۶۔ جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال　　　دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

خیال: جلوۂ مذکور کا خیال۔

۹۱۷۔ ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب کب تلک　　　آبگینہ کوہ پر عرضِ گرانجانی کرے

محبوبانِ سنگ طینت جو کوہ وقار ہیں اُن کی بے پروائی سے عاشق کا شیشۂ دل شکستگی سے بھی نا امید ہے۔ بس یہ شیشہ کب تک کوہ پر اپنی گرانجانی یعنی نہ ٹوٹنے کا اظہار کرے اور یہ التفات نہ کریں۔

۹۱۸۔ میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست　　　موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

اگر شراب خانہ چشمِ مستِ محبوب سے شکست پاوے تو بتاثیر اس چشم خوش مژگاں کے بال شیشہ کا دیدۂ ساغر کا پلک ہو جائے۔ موئے شیشہ کی جگہ موئے ساغر کہیں تو بلیغ تر ہو گا۔ تا (کہ) دیدہ و مژگاں میں مباعدت نہ ہو۔

۹۱۹۔ خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد　　یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

محبّت نے خطِ عارضِ محبوب سے عہد نامہ زلف کو لکھا ہے کہ پریشانی جو زلف سے حاصل ہو ہمیں یک قلم منظور ہے کیونکہ اب زوالِ حسن کا زمانہ ہے۔

۹۲۰۔ وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے　　ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

وہ: محبوب۔

تسکینِ اضطراب تو دے: تسکینِ اضطراب تو دے گا۔

۹۲۱۔ کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا　　تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

لگاوٹ: مرادف لگاؤ بمعنی پیوند و نسبت و قرابت و خویشی۔ یہاں مراد آمیزش اور تعلقِ دلی سے ہے۔

آب تو دے: رو دینے سے لگاوٹ میں آب تو دے۔

۹۲۲۔ دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو　　نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

تمام کر: مار ڈال۔

جواب: جوابِ صاف۔

۹۲۳۔ پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے، شراب تو دے

اوک: بکافِ عربی و با واوِ مجہول چلّو۔ فارسی کفِ آب عربی غرف۔

پیالہ گر نہیں الخ: یعنی چلّو سے پلا دے۔

۹۲۴۔ سیر شکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے　　دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

دامن: اپنا دامن یا دامنِ صحرا۔

برخوردار: طفلِ برخوردار۔

۹۲۵۔ خوشا اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو　　فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

اقبالِ رنجوری: دولتِ بیماری۔

عیادت: بیمار پرسی۔

خوشا اقبال الخ: کیونکہ تمہارے پرتوِ قدم سے یہ طالعِ بیدار حاصل ہے۔

شمعِ بالیں: کنایہ محبوب سے ہے۔ ایہاماً یعنی شمع کا فروغ یا محبوب کا بستر کے لیے اخترِ طالع

بیدار ہوگیا ہے۔

۹۲۶۔ یہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ شام تنہائی | شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

تبدیل مصرع اول از والہ غزل۔ مصرع

تپ پُر اضطرابِ شام تنہائی کی سوزش میں

۹۲۷۔ ابھی آتی ہے بُو، بالش سے، اس کی زلفِ مشکیں کی | ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

بالش: تکیہ۔

دید: دیدار جو ضد ہے خواب کا۔

۹۲۸۔ خطر ہے رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جاوے | غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جاوے

رگِ گردن نہ ہو جاوے: یعنی مانندِ رگِ گردن نہ ہو جاوے۔ رشتہ کو رگ سے تشبیہ تام ہے۔

رگِ گردن مراد ہے نمایاں ہونے سے رگِ مذکور کے حالتِ غضب و تکبر گردن کشی میں۔

۹۲۹۔ سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالب | اگر گل سرو کے[۳۵] قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

روئیدگی و بالیدگی موسمِ بہار کا قصور جاں اگر گلبن اتنا نہ پھولے کہ گلِ پیراہن قامتِ سرو نہ ہو جائے۔

نشو نما: روئیدگی و بالیدگی۔

۹۳۰۔ فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے | نالہ پابندِ نَے نہیں ہے[۳۶]

یعنی نالۂ پنہانِ دلی جو راز کی مانند بے آواز ہوا کرتا ہے مانندِ نَے کے پابندِ نغمہ نہیں ہے۔

لَے: بالفتح صدا و آواز و شوق و آرزو۔ جہاں پہلے معنی مراد ہیں۔

۹۳۱۔ کیوں بوتے ہیں باغباں تُونبے | گر باغ گدائے مے نہیں ہے

تُونبا: بضم اول و سکونِ واوٗ و نون۔ مذکر۔ کدوئے خشک سر بُریدہ کہ گدایان ہنود در آں آب و طعام گذارند۔ دلیل ساطع۔

اس لفظ کے معنی سے معنی شعر کے ظاہر ہیں۔ کیونکہ ہندو فقیر تُونبے سے پانی بھی پیا کرتے ہیں، گدائے مے کا لطف بھی ظاہر ہوگیا۔

۹۳۲۔ ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے | پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

تجھ سی: تیری مانند۔

کوئی شے: کوئی چیز۔

۹۳۳۔ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

عالمِ ہستی ظاہراً ہے مگر حقیقۃً معدوم ہے۔

۹۳۴۔ شادی[۱] سے گزر کہ غم[۲] نہ ہووے — اُردی[۱] جو نہ ہو تو دے[۲] نہیں ہے

اُردی: ماہِ بہار۔

دے: فصلِ خزاں۔

۹۳۵۔ کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد — مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے: یعنی شہد جو مگسِ شہد کے پیٹ میں سے نکلتا ہے۔ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ. الآیہ۔ (۲۸)

۹۳۶۔ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ — آخر تو کیا ہے، اَے نہیں ہے

اَے: اگر۔

۹۳۷۔ نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا — کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

جراحتِ دل کا: زخمِ دلِ عاشق کا۔

اُس میں: مرہم میں۔

ریزۂ الماس: ریزۂ الماس جو خراشندہ جراحت ہے۔

۹۳۸۔ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اِک نگہ کہ بظاہر نگہ سے کم ہے

بہت دنوں میں: بہت دنوں کی مشق میں۔

تغافل: انجان دیکھنا۔

وہ اِک نگہ الخ: یعنی دیکھنے سے تو کم ہے ظاہراً مگر در حقیقت نگاہِ معمولی سے بہت بڑی ہوئی اور کہیں زیادہ ستمگر ہے۔

۹۳۹۔ ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے — مرتے ہیں، وَ لے اُن کی تمنا نہیں کرتے

محبوب کی تمنا نہیں کرتے کہ ایسے خوبرو کا وصال اور ہم۔ اس تمنا سے ہم کو ہم پر رشک آتا ہے۔

۹۴۰۔ در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ پردۂ ظاہری ہے کہ پردائے غیر نہیں کرتے آشکارائی میں ربطِ نہانی کو چھپانے کے لیے۔

۹۴۱۔ کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے

لب کی جگہ رُخ بہتر ہے کیونکہ تشبیہ گل کی لب سے مسموع نہیں۔

۹۴۲۔ کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے　　　کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

کبھی تو اس دلِ دیوانہ کو اپنا ہم بالیں وہم بستر کر، کہ ایک مدت سے حسرت پرست اس کا ہے۔

۹۴۳۔ اسدؔ ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا　　　مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

تمکیں: بردباری۔

۹۴۴۔ کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو　　　یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

تغافل: انجان ہونا دیکھنے سے۔

نظارے سے: دیکھنے سے۔

۹۴۵۔ مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی　　　وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

اُس کافر کا خنجر تیز ہے لہٰذا فرصت دیکھنے کی نہ دے گا اور آرزو اُس کافر کو یا اس کے خنجر کو دیکھنے کی ہمارے دل میں رہ جائے گی۔

۹۴۶۔ عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ　　　جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

اشتیاق انگیز: شوق انگیز یا عشق انگیز۔

۹۴۷۔ دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے　　　ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے

قاصد نے دل اگر دیا ہے محبوب کو تو آدمی ہے اُسے کیا کہیے۔ نامہ بر رقیب میرا ہوا تو ہو قاصد ہے اُسے کیا کہیے۔

۹۴۸۔ یہ ضد[۱] کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے　　　قضا[۱] سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

حالانکہ ہم آج ہی آنے کو قضا کے چاہتے ہیں۔ وقت پر اپنے تو آ ہی رہے گی۔

۹۴۹۔ رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب　　　اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے

دشمن یوں صبح و شام کوچہ دوست میں رہے ہے کہ اب اگر نہ کہیے کہ وہ کوچہ دشمن کا گھر ہے تو کیا کہیے۔

۹۵۰۔ زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب　　　کہ بن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہے کیا کہیے

اُنھیں: محبوبِ کرشمہ ساز کو۔

۹۵۱۔ سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پُرسشِ حال　　　کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے کیا کہیے

پُرسشِ حال: غالب سے پُرسشِ حال۔

یہ کہے: غالب یا عاشق اُن کا یہ کہے۔

۹۵۲۔ تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا کہیے

کچھ سر رشتۂ وفا ہمارے ہاتھ میں ہے مگر کیا کہیے کہ ہے کیونکہ تمھیں اس سر رشتہ کا (کچھ) خیال نہیں۔

۹۵۳۔ انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے

انھیں اپنے رد سوال پر گھمنڈ دیوانہ پن کے لڑنے کا ہے۔ کیوں لڑیں ہم۔ اس لیے ہم نے جواب سے چشم پوشی کی۔ اب کیا کہیں ہم۔

۹۵۴۔ حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

حسد: رشکِ حسوداں۔

سخن: شاعری۔

ستم: ستم بیدرداں و نافہماں۔

۹۵۵۔ کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں، لیکن سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

کہا ہے کس نے الخ: کس نے کہا ہے کہ غالب برا نہیں۔ اچھا ہے۔ یہ استفہامِ انکاری ہے۔

آشفتہ سر: دیوانہ۔

۹۵۶۔ دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

کر گئی وابستۂ تن الخ: میری عریانی مجھے وابستۂ تن کر گئی نہ (کہ) وابستۂ دامن، کیونکہ عریانی نے مجھے سرگرمِ دامن افشانی دیکھا جو کنایہ ہے ترکِ تعلق و تجرید و ترکِ لباس سے۔

۹۵۷۔ بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں مرحبا میں، کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

بن گیا: میں خود سراپا سنگ مذکور بن گیا۔

مرحبا میں: شاباش دے رہے ہیں خود کو۔

گرانجانی: سخت جانی، لفظ گراں مناسب سنگ ہے۔

۹۵۸۔ کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہے جانتا ہے محوِ پُرسش ہائے پنہانی مجھے

بے التفاتی اُس کی: بے توجہی ظاہری محبوب کی۔

خاطرِ جمع ہے: محبوب خاطر جمع ہے۔

محوِ پُرسش ہائے پنہانی: اپنے پُرس وجوے باطنی کا محو۔

۹۵۹۔ میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

میرے لیے ویرانی کو بجائے اسباب لکھ دیا یا خود مجھ کو باعث ویرانی لکھ دیا۔ شقِ ثانی میں اسباب کو باضافت پڑھنا چاہیے۔

۹۶۰۔ بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاش کے اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے: بدگماں ہوتا ہے میرے سننے سے نالۂ بلبل کو جو محبتِ گل میں ہے اور مظنہ سے میرے تعلقِ دلی کے گل کی طرف۔

نوائے مرغِ بستانی: نوائے بلبل جو عشقِ گل میں ہے۔

۹۶۱۔ وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

میرے گھر کی دربانی: میرے گھر کی دربانی انتظار میں اپنے آنے کی کہ میں باہر کہیں جا نہیں سکتا۔

۹۶۲۔ دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی میرزا یُوسف ہے غالب، یوسفِ ثانی مجھے

از سرِ نو زندگی: ایہام ہے یوسف علیہ السّلام کی زندگیٔ دوبارہ کا کنویں سے نکلنے کے بعد۔

۹۶۳۔ یاد ہے شادی [۱] میں بھی ہنگامۂ [۲] یارب مجھے سبحۂ [۳] زاہد ہوا ہے خندہ [۱] زیرِ لب مجھے

یارب: نالہ و شیون۔

سبحہ: سبحہ جس پر ذکرِ یارب ہوا کرتا ہے اور خندۂ زیرِ لب دانہ ہائے سبحہ میں ہے باعتبار سوراخ و رشتہ کے۔

۹۶۴۔ ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

میرے خاطرِ وبستۂ سخن کی کشائش گرد میں شعر کے ہے لہٰذا مکتب خانہ میرے لیے قفلِ ابجد کا طلسم تھا۔ طلسم وہ شکلِ لاینحل جو شعبدہ سے تیار کریں۔ قفلِ ابجد[۲۸] میں چند حلقہ پہلودار اور پہلو پر حلقوں کے چند حرف ابجد کندہ ہوتے ہیں۔ جب وہ حروف بہ ترتیب ابجد ضَظَغ[۲۹] تک مرتب ہوں تو قفل کھل جاتا ہے۔ ورنہ نہیں کھلتا۔ لطفِ شعری یہ کہ مکتب میں ابجد کی تعلیم ہوا کرتی ہے۔ لطفِ سخن میں ایہام ہے بمعنیٔ شعر و حروفِ قفلِ ابجد۔ واللہ اعلم۔

۹۶۵۔ یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

میری دیوانگی کی دانائی کی داد کون دے گا کہ صحرا نوردی میں آسائش نہ دیکھی تو زندانیوں پر رشک کر کے اب چاہتی ہے خود زندانی ہو جائے جیسے پہلے چارہ گروں نے چاہا تھا۔

۹۶۶۔ طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں　　　آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

جو کچھ آرزو کرتا ہوں اُس سے شکست دینا آرزو کا میرا مدعا ہے کیونکہ حسرتِ ناکامی کے لذتوں کی میری طبیعت مشتاق ہے نہ حصول آرزو کے لذتوں کی کہ یہ شیوہ ہوا پرستوں کا ہے اور وہ عاشقوں کا۔

۹۶۷۔ حضور[۱] شاہ میں اہلِ سخن[۲] کی آزمائش ہے

چمن[۱] میں خوش نوایانِ[۲] چمن کی آزمائش ہے

۹۶۸۔ قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے　　　جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں: عشقِ قد و گیسوئے لیلیٰ و شیریں میں۔

جہاں ہم ہیں الخ: جس مقامِ فنا فی اللہ میں ہم ہیں وہاں منصور[۳۰] کی مانند عشقِ قدِ دار و گیسوئے رسن کا امتحاں ہے۔

وہاں: یعنی مقامِ اَنا الحق میں۔

۹۶۹۔ کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر　　　ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

کریں گے: شیریں یا خسرو وغیرہ کریں گے۔

آخر: خودکشی سے۔

آزمائش ہے: کوہ کنی میں آزمائش ہے۔

۹۷۰۔ نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی　　　اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا الخ: یعنی نسیمِ مصر کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی ہوا خواہی سے کیا علاقہ۔ نسیم و ہوا کا لطف دیکھو۔

بوئے پیرہن کی آزمائش ہے: کہ عالمِ محبت میں بوئے مذکور اپنا کیا اثر جتلاتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام پر۔

؎ یک روز صبا بوئے گلی برد
بگریست کہ ایں نکہتِ پیراہن ما نیست

۹۷۱۔ وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے   شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

وہ: یوسفِ ثانی۔

نہ کہیو پھر کہ غافل تھے: نہ کہیو پھر اے اہلِ بزم کہ ہم انجان تھے۔

۹۷۲۔ رہے دل ہی میں تیر اچھا، جگر کے پار ہو بہتر   غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

امتحان اُس کی نشانہ زنی کا ہے خواہ تیر دل میں رہ جائے یا جگر کے پار ہو جائے۔ ان دونوں

ہدف سے خطا نہ کرے۔

۹۷۳۔ نہیں کچھ سبحہ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی   وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار الخ: کیونکہ دونوں پھندے کچے دھاگے کے ہیں۔

وفاداری میں الخ: اہلِ سبحہ و زُنّار میں رشتۂ وفا کس کا چست اور کس کا سست ہے، اُس کا

امتحان ہے۔

۹۷۴۔ پڑا رہ اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل   مگر پھر تابِ زُلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

وابستہ: وابستۂ زلف۔

آزمائش ہے: شانہ زنی سے آزمائش ہے۔

۹۷۵۔ رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو   ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

اُترے: نفوذ کرے۔

ابھی تو تلخی الخ: ہنوز ابتدا میں بالائی و سطحی و سرسری امتحان ہے۔

۹۷۶۔ وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ   نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

اب چرخِ کہن امتحان میرا کیا چاہتا ہے فتنہ نو کو میرے گھر لا کے۔ نیا فتنہ کنایہ یار کے آنے

سے ہے جو پہلے کبھی نہ آیا تھا۔

وعدہ: وعدہ آنے کا۔

۹۷۷۔ کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے   جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

کبھی اُس کے دل میں میرے ساتھ نیکی کا خیال آجائے تو کچھ فائدہ نہیں کیونکہ وہ اپنی جفائیں

جو مجھ پر ہوئی ہیں یاد کر کے محجوب ہو جاتا ہے اور ہمارا مطلوب حاصل نہیں ہوتا۔

۹۷۸۔ خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے   کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے (۳۶)

کھنچتا جائے ہے: ہٹتا جائے ہے۔

۹۷۹۔ وہ بدخُو اور میری داستانِ عشق طولانی — عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

محبوب بے دماغ و نازک مزاج اور عشق کی کہانی طولانی۔ سخن مختصر۔ یہ حال دیکھ کر قاصد بھی گھبرا جاتا ہے۔ فقرہ (عبارتِ مختصر) کو ماقبل سے تعلق نہیں۔ محض تقریبِ کلام کے لیے ہے۔

۹۸۰۔ اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے — نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

محبوب کو مجھ پر بدگمانی ہے کہ میں اُس کا عاشق ہوں لہٰذا میرا حال اُس سے پوچھا نہ جائے ہے اور مجھے یہ ناتوانی ہے کہ اپنا حال مجھ سے بولا نہ جائے ہے۔

۹۸۱۔ سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی، کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

نا امیدی: نومیدیٔ وصال۔

۹۸۲۔ تکلف برطرف، نظارگی میں بھی سہی لیکن — وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

محبوب کی نظارگیوں میں، میں (خود) بھی شریک سہی مگر وہ ہماری آنکھوں سے دیکھا جائے، یہ ظلم کب مجھ سے دیکھا جائے گا۔

نظارگی: بیننده۔

۹۸۳۔ ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

نہ ٹھہرا جائے ہے: یہ خوفِ جان ٹھہرا نہ جائے ہے۔

۹۸۴۔ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مدعی: رقیبِ بے وفا۔

غالب: منادیٰ۔

کافر: محبوب۔

عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن — کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

۹۸۵۔ زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے — کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

از بسکہ تماشائے حسن کی مشق با علامتِ دیوانگی ہے لہٰذا کشاد و بستِ مژگاں حالتِ نظارہ میں چشمِ بیننده کے لیے ندامت کا طمانچہ ہے۔

۹۸۶۔ نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی — تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

تو جو آئینہ دیکھ کے اپنی آرائش کرتا ہے داغِ طعنِ بد عہدی یعنی نئے عاشقوں کو پیدا کرنے کا دھبا اپنے اوپر لگا لیتا ہے۔ میں نہیں جانتا تجھ سے یہ داغ کیونکر مٹے گا اور اس ورطۂ ملامت یعنی آئینہ سے تجھے کیسے رہائی ہوگی۔ آئینہ کی تشبیہ چشمہ و ورطہ سے روشن ہے۔

۹۸۷۔ بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ — نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

نگاہِ عجز معشوق کی طرف جو عشاقِ پاکباز کی نگاہ ہے امن و سلامتی کا سر رشتہ ہے اس سلک کو پیچ و تابِ ہوشیاری کی نظرِ تُند سے توڑیو مت کہ یہ نگاہ باعثِ رسوائی ہے۔

پیچ و تاب: کشمکش۔

۹۸۸۔ وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد — جنونِ ساختہ و فصلِ گُل، قیامت ہے

وفا مدِ نظر در رو بروِ عاشقِ صادق کے (ہے) اور بایں وجہ اُس کی عاشقی کا دعویٰ بے بنیاد (ہے) کیونکہ وفائے عاشقِ صادق پاکدامن مانع ہوا و ہوس ہے اور جنونِ عشق عاشقِ بوالہوس کا ساختہ ہے فصلِ گُل میں یا بہارِ حسنِ معشوق میں، حالانکہ فصلِ مذکور میں جنونِ ساختہ محالِ عادی ہے پس یہ عجیب معاملہ ہے۔ یہ تینوں شعر مرزا صاحب کے پایۂ بلاغت سے گرے ہوئے ہیں کیونکہ بالکل ان میں تعقیدِ معنوی ہے۔

۹۸۹۔ لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے — میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

لاغری میں مبالغہ ہے یعنی تو فکر نہ کر اور اپنی بزم میں مجھے جانے دے۔ میں ذمہ دار ہوں کہ رقیب مجھے نہ بتلا سکے گا۔

۹۹۰۔ کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم — واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

دیکھ کر: مجھے دیکھ کر۔

۹۹۱۔ منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب — کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے: بصیغۂ مضارع۔ لفظ پردہ آنکھ کے مناسب اور با اندازِ عتاب آنکھ دکھلانے میں ایہام ہے بمعنی نمائشِ چشم و چشم نمائی۔

۹۹۲۔ یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں — زلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

اُلجھانا: بالضم پیچ دینا۔

اُلجھاؤ: مذکر۔ پیچ و پریشانی۔

اُلجھن: مؤنث۔ شکن اور پیچ۔ دلیلِ ساطع۔

۹۹۳۔ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مِرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تماشا: حوادث و انقلابات کا تماشا۔

۹۹۴۔ اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

اورنگِ سلیماں: جو ہوا پر اُڑتا تھا بہ تسخیرِ جنّات۔

اعجازِ مسیحا: جو احیائے اموات کے لیے قم باذنِ اللہ فرماتے تھے۔

۹۹۵۔ جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جُز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہستیِ اشیاء: جن کا وجود موہوم و معدوم ہے۔

۹۹۶۔ ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں الخ: بلحاظ میری صحرا گردی کے۔

گھستا ہے جبیں الخ: باعتبار میری اشک باری کے۔

۹۹۷۔ مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

جیسے تو میرے آگے تنگ دل و متوحش ہے اسی طرح میں تیرے پیچھے ہوں۔

۹۹۸۔ سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بُتِ آئینہ سیما مرے آگے

(میں) بتِ آئینہ سیما کا دیکھنے والا ہوں، جو آئینہ بہت دیکھے گا۔ ہر آئینہ خود بین و خود آراء ہوگا۔

سچ کہتے ہو: مجھ کو سچ کہتے ہو۔

۹۹۹۔ نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

رشک سے: نام لینے والوں کے رشک سے۔

۱۰۰۰۔ ایماں [۱] مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کُفر [۲]

کعبہ [۱] مرے پیچھے ہے، کلیسا [۲] مرے آگے

۱۰۰۱۔ عاشق ہوں پہ معشوق [۱] فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو بُرا [۱] کہتی ہے لیلٰی مرے آگے

۱۰۰۲۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شبِ ہجراں کی تمنا میرے آگے

شبِ ہجراں میں جو مر جانے کی تمنا کی تھی وہ تمنا شبِ وصل میں مرے آگے آئی۔

۱۰۰۳۔ ہے موجزن، اِک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

یعنی ایک بڑا دریا اشکِ خونیں کا آنکھوں سے میرے موجزن ہے بقرینۂ لفظ "دیکھیے" جو مصرعِ ثانی میں ہے۔

۱۰۰۴۔ ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا — غالب کو برا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

غالب کو برا کیوں (کہو اچھا) مرے آگے۔

۱۰۰۵۔ نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں — مجھے تو خو ہے، کہ جو کچھ کہو، بجا کہیے

میرے ایجابا بجا کہنے پر نہ کہیو کہ ہم ستم گر ہیں کیونکہ مجھے تو یہ خو ہے کہ جو کچھ تم کہو میں اُس پر بجا کہوں۔

۱۰۰۶۔ وہ نیشتر[1] سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے — نگاہِ[1] ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

دل میں: دل میں عاشق کے۔

۱۰۰۷۔ نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں — وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

جراحتِ پیکاں ذریعۂ راحت نہیں ہے بوجہ تنگیِ زخم کے جو پیکاں میں ہے اور زخمِ تیغ دلکشا ہے بوجہ کشادگیِ زخمِ تیغ کے۔

۱۰۰۸۔ کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے — کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

گراں نشیں: مرادف گراں پا و گراں خیز۔ نشیندہ بگرانی ضد سبک خیز۔

گریز پا: گریزندہ۔

۱۰۰۹۔ نہیں نگار کو اُلفت، نہ ہو، نگار تو ہے — روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

روش: رفتار، چال۔

۱۰۱۰۔ نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے — طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

فرصت: ثبات و قرار۔

۱۰۱۱۔ سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

سفینہ: کشتی۔

ناخدا: ناؤ خدا۔

۱۰۱۲۔ رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

پاک ہو گئے: بے حیا ہو گئے۔

۱۰۱۳۔ صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی — تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

بہ: ادائے بہائے مے بعوضِ آلاتِ میکشی۔

۱۰۱۴۔ پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اپنی آگ کے: اپنی آتشِ شوق کے۔

۱۰۱۵۔ نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب — شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

شاداب رنگ: بارنگ و سیراب۔

شیشۂ مے الخ: لبِ جوئے نغمہ کا سرو شیشہ سبز مے ہے۔

۱۰۱۶۔ ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست — واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

برہم نہ کر: برہم نہ کر اپنے نالے سے۔

واں تو الخ: پس نالہ میرا سبب سرگرمیٔ بزمِ مذکور کا ہوگا نہ باعثِ برہمی۔

۱۰۱۷۔ عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے — دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

اظہارِ نازِ شوخیٔ دنداں ہنسنے کے لیے ہے اپنی بے ثباتی و ناپائداری پر۔ اسی طرح دعویٔ جمعیتِ احباب بھی تدریجاً ٹوٹنے والی (ہے) اور احباب دنداں کی مانند متفرق ہونے والے ہیں۔

۱۰۱۸۔ ہے عدم میں غنچہ [۱] محوِ عبرتِ انجامِ گل [۲] — یک جہاں زانو [۱] تامّل در قفائے خندہ [۲] ہے

انجامِ گل: پریشاں انجامی۔ غنچہ کو زانو تامّل بلحاظ سربہ گریباں و زانو ہونے (پر) غنچہ کے کہا ہے۔

۱۰۱۹۔ کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

کدورتِ بے غمی محبت کو بیتابیِ محبت کا عیش نصیب نہیں و الا دانت دل میں یا جگر میں چبھونا (جو کنایہ خونِ دل اپنا پینے یا اپنا جگر کھانے سے عالمِ شکیبائی میں) بنا خندۂ عیش کی ہے۔ لبِ زخمِ دل سے جو افشارِ دنداں پیدا ہوتا ہے۔ خندۂ دنداں نما کیا خوب ہویدا ہوتا ہے۔

۱۰۲۰۔ سوزشِ باطن[۳۳] کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں — دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

سوزش بسبب گدازِ دل اور مبالغۃً وہ گداز موجدِ محیطِ بے ساحل ہوا۔ اس کو شورش پڑھیں تو اطلع ہوگا یعنی لفظ شورش بدو شین معجمہ بمعنی دیوانگی جس میں ایہام شورِ دریا کا بھی ہے۔ چاہیے تا دیوانوں کی دونوں حالت پر، جو مصدرِ گریہ و خندہ ہوتے ہیں، دلالت کرے فافہم۔

۱۰۲۱۔ حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے — آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

بمضمونِ فاضیت حسنِ مستغنی اپنے متاعِ جلوہ کا خریدار یعنی خواہاں ہے۔ آئینہ جو کنایہ مظاہر سے ہے اختراعِ جلوہ کے لیے زانوئے فکر ہو گیا ہے۔ آئینہ زانو پر رکھتے ہیں۔ آئینہ زانو کاسۂ زانو کو کہتے ہیں۔ لطف ظاہر۔ مجازی معنی بھی تھوڑے تغیر سے یوں ہی ہوں گے۔

۱۰۲۲۔ تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن — چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

اے آگہی تو تماشائے جلوہ کو کہاں تک کھوئے گی۔ چاہیے دیدۂ دل سے اس جلوہ کا تماشا کرنا کیونکہ آنکھ کھلتے تک جو صورتِ آغوش کشادہ ہے جلوہ پدرود ہو جاتا ہے۔

۱۰۲۳۔ جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

دل مجروحِ اُلفت کا دہانِ زخم گویا راہِ سخن ہے دلبر کے ساتھ۔ قابلیت ہمکلامی محبوب کی اسی دہانِ زخم سے حاصل ہوتی ہے نہ (کہ) دہانِ تکلم سے۔

۱۰۲۴۔ عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر — کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

عالم تیرہ و تار کو باعتبارِ سیاہی کے طرۂ لیلیٰ کے یعنی سامانِ زینت ہم خیال کرتے ہیں حالانکہ عالم مذکور غبارِ وحشتِ مجنوں یعنی گردِ بیابانِ وحشت ہے۔

۱۰۲۵۔ افسردگی نہیں طربِ انشائے التفات — ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

بیدردی عشق نہیں ہے خوشی پیدا کرنے والی توجہ محبوب کی مگر سراپا دردِ عشق ہو کے محبوب کے دل میں کوئی عاشق جا کرے تو منشاء اس کی توجہ کا ہوگا۔

۱۰۲۶۔ رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے — آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

آخر کبھی تو الخ: کیونکہ رونے سے دل کھلتا ہے۔

۱۰۲۷۔ چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی — کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

رہِ پرسش: رہِ پرسش معشوق کی چاکِ جگرِ عاشق کو۔

جیب کو رسوا کرے: گریباں کو پھاڑ کے جیب کو رسوا کرے۔

۱۰۲۸۔ لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل — تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

لختِ جگر: باغبانِ مذکور یعنی عاشق۔

کوئی: عاشق۔

۱۰۲۹۔ تا کائی[۱] نگاہ ہے برقِ نظارہ[۲] سوز — تو وہ نہیں کہ تجھ کو[۳] تماشا کرے کوئی[۱]

ناکامی: باعثِ ناکامی۔

۱۰۳۰۔ ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست — نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

کوئی عاشق بذریعۂ جنوں سنگ و خشتِ طفلاں مول لے تو اس سودے میں نقصان نہیں بلکہ گوہرِ شکست حاصل ہونے کا فائدہ ہے کیونکہ سنگ و خشت اس گوہر کے صدف ہیں۔

۱۰۳۱۔ سر بر نہ ہوئی وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

وعدۂ صبر آزما سے جس کے لیے صبرِ ایوب چاہیے۔ تیری تمنا کرے جس کے لیے عمرِ نوح چاہیے۔

۱۰۳۲۔ ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز — یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

وحشت: بیماری وحشت۔

نہ پیدا کرے: متشخص نہ کرے بلکہ تشخیص مایوسی علاج سے مرضِ مذکور کے ظاہر ہوتی ہے۔

۱۰۳۳۔ بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

ہاتھ ٹوٹ جائیں: سر پیٹتے پیٹتے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔

۱۰۳۴۔ حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

دل گداختہ: دل گداختہ شمع کی مانند۔

۱۰۳۵۔ ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حضرت عیسیٰ معجزدم ہوں تو کیا۔ ہوا کریں۔ میرے دردِ عشق کی دوا کریں تو سمجھوں۔

۱۰۳۶۔ شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

مدار: قرار مکافات۔

ایسے قاتل کا: ایسے قاتلِ خوبرو کا۔

کیا کرے: کیا بدلہ کرے۔

۱۰۳۷۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

جس کی چال ایسی سخت و تند ہوگی تو دل اُس کا کیسا ہوگا۔

۱۰۳۸۔ بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کوئی: عاشق۔

۱۰۳۹۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کوئی: معشوق۔

۱۰۴۰۔ نہ سنو، گر برا کہے کوئی		نہ کہو، گر برا کرے کوئی

برا کہے: غیبت کرے۔

نہ کہو: مذمت نہ کرو۔

۱۰۴۱۔ کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند		کس کی حاجت روا کرے کوئی

کس کی حاجت الخ: کیونکہ سب محتاج ہیں۔

۱۰۴۲۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے		اب کسے رہنما کرے کوئی

کسے: کس کو۔

۱۰۴۳۔ بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے		غلام ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

شراب کم کیا ہے: شراب کم کیا ہے ازالۂ غم کے لیے۔

۱۰۴۴۔ تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم، کیا ہے		رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے

تم جس پر لطف کرتے ہو اس پر ظلم بھی کرتے ہو پس تمہارا لطف رقیب پر عین ستم ہے ہم پر کیا ہے۔

۱۰۴۵۔ سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی		یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے

آتش افشانی: گرم بیانی۔

۱۰۴۶۔ جوہرِ[۱] تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم		ہوں میں وہ سبزہ[۱] کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

سبزۂ جوہر تیغ کا اگنا اور کسی چشمہ پر نہیں ہوتا۔ میں سبزۂ جوہر ہوں کہ زہر آب جو تیغ کو دیتے ہیں مجھے اگاتا ہے۔

۱۰۴۷۔ مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے		آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

میں خواہاں اپنی شکستِ دل کے دیکھنے کا ہوں، آئینہ خانے میں جا کر صورت پرستی کیا کروں۔ مجھے آئینہ خانے میں بھلا کوئی کیا لے جائے گا۔ دوسرا پہلو۔ محبوب اپنے ساتھ آئینہ خانے میں مجھے لیے جاتا ہے۔ مدعا اس کا یہ ہے کہ میری شکستِ دل کو وہاں تماشا کرے بوجہ رشک اس بات کے کہ عاشق کے دل کی طرف اس کی توجہ نہ ہوئی (بلکہ) آئینہ خانہ کی طرف ہوئی۔

۱۰۴۸۔ نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک		آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

عالم یک مشت خاک ہے برنگ قمری اور نالہ و شیون قمری کی مانند عالم کا سرمایہ ہے۔ بس

میری نظر میں آسمان بیضۂ قمری ہے جس سے قمریٔ عالم پیدا ہوئی ہے۔

۱۰۴۹۔ زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

کون اُٹھاتا ہے مجھے: ایہام یعنی میرے مُردے کو کون اُٹھاتا ہے۔

۱۰۵۰۔ روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کی

کوکبہ: جمعیت۔

اترائے: ناز کرے۔

۱۰۵۱۔ جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

نمود: نمائش۔

۱۰۵۲۔ بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم و لے کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

نہ کھائیے: ایہام۔

۱۰۵۳۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہزاروں خواہشیں: عاشقی میں ہزاروں خواہشیں۔

دم نکلے: فرطِ ذوق سے دم نکلے۔

بہت نکلے: وصلِ معشوق سے بہت نکلے۔

۱۰۵۴۔ ڈرے کیوں میرا قاتل، کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بہ دم نکلے

خونِ مذکور چشمِ گریاں میں نہیں ٹھہرتا، اُس کی گردن پر کیا ٹھہرے گا۔

دم بہ دم: ایہام ہے۔

۱۰۵۵۔ بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

یعنی تیرا قد دراز اُس کے مقابل پست ہو جائے گا۔ طرّہ اتنا دراز ہو کہ تیرے قد سے بڑھ جائے۔

۱۰۵۶۔ مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے، کان پر رکھ کر قلم، نکلے

ہم اس آرزو میں نکلتے ہیں تا مضمونِ خط کو معلوم کریں کہ کیا لکھواتا ہے۔

۱۰۵۷۔ ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

عہدِ جمشید میں شراب نکلی اور جمشید نے جام ے بنایا۔

۱۰۵۸۔ کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے: وہ جاتا تھا دروازۂ مذکور پر اور ہم وہاں سے نکلے۔

۱۰۵۹۔ کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف، اے شرارِ جستہ، کیا ہو جائیے

کوہ جیسے صاحب تمکیں کے بارِ خاطر ہو جاتے ہیں اگر ہم نالہ ہو جائیں کیونکہ آواز گونج کے کوہ سے بھی فریاد آتی ہے پس جل بجھ کے خاکستر ہو جائیے مانند شرر کے۔

۱۰۶۰۔ بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر[۳۳] رہا ہو جائیے

بیضہ بال و پر نکلنے پر رہنے کی جگہ نہیں۔ قفس کنایہ زمین و آسماں سے ہے۔ اس قفسِ بیضہ مانند سے نکلیں تو اس میں پھنسے نہ رہیں (بلکہ) اس سے نکل ہی جائیں۔

۱۰۶۱۔ مستی، بہ ذوقِ غفلتِ ساقی، ہلاک ہے
موجِ شراب، یک مژۂ خوابناک ہے

اثرِ غفلتِ ساقی سے موجِ شراب مژۂ خوابناک ہو گئی۔ غفلت کو خواب لازم ہے، مستی بھی جس میں سراسر غفلت ہے، غفلتِ ساقی پر مر رہی ہے۔

غفلت: تغافل۔

۱۰۶۲۔ جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

جوشِ جنوں کی خاک سر پر اڑانے سے صحرا (محض) ایک کفِ خاک (ہے جو) آنکھ میں گری ہوئی ہے، جو مانعِ دیدن ہے۔

۱۰۶۳۔ لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

جنبشِ لبِ عیسیٰ بجائے اس کے کہ کشتۂ لعلِ بتاں کو خوابِ عدم سے بیدار کرے، خوابِ مذکور کے لیے گہوارہ جنبانی کر رہی ہے۔ کیونکہ اعجازِ مسیح یہاں موثر نہیں ہوتا اور ہوا بھی تو اس کی زندگی مرگ سے بدتر ہے لہٰذا کشتۂ مذکور کا خواب عجب گراں ہے۔

۱۰۶۴۔ آمدِ سیلابِ طوفاں صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

گویا طوفانِ صدائے آب کے سیلاب کی آمد ہے۔ نقشِ پا بشکلِ گوش ہوتا ہے۔

۱۰۶۵۔ بزمِ مے وحشت[۱] کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ[۱] پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

چشمِ مست کو آہو فرض کیا ہے اور وحشت لازمِ آہو ہے۔

۱۰۶۶۔ ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا   مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

تمنا کی شعبدہ بازیوں کا تماشا دیکھنے والا ہوں فقط پس مطلب بر آئے یا بر نہ آئے یکساں ہے۔

۱۰۶۷۔ سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر   مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

میرے صفحۂ قسمت پر قلم تقدیر سے شب ہجراں کی سیاہی یوں بے اندازہ گر گئی ہے۔

گر جاوے: بے اندازہ گر جائے۔

۱۰۶۸۔ ہجوم نالہ، [۱] حیرت عاجز [۲] عرض یک افغاں ہے

خموشی [۲] ریشۂ صد نیستاں [۱] سے خس بدنداں ہے

ہجوم نالہ عاجز حیرت اظہار یک افغاں ہے۔ خموشی جو لازمِ حیرت ہے صد نیستانِ نالہ کے ریشہ سے خس بدنداں ہے۔

۱۰۶۹۔ تکلف برطرف ہے، جانستاں تر لطف بدخُویاں   نگاہِ بے حجاب ناز تیغ تیز عُریاں ہے

۱۰۷۰۔ ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی   کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے

چاکِ گریباں: چاک گریباں جو ماتم میں ہوا کرتا ہے۔

۱۰۷۱۔ دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے   کہ اس بازار میں ساغر، متاع دست گرداں ہے

اس متاعِ عاریت و قرض کے لیے دل و دیں نقد لے آ۔ لطف دستگرداں بلحاظ ساغر اظہر۔

۱۰۷۲۔ غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو   چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

حالانکہ بادِ تند کشندۂ چراغ تاباں ہے۔ [۳۳] مگر چراغ وجود عاشق دریائے صرصر کا مرجاں یعنی پلا ہوا ہے۔

۱۰۷۳۔ خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے   نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

دل کو خاموشی سے تعلق ہے جیسے سرمہ کو لہٰذا بنا بر خموشی ہائے نگاہ تیری دل عاشق سے انداز تماشا دکھانے والی ہے یعنی سرمہ آلود نکلتی ہے۔

۱۰۷۴۔ فشار تنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم   صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

فشارِ تنگی خلوت سے: دباؤ سے تنگی خلوت غنچہ کے۔

۱۰۷۵۔ نہ پوچھ سینۂ [۱] عاشق سے آب [۲] تیغ نگاہ   کہ زخم روزنِ [۲] در سے ہوا [۱] نکلتی ہے

آب تیغ نگاہِ معشوق گرمی سوز سے سینۂ خستۂ عاشق کے ہوا بن کر یوں نکلتا ہے جیسے روزنِ در

سے ہوا نکلتی ہے۔

۱۰۷۶۔ جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے ۔۔۔ نافہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے

نافہ اس شانہ زنی کے اثر سے نافِ آہو نہیں بلکہ دماغ آہو یعنی سرمایہ اس کے غرور کا ہے۔

۱۰۷۷۔ کس کا سراغ[۱] جلوہ ہے حیرت[۲] کو اے خدا

آئینہ[۲] فرشِ شش جہت انتظار[۱] ہے

۱۰۷۸۔ ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق ۔۔۔ گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

وجودِ عاشق کا ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے پس کے غبارِ شوق کی مانند پھیل گیا ہے۔ شوق کی وسعت ظاہر ہے۔ جب غبارِ شوق دام ہے تو وسعتِ صحرا اس دام کا شکار ہے۔

۱۰۷۹۔ دل مدعی و دیدہ بنا مُدعیٰ علیہ ۔۔۔ نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

دیدہ بنا مُدعیٰ علیہ: کیونکہ دیدہ اپنے نظارہ سے باعثِ گرفتاریٔ دل ہوا ہے بلحاظِ تعلقِ نظارہ بروئے محبوبان روبکار کا لطف ظاہر ہے۔

۱۰۸۰۔ چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب ۔۔۔ اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

آب بر آئینہ ریزند قفائے سفری۔ (۲۵)

۱۰۸۱۔ بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر ۔۔۔ ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

بے حجاب وادیٔ مجنوں کی طرف گزر نہ کر کیونکہ یہاں ہر ذرۂ خاک کے نقاب میں دلِ بیقرار مجنوں پوشیدہ تڑپ رہا ہے۔

میر تقی: ہر ذرۂ خاک اُس کی گلی میں ہے بیقرار

یاں کونسا ستم زدہ مٹی میں مل گیا

۱۰۸۲۔ اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں ۔۔۔ طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس اپنی پناہ کے لیے جمع کر کیونکہ اَلْغَرِیْقُ یَتَشَبَّثُ بِکُلِّ حَشِیْشٍ۔ ڈوبتا ہر تنکے پر ہاتھ مارتا ہے۔

۱۰۸۳۔ دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی ۔۔۔ اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

تجھے آگاہی نہ سہی کہ اس میں کون ہے۔ تماشائے ظاہری ہی سہی، جیسے آئینہ با تصویر کو دیکھا کرتے ہیں۔ اے بے دماغ یعنی اے حواس باختہ۔ قلوب المومنین عرش اللہ تعالیٰ۔

۱۰۸۴۔ غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط — اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

عمر غفلت میں گزرتی ہے اور غالب نشاطِ زندگی کا غافلانہ ضامن ہو گیا ہے۔ اے مرگِ مفاجات اُس کی خبر کیوں نہیں لیتی۔

۱۰۸۵۔ آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

بہر دو پہلوئے حقیقت و مجاز۔ آئینۂ دل یا آئینۂ صورت تجھے کیوں نہ دوں اور ایسا تماشا کیوں نہ کروں جسے تماشا کہیں۔ دوسرا محبوب ایسا کہاں سے لاؤں جسے تجھ سا کہیں۔

۱۰۸۶۔ حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں — گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

بزم میں گلدستہ رکھتے ہیں۔ میری حسرتِ دل نے تیری بزمِ خیال میں گلدستۂ بصر بصیرت کو لا رکھا ہے جو عبارت داغِ سویدا سے ہے۔

۱۰۸۷۔ پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا — افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

کس نے اے خدا گوشِ عشق میں افسونِ انتظار پھونکا ہے(۳۶) جو مراد تمنا سے ہے۔ تمنا ملزوم اور انتظار اس کا لازم ہے۔

۱۰۸۸۔ ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں — شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

چونکہ گریہ مانعِ دیدن ہے سیلِ بے زنہارِ شوق یعنی اشک کو جسے دریا کہیں حسرتِ دیدار نے دیدۂ تر میں روک رکھا ہے۔

۱۰۸۹۔ شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے — داغِ دلِ بے درد، نظر گاہِ حیا ہے

کیونکہ دل میں فقط داغ ہو اور درد نہ ہو وہ داغ شرم و حیا کا مصداق و نظر ہے یعنی حیا اُس پر طعنہ زن ہے۔ حیا کو شبنم سے تشبیہ دی ہے۔ باعتبار عرق آلودگیِ حیا کے۔ واللہ اعلم۔

۱۰۹۰۔ دل [۱] خوں شدۂ [۲] کشمکشِ حسرتِ دیدار — آئینہ [۱] بدستِ بُتِ بدستِ حنا [۲] ہے

بدستِ بتِ بدستِ حنا نہیں بلکہ ہمارا آئینۂ دل ہے جو کشمکشِ حسرتِ دیدار سے خوں ہو گیا ہے۔ آئینے کا محبوب کے ہاتھ میں حنا ہو جانا ایک نئے رنگ کا مضمون ہے۔

۱۰۹۱۔ شعلے [۱] سے نہ ہوتی، ہوس [۲] شعلہ نے جو کی — جی [۲] کس قدر افسردگیِ دل [۱] پہ جلا ہے

ہوسِ شعلہ: یعنی جی کا جلنا افسردگیِ دل پر۔

جو کی: جو گرمی کی۔

۱۰۹۲۔ تمثال میں تری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق — آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے

آئینہ بغل کشا بصد پارگی ہے گلِ شگفتہ کی مانند تری صورت کی شوخی سے۔

۱۰۹۳۔ خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو — معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

خوے سرد مہری نے تیری ہماری تپشِ دل کو جو لازم تعشق ہے افسردہ کر دیا ہے۔ ایسی معشوقی جس میں حوصلۂ دل نوازی نہ ہو نہایت بُری ہے۔

۱۰۹۴۔ مجبوری[۱] و دعواے[۲] گرفتاریٔ اُلفت — دست[۱] تہِ سنگ آمدہ پیمانِ[۲] وفا ہے

بے دستی میں دعواے عشق بازی کر رہے ہیں ہمارا دست زیرِ سنگ جو تمثیلِ بیدستی ہے دست و پیمانِ دوستی ہو گیا ہے۔

۱۰۹۵۔ معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ — تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

معلوم ہوا کہ اُن شہیدوں کا خون شمشیرِ ستمِ قاتل سے اب تک دھویا نہ گیا تھا اور تیغِ مذکور آئینۂ تصویر نما اُن کے لیے ہو گئی ہے۔

۱۰۹۶۔ اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی — سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

عجب وقت: روزِ سیاہ۔

۱۰۹۷۔ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

باوجود گناہ کرنے کی حسرت کے ہم نے خوفِ الٰہی سے بہتیرے گناہ جو نہیں کیے اس کی بھی جزا ہمیں ملے۔

۱۰۹۸۔ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی — قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

تجلی چاہتی تھی کہ اس شکل میں آپ جلوہ گری کرے۔ زہے قسمت ترے شکلِ قد و رُخ کی کہ جس میں تجلی نے ظہور کیا۔

۱۰۹۹۔ اِک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

بناؤ: آرائشیں۔

آنکھ: چشمِ شوق۔

۱۱۰۰۔ لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اُٹھا — گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی

لڑتا ہے کہ ہمارا کُشتہ ہو کے آوازِ صور پہ کیوں اُٹھا۔ جب ہم آواز دیں تو اُٹھنا۔ صور پھونکا کرے۔

۱۱۰۱۔ آمدِ بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

پرندے آمدِ بہار میں بولنے لگتے ہیں۔

اُڑتی: ایہام۔

۱۱۰۲۔ گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

عرب ایامِ جاہلیت میں بتوں کو کعبہ شریف کے اندر بٹھا کے پوجتے تھے۔ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام جب مبعوث ہوئے تو کعبہ میں تشریف لے جا کے یہ آیت شریف پڑھ کے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا چوبِ دستی سے بتوں کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ تو بت اُوندھے منہ گرنے لگے۔ اُن میں جو صورتیں انبیا علیہم السلام کی تھیں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کو زمین میں گڑوا دیا۔ دوسرے پتلے توڑ توڑ کے آستانِ کعبہ کے پتھروں میں دیئے گئے۔

۱۱۰۳۔ گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

شکایت ضرور کی: سامع نے شکایت ضرور کی۔

۱۱۰۴۔ غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

چونکہ بودا دل ہمارا غم نہیں کھا سکتا۔ ہمیں شرابِ گل رنگ کم ہونے کا رنج بہت ہے۔ کم بہت میں تضاد ہے۔

۱۱۰۵۔ کہتے ہوئے ساقی سے، حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

اپنی دُرد خواری ساقی سے کہتے شرم آتی ہے۔ وَالّا بات یہ ہے کہ شراب صاف نہ ہو تو دُرد بھی مجھے کافی ہے۔

۱۱۰۶۔ کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

کیونکہ زہد اگر چہ ریائی نہ ہو مگر جزائے عمل کی طمع کی وجہ سے خالصتاً بھی نہ ہوا۔

۱۱۰۷۔ ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

اہلِ خرد پہ طعن ہے کہ یہ لوگ بالکل پابندِ رسم و عادتِ عوام ہو کر کس روشِ خاص پر ناز کرتے ہیں۔

۱۱۰۸۔ زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے — آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

مجھے چاہِ زمزم پہ ہی رہنے دو۔ طوفِ حرم سے مجھے کیا سروکار۔ تا اپنے جامۂ احرام کو جو بہت

آلودۂ شراب ہے دھولوں۔

۱۱۰۹۔ ہے قہر گراب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو | انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

نہ بنے بات: نہ بنے بات وصل کی۔

انکار نہیں: انکار نہیں وصل سے۔

قہر: غضب۔

ابرام: اصرار۔

۱۱۱۰۔ خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ | رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے

دنیا میں کام خونِ جگر رونے کا بہت رہ گیا ہے۔ جب سب مصیبتیں جھیل لوں تو اے موت تب آنا۔

جگر: تمام جگر۔

۱۱۱۱۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے | جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

جوشِ قدح: کثرتِ جام سے۔

۱۱۱۲۔ کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو | عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

لفظ دعوتِ مژگاں صرف برعایت بزم و مہماں ہے جو مطلع میں گزرا ورنہ زینتِ مژگاں بہتر تھا۔ لختِ جگر آرائشِ مژگاں ہے نہ (کہ) غذائے مژگاں۔

لخت لخت: پارہ پارہ۔

۱۱۱۳۔ پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم | برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

یعنی ضبطِ شورشِ دیوانگی سے جی گھبرانے لگا ہے جو کنایہ ہے گریباں نہ پھاڑنے سے۔ اب چاکِ گریباں سے جی کو آسائش ہوگی۔

۱۱۱۴۔ پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس | مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے چراغاں کرنے کے لیے۔

۱۱۱۵۔ پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق | سامانِ صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

پرسش کی جگہ لفظ چارہ یا مرہم مناسب تھا۔ عشق کی پرسش گویا جراحت مذکور پر نمک پاشی کرتا ہے۔

۱۱۱۶۔ پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل | سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

سازِ چمن طرازی: سامانِ چمن نگاری۔

۱۱۱۷۔ باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

نظارہ و خیال کا ساماں: محبوب کے نظارے و خیال کا ساماں۔ اس میں لف و نشر غیر مرتب ہے۔

۱۱۱۸۔ دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

طوافِ کوئے ملامت: وہ نکوہش و سرزنش جو کوچۂ عاشقی میں حاصل ہو۔

پندار کا صنم کدہ الخ: اپنے تکبر و خود پرستی کے بت کدے کو ڈھائے ہوئے۔

۱۱۱۹۔ پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

خریدار: معشوق۔

۱۱۲۰۔ دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

گل و لالہ کنایہ ہے۔ محبوبانِ گل و لالہ رخسار سے۔ یا نامۂ دلدار کے فقراتِ رشکِ گلزار سے جس کا ذکر مابعد ہے۔ مصرعِ ثانی حال ہے خیال کا۔ سو گلستان کے نظارہ کا ساماں گل و لالۂ مذکور کے تماشے کے لیے کیے ہوئے۔

۱۱۲۱۔ مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

ہوس: اسی کا شوقِ جلوہ گری یا آرزوئے عاشق۔

۱۱۲۲۔ چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

کسی کو: قاتل کو سامنے چاہے ہے اپنے شہید ہونے کے لیے۔ دوسرا مصرع حال ہے قاتلِ مذکور کا۔

۱۱۲۳۔ اِک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

نو بہارِ ناز کو: یارِ نازنیں کو۔ دوسرا مصرع حال ہے نو بہارِ ناز کا۔

۱۱۲۴۔ نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

مصرعِ ثانی میں تعلیل ہے یعنی کیونکہ اس بیداد کے بعد آسماں کے لیے کوئی طرزِ ستم باقی نہ رہی۔

۱۱۲۵۔ بلا سے، اگر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

بلا سے مژۂ یار خونریزی اختیار کرے۔ میری خونریزی نہ کرے۔ میں چاہتا ہوں اس رشک سے لہو روؤں اور آرائشِ مژگاں کروں۔

۱۱۲۶۔ رہا بلا میں بھی، میں مبتلائے آفتِ رشک بلائے جاں ہے ادا تیری اِک جہاں کے لیے

تیر ابلا زادۂ ادا ہو کے رشک میں دنیا بھر کے بلازدگانِ ادا کے جگر سے پار رہا۔

۱۱۲۷۔ فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے، کہ میں ہی نہیں درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

پس مجھے اُس سے نزدیک رکھ اور دوسروں کو دور رکھ۔ درازدستیِ ستم قاتل دردوسکوں کی خبر لے گی۔ مبالغہ ہے اُس کے دست دراز میں کہ بہت دور تک پہنچ جائے گا۔

۱۱۲۸۔ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے (۳۷) اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

محبوب جب اُٹھا دیں اُٹھ کے میں نے بھی قدم پاسباں کے پکڑے کہ بھید میرا اظاہر نہ کر۔

۱۱۲۹۔ بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

بیاں: بیانِ معشوق۔

۱۱۳۰۔ دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

اُسے: اضمار قبل الذکر یعنی تجمل حسین خاں کو۔ دیا ہے کا فاعل خالقِ تعالیٰ۔

۱۱۳۱۔ زمانہ عہد میں اُس کے ہے محو آرائش بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

آرائش: مراعات نام ممدوح یعنی تجمل ہے۔

۱۱۳۲۔ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

سفینہ: کشتی اور بیاض۔ ایہامی لفظ ہے۔

۱۱۳۳۔ ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

یاران: شاعران۔

تمت بالخیر

maablib.org

حواشی

(ردیف ی، ے)

۱۔ طباطبائی کے مطابق ان اعداد کے مجموعے سے سات آسمان پورے ہو جاتے ہیں۔

۲۔ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی اور دیگر کئی نسخوں میں ''کا'' ہی درج ہے جبکہ نسخۂ مہر میں ''کو'' درج ہے جو کہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں یہ مصرعہ اسی طرح درج ہے جبکہ نسخۂ عرشی میں کچھ اس طرح سے ہے ''تسکیں کو نوید کہ مرنے کی آس ہے''۔ لیکن باقی کسی بھی قدیم اور تاریخی نسخے میں یہ مصرعہ اس طرح نہیں ملتا۔

۴۔ وثوقِ صراحت میں یہاں ''سپ'' درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی اور دوسرے کئی نسخوں میں یہاں ''سپ'' کی جگہ ''تپ'' درج ہے جو ''سپ'' کا ہی ہم معنی ہے۔ یہاں تصحیح کر دی گئی ہے۔

۵۔ وثوقِ صراحت میں ''بجھتی ہے'' درج ہے۔ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی اور دیگر کئی نسخوں میں یہاں ''بجھتی'' کی جگہ ''بجھتے'' ہے اور یہی درست ہے۔ لہٰذا درست کر دی گئی ہے۔

۶۔ وثوقِ صراحت میں ''تہمتِ گل'' درج کیا گیا ہے، جبکہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں ''نکہتِ گل'' درج ہے۔ تصحیح کر دی گئی ہے۔

۷۔ ترجمہ: ''شاعروں کی بے پرکی سے تو خدا کی پناہ۔''

۸۔ نسخۂ حمیدیہ طبعِ اول میں ''اے'' کی جگہ ''او'' چھپا ہے۔ لیکن اور کسی بھی قدیم نسخے میں ''او'' نہیں چھپا۔ نسخۂ انجمن میں بھی ''اے'' ہی ہے۔

۹۔ بیشتر نسخوں میں یہ شعر اسی طرح درج ہے۔ لیکن نسخۂ حمیدیہ طبعِ اول میں ''سرونشاط بہار سے'' درج ہے جو صریحاً غلط ہے۔ ایک آدھ قدیم نسخے میں نیز نسخۂ عرشی، نسخۂ مہر اور نسخۂ مالک رام میں یہ شعر کچھ اس طرح سے ملتا ہے۔

بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے ۔۔۔ مینائے مے ہے سرو نشاطِ بہار سے

۱۰۔ وثوقِ صراحت میں یہاں قدیم اردو املا کے مصداق ''پہونچنا'' درج ہے جس کو آج کے اردو املا کے مطابق ''پہنچنا'' کر دیا ہے۔

۱۱۔ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں "کی" ہی درج ہے جبکہ نسخۂ طباطبائی میں "کی" کی جگہ "کے" درج ہے۔

۱۲۔ وو بمعنی وہ۔

۱۳۔ نسخۂ مہر میں غالباً سہو کاتب سے "پس مردن" چھپا ہے۔ باقی قدیم اور جدید نسخوں میں "پس از مردن" ہی ملتا ہے۔

۱۴۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "اپنے" درج ہے۔ جب کہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ مہر میں "اپنی" درج ہے۔ جس کے مطابق اصلاح کر دی گئی ہے۔

۱۵۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کے" درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن اور کئی دوسرے نسخوں میں یہاں "کی" درج ہے۔ لہٰذا تصحیح کر دی گئی ہے۔

۱۶۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "یاں" درج ہے جس کی تائید نسخۂ نظامی سے ہوتی ہے۔ جبکہ نسخۂ انجمن میں "یاں" کی جگہ "ہاں" درج ہے۔

۱۷۔ "غنچۂ گل" کی جگہ بعض مؤقر نسخوں میں "غنچۂ گل" اور "غنچۂ دل" بھی چھپا ہے۔ اسے سہو کتابت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

۱۸۔ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی، نسخۂ طباطبائی، نسخۂ حسرت موہانی اور متعدد نسخوں میں "دلِ نالاں" ہی چھپا ہے۔ جبکہ نسخۂ عرشی اور نسخۂ مالک رام میں "دلِ ناداں" چھپا ہے۔ مضمونِ شعر یہاں "دلِ نالاں" سے ہی خطاب کا متقاضی ہے۔

۱۹۔ "شاہزادہ" مراد "شہزادہ"۔

۲۰۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "ہے" درج تھا جسے نسخۂ انجمن کے مطابق "ہی" کر دیا گیا ہے۔

۲۱۔ بعض فاضل مرتبین نے "سے ہی" کو قابلِ اعتراض بنا کر اپنے نسخوں میں اسے "ہی سے" بنا دیا۔ واضح رہے کہ غالب کا یہاں اصرار "آنکھ" پر نہیں "آنکھ سے ٹپکنے" پر ہے۔

۲۲۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "تپ" درج ہے جبکہ نسخۂ انجمن میں یہاں "تپ" درج ہے لہٰذا تصحیح کر دی گئی ہے۔

۲۳۔ وثوقِ صراحت میں یہاں قدیم املا میں یائے معروف اور یائے مجہول کا فرق نہ ہونے کے باعث "ضبط کی اندازی" چھپا تھا۔ جسے نسخۂ انجمن کے مطابق "ضبط کے اندازے" کر دیا گیا ہے۔

۲۴۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "معشوقِ شوق" درج تھا۔ جبکہ نسخۂ انجمن، نسخۂ نظامی اور دوسرے کئی نسخوں میں یہاں "معشوقِ شوخ" درج ہے۔ درستی کر دی گئی ہے۔

۲۵۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کی" درج تھا جسے نسخۂ انجمن کے مطابق "کے" کر دیا گیا ہے۔

۲۶۔ "لی" اور "نی" لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ قدیم نسخوں میں یائے معروف و یائے مجہول کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ اب اس کو تبدیل کر کے "لے" اور "نے" کر دیا گیا ہے۔

۲۷۔ شرح میں درج کی گئی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ: "شہد جو اُن (مگس) کے پیٹ سے نکلتا ہے اُس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے۔"

۲۸۔ "ابجد" علم الاعداد سے ہے۔ جس کے اعداد کچھ اس طرح سے ہیں۔ الف = ۱، ب = ۲، ج = ۳، د = ۴۔

۲۹۔ بالکل اسی طرح سے "ضظغ" بھی علم الاعداد سے ہے۔ جس کے اعداد کچھ اس طرح سے ہیں۔ ض = ۸۰۰، ظ = ۹۰۰، غ = ۱۰۰۰۔

۳۰۔ "منصور حلاج" تاریخ کی وہ نمایاں شخصیت جس کو "انا الحق" کا نعرہ لگانے پر تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

۳۱۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کھنچا" درج ہے جسے نسخۂ انجمن کے مصداق "کھینچا" کر دیا گیا ہے۔

۳۲۔ نسخۂ عرشی اور بعض دیگر موقر نسخوں میں یہاں "شورشِ" چھپا ہے۔ غالب نے یقیناً "سوزشِ باطن" ہی کہا ہوگا۔ کیونکہ احباب اس کے لب ہائے خندہ کو دیکھ کر اُس کے غمِ پنہاں کا انکار کرتے ہیں۔ "خندہ آشنا" لبوں کا تقابل "سوزشِ باطن" سے ہو سکتا ہے۔ نیز یہ کہ نسخۂ انجمن اور نسخۂ نظامی میں بھی سوزشِ باطن ہی چھپا ہے۔

۳۳۔ وثوقِ صراحت میں یہاں "کر" تھا جسے نسخۂ انجمن کے مطابق "گر" کر دیا گیا ہے۔

۳۴۔ ترجمہ: تیز ہوا جلتے چراغ کو بجھا دیتی ہے۔

۳۵۔ یہ فارسی ضرب المثل ہے۔ جس کے مطابق قدیم ایران میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی سفر کو جاتا تو آئینے پر سبز پتے رکھ کر پانی ڈالتے تھے اور خیریت سے واپس آنے کا شگون لیتے تھے۔

۳۶۔ وثوقِ صراحت میں یہاں قدیم املا کے مطابق "پہونکا" لکھا گیا تھا جس کو "پھونکا" کر دیا گیا ہے۔

۳۷۔ وثوقِ صراحت میں یہ مصرعہ کچھ اس طرح سے لکھا گیا تھا "گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے"۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ شعر نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ نظامی اور دوسرے متعدد نسخوں میں ایک ہی طور مہمل چھپا ہے۔ جبکہ نسخۂ انجمن میں یہ مصرع درست چھپا ہے اس طرح سے "گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے"۔ وثوقِ صراحت میں تصحیح کر دی گئی ہے۔

شرحِ بعض ابیاتِ قصائد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سازِ یک ذرہ[۱] نہیں فیضِ چمن سے بیکار　　سایۂ[۱] لالۂ بیداغ سویدائے بہار

سامان ذرہ بھر کا فیضِ نشو نمائے چمن سے بیکار نہیں۔

یہ دعوئ ہوا۔ دلیل اس کی لالۂ بے داغ کا سایہ۔ باآنکہ سایہ کو ثبات و قرار نہیں فیضِ مذکور سے قرار پذیر ہو کے دل بہار کا سویدا بن جاتا ہے۔

۲۔ مستیٔ بادِ صبا سے ہے، بہ عرضِ سبزہ　　ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

پہنائے سبزہ میں اثرِ مستیٔ صبا سے جوہرِ تیغِ کہسار ریزہ ہائے شیشۂ شکستۂ شراب ہو گئے ہیں۔

تیغِ کوہ: بلندیٔ کوہ۔ عرض و جوہر یہاں ایہام متناسب ہے۔

۳۔ مستیٔ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت　　کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

مستیٔ ابر کو دیکھ کے حسرت نظارہ طرب اندوز ہے کہ آغوشِ کشادۂ ابر میں دو عالم کے معشوقوں کو ایک جگہ فشار دینا ممکن ہے۔

۴۔ کوہ و صحرا ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل　　راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

معموری: معمورہ (نسخہ)۔

راہ خوابیدہ: راہ دور و دراز و ہموار۔

۵۔ کاٹ کر پھینکئے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال　　قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

ناخنِ بریدہ ہلالیت سے بدریت کو پہنچ جائے۔

۶۔ کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز　　دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

طاؤس شکار: بلحاظ سبز ہونے شراروں کے فیضِ ہوا سے۔

۷۔ میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی　　بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

قدحِ مذکور بہ اثرِ ہوا گلِ گلاب ہو جائے گا۔

قصیدہ

۸۔ ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام — ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جہاں: جس جگہ۔

۹۔ نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رُتبہ کہ رہے — ابداً پُشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

نسبتِ نام یعنی ابوتراب۔

یہ رتبہ: زمیں کو یہ رتبہ۔

۱۰۔ بُرشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا — قطع ہو جائے نہ سررشتۂ ایجاد کہیں

قطع ہو جائے: چرچے سے بُرشِ مذکور کے قطع ہو جائے۔

۱۱۔ کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے — رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

ٹوٹے: شکستہ ہو جائے۔

۱۲۔ کس سے ممکن ہے تیری [۱] مدح [۲] بغیر از واجب — شعلۂ [۲] شمع مگر شمع [۱] پہ باندھے آئیں

۱۳۔ غمِ شبیرؓ سے ہو سینہ یہاں تک لبریز — کہ رہیں خونِ جگر سے میری آنکھیں رنگیں

تبدیلِ مصرعِ ثانی از والہ غفر لہ:

ع کہ رہیں صورتِ مقتل مری آنکھیں رنگیں

یا

ع کہ رہیں صورتِ مشہد مری آنکھیں رنگیں

۱۴۔ دلِ اُلفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

توحید: بلا اضافت۔

۱۵۔ صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ و دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

احباب: بغیر اضافت کے۔

غزل

۱۶۔ اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

تبدیل مصرع اول از والد غفرلہ

ع نقد ہے مجھ کو اُس قدح کا دور

تمت بالخیر

خاتمۃ الطبع

الحمد للہ تعالیٰ وتقدس والمنۃ للہ عزوجل کہ ایں شرح دیوانِ اردوے شاعر نازک خیال صاحب کمال بلند پایہ اوفر سرمایہ میرزا غالب دہلوی رحمۃ اللہ مصنفہ فخر الشارحین زبدۃ الکاملین اُستاد قیامت بنیاد سخن فہم واقعی حضرت مولانا مولوی شیخ محمد عبد العلی المتخلص بہ والہ الدکنی المدراسی المولد الحیدر آبادی المسکن والمدفن رحمۃ اللہ علیہ وقدس اللہ سرہ بعد رب المشرق والمغرب بجد وجہد بلیغ شاعر ادیب صاحب الفضائل والمناقب مولوی محمد عبد الواجد صاحب جزاہ اللہ الواہب خلف الصدق حضرت شارح مرحوم ومغفور بحسب وصیت حضرت شارح مغفور ومبرور بنابر افادۂ طلبۂ علم ادب بحلیہ طبع مزین گردید وبزیور خاتمہ آراستہ گشتہ بمنصہ ظہور رسید امید کہ مقبول خواطر خواص وعوام شواد۔

تواریخ

قطعہ تاریخ ختم ایں شرح بزبانِ فارسی از افکار گوہر بار سر آمد تاریخ گویاں زماں سخن گوئی سخندان شاعر طباع شیریں بیاں کہنہ مشاق علم وفن والا مناصب عالی مناقب حضرت مولانا مولوی محمد عبد الحیٔ صاحب المتخلص بہ وصف مددگار پیشکش وبندوبست علاقہ سرکار عالی مدظلہ

مولوی عبد العلی والہ تخلص — اُستاد وعم من فخر الاماثل

در فصاحت برتر از حسان بن ثابت — در بلاغت بہتر از سحبانِ وائل

خاک راہ اوج فکرش کاخ گردوں — خانہ زاد بحر طبعش ابر باطل

طوطیان را قند در منقار ریزد ای فدائے یک نوالش صد عنادل
تا نوشتہ شرح بر دیوانِ غالب آیتِ تحسین ز گردوں گشت نازل
طرفہ شرحی کز سطور خویشتن ہمچو نخل طور افروزد مشاعل
چشم پوشیدن ز رویش نیست آساں دل گرفتن از کفش خیلی است مشکل
از حنائے خاتمہ تا گشت رنگیں حرف او شد سبز اندر دیدہ و دل

وصف روشن طبع گفتا سال ختمش
انشراح دل بود ز ایں شرح حاصل

۱۳۱۱ہجری

قطعہ تاریخ

آغاز طبع از افکار لآلی بار آشنائے اسرار جلی و خفی جناب
میرزا محمد تقی صاحب المتخلص بہ تقی دام لطفہ

اے تقی طبع ہوئی حضرت والہ کی وہ شرح جس کے سب اہلِ سخن تھے بدل و جاں طالب
طبع کا سال لکھا میں نے یہ منقوطہ میں "للہ الحمد ہوئی شرح کلامِ غالبؔ"

۱۳۱۲ہجری

وَلَہٗ قطعہ تاریخ انجام طبع

جب شرح جناب والہ سے غالب کا ہوا شہرہ یکسر
تاریخ کہی میں نے بھی تقی جو یادگار رہے گی تا محشر
لکھ ڈالیں مکرر تیرہ کو بس اس مصرع میں سن ہے مضمر

۱۳۱۳ھ

دستورِ عمل تاریخ کا ہے سر مشق مؤرخ سمجھیں اگر
ہر ایک صدی میں بے وقت لکھ سکتے ہیں تاریخ اکثر

قطعات تواریخ

از افکار گوہر بار شاعر خوش فکر سخن فہم ستودہ مناقب جناب مولوی سید
عبدالصمد صاحب واصفی تخلص حیدر آبادی عبہ حضرت مولانا واصف
مرحوم تلمیذ عالی جناب فیض مآب نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی

کی شرح آپ نے کیا اچھی جناب والا　　اہلِ سخن ہیں جس کے سب چشم و دل سے طالب
اے واصفی یہ کہہ دو تاریخ صاف تم بھی　　آئینہ بن گیا اب گویا کلامِ غالب

۱۳۱۴ھ

کیا اس سے بڑھ کے ہوگی مضمون کی صراحت　　پوشیدہ جس قدر تھے سب کھل گئے مطالب
اے واصفی کہا ہے میں نے یہ عیسوی سن　　طیار ہو گئی اب شرح کلامِ غالب

۱۸۹۶ء

تواریخ

از کلام معجز نظام شاعر ادیب ماہر لبیب ستودہ مناقب
جناب مولوی محمد عبدالواجد صاحب فرزند و شاگرد حضرت
شارح مرحوم و مدرس فارسی مدرسہ کلاں انگریزی بلدہ علاقہ
سرکار عالی

رباعی در تاریخ اختتام ایں شرح

واجد بہ سخنوراں چنیں دادہ نوید　　کایں شرح جناب والہا گشتہ پدید
افزونی از آنجا چو برون رفتہ سخن　　گو مختصر مفید از روے امید

۱۳۱۱ھ

قطعہ اول ایضاً در تاریخ اختتام

چوں نوشتہ قبلگاہی شرح بر دیوانِ غالب　　یافت از روے جملہ مضمون ہاے پنہانی عیانی
گوہر سن بعد اتمامش چنیں سفتہ دل من　　موشگافیہاے فکر قبلگہ بحر معانی

۱۳۱۱ھ

قطعہ دوم در تاریخ آغاز طبع

افلاک ہم بریں حل انجم نثار کردند | از نہ فلک ملایک گفتند سر بسر زد
از اہلِ شعر واجد در محفلی کہ خواند | یابند فیض از روے ہم کہ زبزم وہم سہ
آغاز طبعِ را سن پروانۂ دلم گفت | بین شمع رہنما در شرح جناب والہ

۱۳۱۲ھ

قطعات در تاریخ انجام طبع

قطعہ سوم

ز ارباب نظر ہر کس کہ دیدش | بود ایں شرح یا باغ و چمن گفت
سن طبعش چو پرسیدم ز واجد | فرح افزاے ارواح سخن گفت

۱۳۱۳ھ

قطعہ چہارم

بیاد دارو بخواں کتاب را واجد | زراہ صدق کہ فخر حسب بود ایں شرح
ازانکہ زادۂ طبع جناب والہ ہست | بس بزرگ ز روی نسب بود ایں شرح
چگونہ شاد نشد روح میرزا نوشہ | بحسن حل معاصر عجب بود ایں شرح
بعدرس سنہ روح القدس رسید و بگفت | مفید طالب علم ادب بود ایں شرح

۱۳۱۳ھ

قطعہ پنجم

قبلگاہی حضرت عبدالعلی نامور | آنکہ اقلیم سخن را بود زیبا شہریار
ہر قدر مدحش کنی اے دل تو در علم ادب | نزد ارباب خرد با شدکی از صد ہزار
راست میگویم کہ مثلش ماہر علم و ادب | ہم سخنور ہم محقق بودہ کم در روزگار
شاہد فضل و کمال او چہ میخواہی دگر | میکند تصدیق او ہر یک ادیب ذی وقار
او ستادی در سخن اور اسلم آمد ست | فخر بروے میکند خوش استاد و افتخار

چاپ شد ایں شرح بر غالب کہ از تصنیف اوست   زانکہ ہر کس طالبش بود از صغار و ہم کبار
چوں شدم سائل ز واجد سال جاں افزاش را   گفت دل مقصود قایل شد ازیں حل آشکار

۱۳۱۳ھ

قطعہ ششم

مولائے بندہ حضرت والہ ادیب فحل   یکتا ز راہ حق و یقیں بود در فنش
شد چاپ شرح دلکش اردوے آنجناب   شد نقش مطلب اسد اللہ خاں سخنش

۱۳۱۳ھ

قطعہ ہفتم

حضرت والہ و الا گوہر   شرح غالب چو نوشتہ اوّل
زانکہ حلّال دقایق او بود   عالمی یافتہ فیض از ایں حل
صاحب شعر و سخن بود بلے   یافت ایں رتبہ ز فیاض ازل
ہاں ہمدانی کہ جناب طوبیٰ   آنکہ در فضل بلاشک افضل
آنکہ دانشور و ہم اہلِ زباں   آنکہ نازاں بدرش علم و عمل
آنکہ مے آمد اگر مے آمد   علم را نیز رسوے بمثل
آنکہ مدحش بنود طاقتِ من   زانکہ او فخر حکیمان اجل
آنکہ چشمِ عرب و چشمِ عجم   سر بسر خاک درش را مکحل
چہ قدر وصف کلامش کردہ   کردہ مدحش چہ قدر مستعمل
بی طمع بی غرض و بی آزی   دور از ریب و مبرّا ز خلل
حاسدے گر بزند رنگ حسد   رائے آقاست برنگو صیقل
ہر کرا درد سر رشک بود   رائش از بہر صداعش صندل
ایں ہمہ از پے آں کردہ رقم   کہ بود ذات شریفش اعدل
سال ایں حل طلبیدم چو شدہ   چاپ از فضلِ خدا عزو جل
بندۂ ناقصِ واجد گفتا   شرح استاد محقق اکمل

۱۳۱۳ھ

قطعہ ہشتم

واجد تو بیا سیر کن ایں شرح نوی را ‏ ‏ ہر معنیٔ چوں خار دریں جا شدہ گلشن
چوں طالب ایں شرح نکو پیر دو جواں بود ‏ ‏ زا نروے ضروری شدہ اش چاپ نمودن
در فخر نظامی کہ بود فخر مطابع ‏ ‏ شد طبع بصد صحت و ہم با خط روشن
ایں مصرع برجستہ سن و صدق عیاں کرد ‏ ‏ ایں شرح بود از رہ انصاف مبرہن

۱۳۱۳ھ

قطعہ نہم

حضرت عبدالعلی عالی نسب ‏ ‏ در حسب استاد فن فخر زمن
در سخن گمنام بودہ پیش ازو ‏ ‏ گشتہ ازوے نامور ملک رکن
بسکہ دارد آب و تاب دلفروز ‏ ‏ لفظ او گویا بود دُرِّ عدن
بگوراز جُہال بد طینت کہ خوب ‏ ‏ می شناسد رتبہ اش صاحب سخن
در دیار روم و ایراں اے خدا ‏ ‏ باد او مشہور چوں اندر وطن
شرح بر دیوانِ غالب چوں نگاشت ‏ ‏ حل مشکل گشتہ بروجہ حسن
نیست ایں شرح لغات و لفظ ہا ‏ ‏ ہست ایں شرح غوامض جان من
ایں غوامض راند اندہر کسے ‏ ‏ جز کسے کو عمر کردہ وقف فن
ایں بتان معنی زیبائے او ‏ ‏ می پرستد گر شناسد برہمن
چاپ شد ایں شرح و واجد سن نوشت ‏ ‏ عالم تحقیق شمع انجمن

۱۳۱۳ھ

قطعہ دہم

حضرت والہ کہ از و فیض رسیدہ بجہاں ‏ ‏ مغفرت وافر حق باد ابر مدفن او
شرح چنیں مختصر و نفع رساں کردہ رقم ‏ ‏ فیض و کرم معدن اُو علم و ہنر مخزن او

شاعر و شارح ہمہ دان رتبہ بر دوست عیاں
شعر حسیں است و نکو شرح بود احسن او

دل سنہ چاپہ آں کردہ طلب چرخ بگفت
شاعری و شارحی اہلِ معانی سن او

۱۳۱۳ھ

قطعہ یازدہم

ہر کہ در گوش کردہ ایں حل را
جلوہ گر گشتہ بر لب او وہ

فہم آمد بہ بزم سال و بگفت
شرح دیوان میرزا نوشتہ

۱۳۱۳ھ

قطعہ دوازدہم بزبانِ اُردو

حل کلامِ غالب مرحوم کا دشوار تھا
کیونکہ مرزا کی تراشیں اور مضامیں ہیں نئے

لیکن اب مشکل نہیں ہیں کیونکہ اس پر لکھ دیے
قبلہ گاہی حضرتِ والہ نے عمدہ حاشیے

چھپ گئی یہ شرح میری کوشش اور محنت سے اب
فضل سے انجام کو پہنچا دیا اللہ نے

چشمِ بد کو کور کر دو اور سُن لو ہم سے سَن
مژدہ اور دل مشکلیں حل ہو گئیں اس شرح سے

۱۳۱۳ھ

قطعہ سیزدہم بزبانِ اُردو

چھپ گئی یہ شرح دلکش جس میں ہے حل دقائق
اور جس کا دشمن اور اختر میں چرچا ہو گیا ہے

سالِ طبع اس کا ادب کہتا ہے اپنے دل سے واجد
حل کلامِ غالبؔ دہلی کا زیبا ہو گیا

۱۳۱۳ھ

تمت بالخیر

maablib.org

فرہنگ

(آ)

آبِ بر جا ماندہ: پانی جو ایک جگہ ٹھہر جائے۔

آبِ بقا: آبِ حیات۔

آب دار: چمک دار۔

آبِ زندگانی: مراد آبِ حیات۔

آبگینہ: نازک شیشہ جو سجاوٹ کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔

آبلہ پا: جس کے پیروں میں چھالے پڑے ہوں۔

آتشِ نفس: یہ نفس یا ایسی آواز جو دل میں سوز و گداز پیدا کردے۔

آذر فشاں: جوش فشاں۔

آرائش: سنگھار، سجاوٹ۔

آرمیدگی: آرام طلبی۔

آزار: تکلیف۔

آشفتہ سر: دیوانہ

آشفتگی: دیوانگی۔

آشوب: مصیبت۔

آغوشِ بلا: مصیبتوں کی گود۔

آغوشِ وداع: رخصت ہوتے وقت بغلگیر ہونا۔

آن کجا و ایں کجا: وہ کہاں اور یہ کہاں۔

آنکھیں مُندنا: آنکھیں بند ہونا۔

آئینہ پرداز: جلوہ گر

(الف)

ابرام: اصرار، ضد۔

اجابت: قبول۔

اجساد: جسد کی جمع۔

اجلِ موعود: موت جس کا وعدہ ہے۔

اختلاط: ملنا، مراد محبت کرنا۔

اخفا: چھپا ہونا۔

ارباب: دوست۔

اربابِ چمن: چمن کی مناسبت سے درخت، پودے، پھول وغیرہ۔

ارم: جنت۔

استغنا: بے نیازی۔

استوار: مضبوط۔

اظہر: واضح۔

اعجاز: معجزہ۔

اعجازِ مسیحا: مراد حضرت عیسیٰ۔ جن کا معجزہ مردوں کو زندہ کرنا اور بیماروں کو تندرست کرنا تھا۔

افشردۂ انگور: انگور سے نچوڑی گئی شراب۔

اقلیم: دیار، سلطنت۔

الاماں: خدا کی پناہ۔

التفات: توجہ، محبت۔

التہاب: گرمی۔

التیامِ زخم: زخم کے مندمل ہونے تک۔

الماس: قیمتی پتھر۔

انا البحر: میں دریا ہوں۔

انجمن: محفل۔

اندوہ: دکھ، رنج۔

اندوہ رُبا: غم دور کرنے والا۔

انفعال: دوسرے کا اثر قبول کرنا۔

انگبیں: شہد۔

اوج: بلندی۔

اُردی: ماہِ بہار۔

اورنگ: تخت۔

اورنگِ سلیماں: حضرت سلیماںؑ کا تخت۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہوا میں اُڑا کرتا تھا۔

اوک: چُلّو۔

اہتزاز: خوشی سے جھومنا۔

اہلِ بینش: اہلِ نظر۔

ایاغ: جامِ شراب۔ جس پر شراب ماپنے کے لیے خطوط کھینچے گئے ہوں۔

ایامِ طفلی: بچپن میں۔

ایک، دو، چار: 7=4+2+1 یعنی سات آسمان۔

ایما: اشارہ۔

(ب)

بادہ: شراب

بار: وزن۔

باربد: ایک مشہور ایرانی گویے کا نام۔ جو شاہ ایران کا درباری گویا تھا۔ غالب کے ہاں اس سے مراد مطرب ہے۔

بازیچۂ اطفال: بچوں کا کھیل۔

بازیچۂ طفلاں: بچوں کا کھیل۔

باطل: جھوٹا۔

باغِ شگفتہ: سرسبز و شاداب باغ۔

بالش: تکیہ۔

بال کشا: پر کھولے ہوئے، پرواز کرتے ہوئے۔

بالِ ہما: ایک مشہور پرندے ہما کا پر۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جس شخص کے اُوپر سے گزر جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

بتِ آئینہ سیما: وہ محبوب جس کی پیشانی آئینہ کی مانند روشن ہو۔

بحیلۂ دوستی: دوستی کے بہانے۔

بختِ رسا: خوش قسمت۔

بخونِ غلطیدن: خون میں تڑپنا۔

بخونِ غلطیدہ: خوں شدہ۔

بُن: جڑ۔

بُنِ مُو: بال کی جڑ۔

برات: وہ کاغذ یا فرمان جس کی رو سے خزانے سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔

برائے شش جہت: چھ اطراف یعنی زمین، آسمان، شمال، جنوب، مشرق، مغرب۔

برد: سردی۔

بر سبیلِ شکایت: بطور شکایت۔

برش: کاٹ، تیزی۔

برق: بجلی۔

برق خرام: برق رفتار۔

برگشتہ: پھرا ہوا۔

برنگِ دگر: دوسرے طریقے سے۔

برہمن: پنڈت۔

بزم قدح: بزم شراب۔

بساط: فرش۔

بسمل: زخم خوردہ کی تڑپ۔

بطِ مے: شراب کی صراحی۔

بُعد: دوری۔

بقدر: اپنی طاقت، بساط یا استعداد کے مطابق۔

بوالہوس: ہوس پرست۔

بودا: کمزور۔

بہشت شمائل: بہشت خصلت یا فردوس منظر محبوب۔

بہ فیضِ بیدلی: نا اُمیدی کی بدولت۔

بیاباں: صحرا۔

بیاباں ماندگی: صحرا میں بھٹکنے کی تھکان۔

بے حجابی: بے پردگی۔

بیش از یک نفس: دم بھر سے زیادہ۔

بے صرفہ: بے فائدہ۔

بیضۂ مور: چیونٹی کا انڈا، بہت حقیر یا چھوٹی سی چیز۔

بیکراں: جس کا کوئی کنارا نہ ہو۔

بیم: خوف۔

بے مہری: سنگدلی۔

بینندہ: مصدر دیدن سے ہے۔ بیں۔ بیند۔ بینندہ یعنی دیکھنے والا۔

(پ)

پابوسی: پیر چومنا۔

پا بہ حنا: سست رفتار۔

پاداش: سزا۔

پا بہ دامنِ عزلت: تنہائی کا گوشہ نشیں۔

پارۂ دل: دل کا ٹکڑا۔

پاشنہ: ایڑھی۔

پانو، پانوں: قدیم املا، مراد پاؤں۔

پاؤں پڑنا: عاجزی کرنا۔

پائے افگار: زخمی یا جلے ہوئے پاؤں۔

پائے سخن: سلسلۂ گفتگو۔

پائے طاؤس: مور کے پاؤں۔

پائیں: مراد پاؤں۔

پدرود: رخصتی۔

پدیدار: نمودار۔

پرافشاں: پر جھاڑتا ہوا، پر پھڑ پھڑاتا ہوا۔

پرتو: عکس۔

پُرکاری: چالاکی۔

پرنیاں: حریر، ریشم، ایک قسم کا ریشمی کپڑا۔

پری پیکر: حسین محبوب۔

پنبہ: روئی۔

پنبۂ بالش: تکیے کی روئی۔

پندار: غرور، خودداری۔

پیدائی: ظہور۔

پیرِ کنعاں: حضرت یوسفؑ کے والد حضرت یعقوبؑ جو کنعاں کے رہنے والے تھے۔

پیرہن: لباس۔

پیغارہ جو: طعنہ زن۔

پیکاں: تیر۔

پیوند: علاقہ، تعلق، جوڑ۔

بجائے: بجائے۔

بجائے نذرِ کرم: بخششِ الٰہی کو نذر کردینے کے لیے۔

پے بہ پے: پے در پے۔

(ت)

تارِ شعاع: وہ سفید خط جو غروبِ آفتاب کے بعد اور طلوعِ آفتاب سے پہلے آسمان پر چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ اسے قرنی الشمس بھی کہا جاتا ہے۔

تا کجا: کہاں تک۔

تبسم: ہنسی۔

تپ: بخار، گرمی۔

تاک: انگور۔

تالیف: مرتب۔

تجاہل: جان بوجھ کر انجان بننا، غفلت برتنا۔

تجلی: جلوہ۔

تحیت: دُعا۔

تحیر: حیرت۔

تدرو: چکور۔

تراوش: ٹپکنا، ظاہر ہونا۔

تربت: قبر۔

تشنہ کامی: پیاس۔

تغافل: غفلت۔

تفِ نالہ: نالہ کی حدت و گرمی۔

تقصیر: قصور۔

تکلف: بناوٹ۔

تمثال دار: عکس پیدا کرنے والا۔

تمثالِ شیریں: شیریں کی تصویر۔

تمکیں: ضبط، خودداری۔

تمکیں آزما: صبر آزما۔

تنک آبی: پانی کا کم ہونا۔

تنک ظرفی: تنگ ظرفی۔

توسن: گھوڑا۔

توفیرِ درد: درد زیادہ کرنا۔

تہدید: تنبیہ

تہی: خالی۔

تیشہ: کلہاڑی۔

تیغِ دودم: دودھاری تلوار۔

(ج)

جادہ: رستہ۔

جادۂ رہ: جس راستے سے لوگ گزرتے ہیں وہاں قدموں سے ایک لکیر پڑ جاتی ہے جسے لیک بھی کہتے ہیں۔

جامِ جم: ایران کے مشہور بادشاہ جمشید کا پیالہ جس پر ہندی خطوط اور شکلیں بنی ہوئی تھیں، کہتے ہیں کہ ان خطوط سے آئندہ کا حال بتایا جا سکتا تھا اور ساتھ ساتھ احوالِ عالم کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ اسے جامِ جہاں نما اور ساغرِ جم بھی کہتے ہیں۔

جامِ سفال: مٹی کا پیالہ۔

جامِ واژگوں: اوندھے جام۔

جامۂ غوک: مینڈک کا لباس۔

جاں گداز: جاں کو تکلیف دینے والا۔

جاں سپاری: جان دینا۔

جاں گسل: جاں کو گھلا دینے والا۔

جراحت: زخم۔

جراحتِ دل: دل کا زخم۔

جگرداری: استقلال۔

جلوہ ریزیٔ باد: ہوا کا چلنا۔

جلوۂ گل: خوبصورت پھولوں کا نظارہ۔

جمالِ دل فروز: دل کو روشن کرنے والا جمال یا حسن۔

جنبش: حرکت۔

جوسی: لفظ جوتشی کی قدیم صورت جوسی ہے مراد نجومی۔

جوشِ بادہ: شراب کا جوش۔

جولاں: گھوڑے کا دوڑانا۔

جولانِ صبا: صبا کے راستے کی گرد۔

جویا: تلاش کرنے والا۔

جوئے خوں: اشکِ خونیں، دریائے خوں۔

جوئے عسل: جنت میں شہد کی نہر۔

جیب: گریباں۔

(چ)

چرچا: شہرہ۔

چرخ: آسمان۔

چشم ما روشن دلِ ما شاد: ہماری آنکھیں روشن ہوئیں اور دل خوشی سے بھر گیا۔ خوشی کے موقع پر بولتے ہیں۔

چشمک: اشارۂ چشم۔

چکِ روزی: روزی کا چکر۔

چنگ و رباب: آلاتِ موسیقی۔

چینِ جبیں: تیوری۔

(ح)

حجرہ: تنگ و تاریک کوٹھڑی۔

حدیث: بات۔

حذر کرنا: ڈرنا، پرہیز کرنا۔

حورانِ خُلد: جنت کی حوریں۔

حسرت سنج: حسرت زدہ۔

حسنِ ظن: خوش گمانی۔

حکایت: قصہ کہانی۔

حلقۂ بیرونِ در: دروازے سے باہر کی زنجیر کا حلقہ، مراد دروازے سے اندر آنے کی اجازت کا نہ ہونا۔

حمزہ: امیر حمزہ، مرکزی کردار داستانِ امیر حمزہ۔

حنا: مہندی۔

حوادث: حادثات کی جمع۔

حیف: افسوس۔

(خ)

خاتم: نگینہ، انگوٹھی۔ عام طور پر وہ انگوٹھی جس پر نام کندہ ہو۔

خاشاک: گھاس پھوس۔

خانہ زاد: غلام۔

خانۂ ویراں سازی: گھر کا ویراں کرنا، گھر کا اُجاڑنا۔

خرابات: شراب خانہ۔

خرقہ: گوڈری، لباسِ فقراء۔

خرمن: اناج کا ڈھیر۔

خجالت: شرمندگی۔

خجلتِ تقصیر: ارتکابِ قصور سے جھجکنا۔

خس: تنکا۔

خِست: کنجوسی۔

خِشت: اینٹ۔

خُلد: جنت۔

خُم: شراب کا مٹکا۔

خمار: نشہ اترنا۔

خمِ کاکل: زلف کا پیچ و بل۔

خمکدہ: میخانہ۔

خمیازہ: جمائی، انگڑائی، نشہ اترنے کی حالت۔

خو: عادت۔

خوب رو: خوبصورت چہرے والے۔

خورشید: سورج۔

خوں بہا: فدیہ، قیمتِ خوں۔

خونناب: خالص خون۔

خیاباں: پھولوں کی کیاری۔

خیر باد: خدا حافظ۔

(د)

داد: شاباشی۔

داد و ستد: لین دین۔

دارندہ: رکھنے والا۔

دام: جال۔

دانتوں میں تنکا لینا: عاجزی و فروتنی برتنا۔

دائم الحبس: ہمیشہ کے لیے قید۔

دبستاں: مدرسہ، مکتب۔

دجلہ: دریا۔

درباں: محافظ، نگراں۔

درِ تشنگیٔ مردگاں: وہ لوگ جو آرزوے شوق میں مر گئے۔

درخور: قابل۔

درخورِ عرض: اظہار کے قابل۔

درخورِ محفل: محفل کے قابل۔

دُردِ تہِ جام: شراب کی تلچھٹ۔

دُردی کش: تلچھٹ پینے والے۔

درِ قفائے خندہ: کھل جانے کے بعد۔

دریائے معاصی: گناہوں کا دریا۔

دشنام: گالی۔

دشنہ: خنجر۔

دعویٔ وارستگی: دعویٔ آزادی۔

دفترِ امکاں: دنیا۔

دل آزردگاں: دکھی دل لوگ۔

دلبستگی: تعلقِ خاطرِ عاشق۔

دل ستانی: دل لینا۔

دمِ ذکر: ذکر کرتے وقت۔

دمِ سماع: سماع کے وقت۔ صوفیائے کرام کی حمد و ثناء کو سماع کہتے ہیں۔

دمِ مرگ: مرتے وقت۔

دوچار ہونا: آمنا سامنا ہونا۔

دود: دھواں

دودِ شمعِ کشتہ: بجھی ہوئی شمع کا دھواں۔

دورِ قدح: باری باری یا ٹھہر ٹھہر کے شراب پینا۔

دوست دارِ دشمن: رقیب کا خیر خواہ۔

دوش: کندھا۔

دوشینہ: رات کی پی ہوئی شراب۔

دونیم: دو پارہ۔

دوئی: دوسرا۔

دہر: دنیا۔

دہقاں: مزدور۔

دھویا جانا: بے شرم و بیباک ہو جانا۔

دے: ماہِ خزاں۔

دیداں: الجمع دودہ یعنی کیڑے۔

دیدہ: آنکھیں۔

دیدۂ اختر: ستاروں کی نظریں۔

دیدۂ بینا: چشمِ بصارت، دیکھنے والی آنکھ۔

دیدۂ تر: چشمِ تر۔

(ذ)

ذوق: شوق

ذوقِ معاصی: ذوقِ گناہ۔

(ر)

رزق ہم ہونا: ایک دوسرے کا رزق ہونا۔

رستخیز اندازہ: قیامت کی مانند۔

رسوا: ذلیل۔

رسوم و قیود: انسان کی خود ساختہ پابندیاں۔

رضواں: داروغۂ جنت۔

رعنائی خیال: شوخی و رنگینیٔ خیال۔

رنج: غم و الم۔

رنگ باختن: رنگ بدلنا۔

رنگ شکست: اڑا ہوا رنگ۔

روبرو: سامنے، مقابل۔

روبکاری: پیشی۔

روح القدس: جبرائیل۔

روح نباتی: قوت نامیہ۔

روزن: سوراخ۔

روشن ہونا: ظاہر ہونا۔

روکش: مدِ مقابل۔

رہزنی: راستے میں لوٹنا۔

رہگور: راستہ۔

رہینِ ستم: مبتلائے مصیبت۔

رہینِ مے: شراب کے لیے گروی رکھوانا۔

ریشِ جگر: زخمِ جگر۔

ریشگی: خلش۔

ریشۂ نیستاں: تنکے کا بانسری ہو جانا۔ نیستاں وہ جگہ ہے جہاں "نے" یعنی بانسری کا بانس اُگتا ہے۔

(ز)

زباں ہائے لال: گونگی زبانیں۔

زبونیِ ہمت: کم ہمتی۔

زمزم: مکہ مکرمہ کا ایک کنواں جس کا پانی متبرک خیال کیا جاتا ہے۔

زمزمہ: ترانہ۔

زنداں: قید خانہ۔

زندانی: قیدی۔

زیست: زندگی۔

(س)

سات اقلیم: ہفت اقلیم، سات سلطنتیں، مراد ساری دنیا۔

سادہ دلی: سادہ لوحی۔

سازِ صدائے آب: جل ترنگ، چینی کے پیالوں میں پانی بھر کر انھیں لکڑی سے جب بجایا جاتا ہے تو جل ترنگ کا لطف پیدا ہوتا ہے۔

ساقی: شراب پلانے والا۔

سبحہ: تسبیح۔

سبحہ صد دانہ: سو دانوں کی تسبیح۔

سبدِ گل: پھولوں کی ٹوکری۔

سبزہ اُگنا: ویرانی ہونا۔

سبک: خفیف، ذلیل۔

سبک دست: مشاق۔

سبک سر: احمق۔

سپاس: تشکر۔

سپند: کالا دانہ جو نظرِ بد کو دور کرنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔

ستمگر: ظالم۔

سجادہ: مصلّیٰ۔

سراب: دھوکا۔

سراپا رہنِ عشق: ہمہ تن مبتلائے عشق۔

سرِ اشک آلود ہونا: آنکھوں میں آنسو بھر آنا۔

سرِ پُر شور: پُر شوریدہ، سودائی۔

سرگراں: متکبر۔

سرگشتگی: جنونِ عشق۔

سرگشتۂ خمار: دیوانہ یا مدہوش نشے سے۔

سرنامہ: لفافہ۔

سرنوشت: تقدیر۔

سطوت: رعب۔

سعی: کوشش۔

سفرہ: دسترخوان۔

سلک مروارید: لڑی میں پرویا ہوا موتی۔

سنگ: پتھر۔

سنگ و خشت: اینٹ اور پتھر۔

سُم: زہر۔

سوزِ جاودانی: سوزِ دائمی۔

سوئے ظن: بدگمانی۔

سہل: آساں۔

سیلی: تھپڑ یا ضرب۔

سیلیٔ استاد: استاد کا تھپڑ۔

سیلیٔ خارہ: پتھر کی ضرب۔

سیماب: پارہ صفت۔

سیم تن: چاندی جیسا حسیں مراد محبوب۔

سیہ مستی: بدمستی۔

(ش)

شائق: پُرشوق۔

شایان: قابل۔

شب رو: رات کو چلنے والا، مسافرِ شب۔

شبستاں: رات بسر کرنے کی جگہ۔

شجر بید: بید کا درخت، جس پر کوئی پھل نہیں لگتا۔

شراب طہور: پاکیزہ شراب۔

شرر: چنگاری۔

شرع و آئین: قانون دین و دنیا۔

شریک تمتع: فائدہ حاصل کرنے میں شریک۔

شست: نشانہ۔

شعار: طریقہ۔

شکوہ سنج: شکوہ کرنے والا، شاکی۔

شکیب: صبر۔

شمع کشتہ: بجھی ہوئی شمع۔

شناور: تیرتا ہوا۔

شنیدن: سننا۔

شوریدگی: جنوں، دیوانگی۔

شہپر: وہ پر جس کی مدد سے پرندے اُڑتے ہیں۔

شہرت مقرون: قریب کی شہرت۔

شہود: جمع شاہد کی، حاضر۔ جب سالک کو تمام موجودات میں حق ہی حق نظر آئے تو اس کیفیت کو بھی شہود کہتے ہیں۔

شہہ: بادشاہ۔

شیشہ باز: شعبدہ باز۔

شیون: فریاد۔

(ص)

صاعقہ: گرنے والی بجلی۔

صبر آزما: صبر آزمانے والا۔

maablib.org

صبر گریز پا: وہ صبر جو جلد جاتا رہے۔

صحرا گرد: جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھاننے والا۔

صد رنگ: سو طرح سے۔

صد رہ: سو طرح سے۔

صرصر: آندھی، ہوائے تند۔

صرفِ وفا: وفا کے لیے وقف۔

صریرِ خامہ: قلم کی آواز جو لکھتے وقت پیدا ہوتی ہے۔

صورتِ دیوار: وہ تصویر جو دیوار پہ بنائی جائے۔

صہبا: شراب۔

صیتِ ہزیمت: ٹوٹنے کی آواز۔

صید: شکار۔

صیدِ زدام جستہ: وہ شکار جو جال سے نکل بھاگے۔

صیقل: جلا، چمکنے والا۔

(ض)

ضامن: ذمہ دار۔

ضعف: کمزوری۔

(ط)

طاعت: اطاعت۔

طاقت اُڑنا: طاقت زائل ہونا۔

طاقتِ رم: بھاگنے کی طاقت۔

طاقتِ سخن: کلام یا گفتار کی طاقت۔

طاقِ نسیاں ہو جانا: بھول جانا۔

طرۂ گیاہ: گھاس کا تنکا۔

طمع: لالچ۔

طوف: طواف، چکر کاٹنا۔

طوفانِ طرب: جوشِ مسرت۔

طومار: دفتر۔

طیور: طائر کی جمع، پرندے۔

(ع)

عجزِ ہمت: پست ہمتی۔

عداوت: دشمنی۔

عربدہ: جنگ۔

عرقِ انفعال: شرمندگی یا شرم سے آیا پسینہ۔

عذر: جواز، بہانہ۔

عشرت: عیش، راحت۔

عشقِ پُر عربدہ: جنگجو عشق۔

عطرِ پیرہن: خوشبوئے لباس۔

علم: جھنڈا۔

عمار: جمع عمری۔

عماری: وہ محمل جس میں محبوب فروکش ہو۔

عناں گسختہ: جس کی باگ ٹوٹی ہوئی ہو یعنی شوق بے اختیار۔

عناں گیر: روکنے والا، مانع۔

عنوان: سرخی۔

عقد: لڑی۔

عقدِ گوہر: موتیوں کی لڑی۔

عقوبت: سزا۔

عیار: کسوٹی۔

عیشِ جہانی: جہانی کی راحت۔

عیشِ رفتہ: زمانہ ماضی کا عیش۔

(غ)

غارت: تباہ وبرباد۔

غارت گرجنسِ وفا: وفا کو پامال کرنیوالا۔

غبار: دھول۔

غرقِ مے: شراب میں ڈوبا ہوا مدہوش۔

غازہ: سرخی۔

غرّہ: غرور۔

غالیہ: اُس خوشبو کو کہتے ہیں جو مشک وعنبراور کافور وغیرہ کو ملا کر بناتے ہیں۔

غالیہ مُو: مشکیں ومعنبر زلفوں والا محبوب۔

غزال: ہرن۔

غزل سرا: غزل کہنا۔

غش: بے ہوشی۔

غمزہ: ناز وادا۔

غمِ گیتی: دنیا کے غم۔

غنچۂ ناشگفتہ: تنگ دہن۔

(ف)

فافہم: پس غور کرو۔

فتراک: شکار بند۔

فتنۂ طاقت زُبا: طاقت زائل کرنے والا فتنہ۔

فردِ جمع وخرچ: جمع وخرچ کا دفتر۔

فروزاں: روشن۔

فروغِ شعلۂ خس: وہ تنکا جو آگ لگنے سے تیزی سے بھڑک کر بجھ جائے۔

فروغِ طالع: خوش قسمتی۔

فسوں گر: جادوگر۔

فسوں نیاز: عجز و نیاز کا جادو منتر۔

فشار: بھینچنا۔

فغاں: فریاد۔

(ق)

قاصد: پیغام رساں۔

قالب: ڈھانچہ۔

قصہ تمام کرنا: زندگی کا خاتمہ کرنا۔

قطرۂ عرق: پسینے کے قطرے۔

قشعریرہ: رونگٹے کھڑے ہونا۔

قفا: پیچھے۔

قفلِ ابجد: ایک قسم کا قفل جس میں بہت سی پھرکیاں ہوتی ہیں۔ جن پر مختلف حروف کندہ ہوتے ہیں۔ قفل کھولنے کے لیے صناع ایک لفظ مقرر کر دیتا ہے۔ مخصوص حروف کی ترتیب سے جونہی وہ لفظ ترتیب پاتا ہے قفل کھل جاتا ہے۔

قلزم: سمندر۔

قمری: باغ کا پرندہ، جس کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور جو سرو پر عاشق ہوتا ہے۔

قوتِ نامیہ: بڑھنے کی قوت، بالیدگی۔

قہر و عتاب: غصہ۔

(ک)

کاشانہ: جھونپڑی۔

کالبد: قالب، جسم۔

کاوش: کریدنا، کھوجنا۔

کسب: محنت سے حاصل کرنا۔

کسوت: لباس۔

کشادو بست مژہ: پلکوں کا بار بار کھلنا اور بند ہونا۔

کشاکش: کھینچا تانی۔

کشائش: کھولنے والا۔

کشت: کھیت۔

کشت وفا: وفا کی آرزو۔

کشور: سلطنت۔

کف خس: مٹھی بھر تنکے۔

کف سیلاب: سیلاب کے جھاگ۔

کف ہر خاک: خاک کی ہر مٹھی۔

کفیل: ضامن۔

کلفت: افسردگی۔

کمخواب: قیمتی کپڑا۔

کمیں: قابو یا گھات۔

کواکب سپہ: وہ بادشاہ جس کی فوج آسماں کے تاروں جتنی ہو۔ مراد لاتعداد فوج۔

کودکی: بچپن۔

کوکبۂ شہریار: وہ سوار جو بادشاہ کی اردل میں رہیں۔

کوہکن: فرہاد۔

کھل جانا: ظاہر ہو جانا۔

کہنہ: پرانا۔

کیموس: غذا ہضم کرنے کا دوسرا مرحلہ جس میں غذا پانی کی طرح پتلی ہو کر خون کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

(گ)

گرد: دھول مٹی۔

گردشِ مدام: دائمی گردش۔

گرہِ نیم باز: اَدھ کھلی گرہ۔

گریز: [illegible]

گلبانگ: دلکش آواز۔

گلچیں: پھول توڑ کر جمع کرنیوالے۔

گلخن: بھاڑ، بھٹی۔

گل در قفائے گل: پھول کے بعد پھول۔

گل کترنا: شگوفہ چھوڑنا یا کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد ہو اور خود کو علیحدہ کرلینا۔

گلِ نغز: خوشی کی آواز۔

گمان: وہم۔

گنج ہائے گراں مایہ: بیش قیمت خزانے۔

گنجینہ: خزانہ۔

گوش: کان۔

گوں: قابل۔

گوہر: موتی۔

گہوارہ: پنگھوڑا۔

گیتی: دُنیا۔

گیتی خراب: آوارہ۔

گیرائی: گرفت۔

(ل)

لاف: شیخی۔

لاگ: طمع۔

لائقِ تعزیر: قابلِ سزا۔

لب تشنہ: آرزومند۔

لذت یاب: لذت کش۔

لطمۂ موج: موج کا تھپیڑا، طوفان و حوادث۔

لگدکوب: لات مارنا، لتیاؤ۔

لہنا: فائدہ۔

لہو پانی ہونا: انتہائی مصیبت میں ہونا

لئیم: کنجوس، گھٹیا۔

لیالی: جمع لیل کی، راتیں۔

(م)

مآل: انجام۔

مافات: جو گزر چکا۔

مانع: روکنے والا۔

ماہِ کنعاں: مراد حضرت یوسفؑ جو چاند کی طرح حسین تھے اور کنعاں کے رہنے والے تھے۔

مائدہ: دسترخوان۔

مبتدی: ابتدا کرنے والا۔

متاعِ بردہ: لوٹا ہوا مال۔

متاعِ دست گرداں: وہ چیز جو نقد قیمت پر بکے۔

مجلس افروز: رونقِ محفل۔

محابا: تکلف، حجاب، لحاظ، خوف۔

محرومئ قسمت: بدقسمتی۔

محشرِ خیال: خیالات کا مجمع۔

محیطِ بادہ: خط ساغر جہاں تک شراب ہو۔

مدد: دادرسی۔

مرجھانا: سوکھنا۔

مرگ: موت۔

مرگِ ناگہاں: جو اچانک آنے والی موت۔

مرحمت: عنایت۔

مزین: زینت کرنے والا۔

مژدہ: خوشخبری۔

مژگاں: پلکیں۔

مستور: چھپا ہوا۔

مسیح: مراد حضرت عیسیٰؑ جو مُردوں کو معجزے سے زندہ کر دیتے تھے۔

مشتاق: آرزو مند۔

مضر: نقصان دہ۔

مضطرب: بے قرار، بے چین۔

مغشوش: مشکوک یا مشتبہ۔

مضمر: پوشیدہ۔

مطرب: خوش آواز گانے والا۔

مقام: مکان۔

مقدس: متبرک، پاکیزہ۔

معرفت: کمال۔

معروف: مشہور۔

معمور: بستی، آبادی۔

مغموم: غمگین۔

مغنی: گانے والا۔

مکرِ دنیا: دنیا کی مکاری۔

مدار: دارومدار۔

مرجان: مونگا۔

مرگ: موت۔

مرگِ ناگہاں: اچانک آجانے والی موت۔

مرہون: ممنون۔

مزیل: زائل کرنے والا۔

مژدہ: خوشی کی خبر۔

مژگاں: پلکیں۔

مستور: چھپا ہوا۔

مسیحا: مراد حضرت عیسیٰ، جو مردوں کو زندہ اور بیماروں کو تندرست کردیتے تھے۔

مشتِ خاک: مٹھی بھر خاک۔

مشہد: شہادت گاہ۔

مشہود: وہ جس کو دیکھا جائے۔

مضامیں: مراد شعر یا اشعار۔

مضمر: پوشیدہ۔

مطرب: نغمہ یا گیت گانے والا۔

مظنہ: گمان۔

معتقد: اعتقاد رکھنے والا۔

معدن: کان۔

معزول: منتقل۔

معمورہ: بستی، آبادی۔

مغتنم: غنیمت۔

مغنی: گانے والا۔

مکارۂ دنیا: دنیا کی مکاری۔

مقدمِ سیلاب: آمدِ سیلاب۔

مقطع: خاتمہ۔

مکافات: بدلہ، تلافی۔

مکرر: دوبارہ۔

مگس: شہد کی مکھی۔

ملخ: ٹڈی۔

مناجات: دُعا، عبادت۔

منت کش: ممنون، احسان مند۔

منت کھینچنا: احسان اُٹھانا۔

منتہی: انتہا یا اختتام کرنے والا۔

منجملہ: تمام۔

مند گئیں: بند ہو گئیں۔

منصبِ شیفتگی: عہدۂ عاشقی۔

منفعل: شرمندہ۔

مواخذہ: پکڑ دھکڑ، پرسش۔

موجِ شراب: شراب کا دور یا اس کی مہک۔

موجِ شفق: آسمان پر شفق کی سرخی کا لہر کی مانند پھیل جانا۔

موجِ صبا: ہوا کے جھونکے۔

موجِ گل: بکثرت پھول۔

موجہ: موج۔

مہتمِ تسکیں: تسکین پر لگائی گئی تہمت۔

مہر علم: جس کا علم آفتاب ہو۔

مہر گیا: ایک بوٹی کا نام۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو اسے پاس رکھتا ہے وہ ہر دل عزیز ہو جاتا ہے۔

مہرِ نیم روز: دوپہر کا سورج جس کی طرف دیکھا نہیں جاسکتا۔

مہروش: خورشید جمال۔

مہ طلعت: چاند جیسی صورت والا معشوق۔

مہ نخشب: مصنوعی چاند۔ جسے حکیم ابن عطا (مقنع) نے بنایا تھا۔ جس کی روشنی چار فرسنگ سے زیادہ نہ تھی اور جو کچھ ہی عرصہ بعد شق ہو گیا تھا۔

میدان مانگنا: جنگ طلب کرنا۔

مینائے مے: شراب کی صراحی۔

(ن)

نار: آگ۔

نارسا: جس کی پہنچ نہ ہو۔

نازش: فخر۔

نسیہ: ادھار، قرض۔

ناصح: نصیحت کرنے والا۔

ناصیہ فرسا: ماتھا رگڑنے والا۔

نعل بہا: وہ روپیہ جو چھوٹی حکومتیں بڑی حکومتوں کو ادا کرتی ہیں تا کہ وہ ان کی حفاظت کریں۔

نافِ زمیں: مرکزِ زمیں۔

نافہ غزال: نافہ، کستوری کی ایک تھیلی۔ جو ایک خاص قسم کے ہرن کی ناف میں ہوتی ہے۔

ناگہاں: اچانک۔

نالہ: فریاد۔

نامِ خدا کہنا: ماشاءاللہ کہنا، تعریف کرنا۔

ناموس: عزت۔

نامہ: خط۔

ناوک فگن: تیر انداز۔

نبردِ عشق: میدانِ عشق۔ جنگِ عشق۔

نجف: عراق کا شہر۔ جہاں حضرت علی کرم اللہ وجہ کا روضہ ہے۔

نخچیر: شکار۔

نخوت: غرور، تکبر۔

نشاط آہنگ: خوشی، مسرور ہونے کی کیفیت۔

نشتر: جنون دور کرنے کے لیے نشتر سے فصد کھولی جاتی ہے۔

نشیدن: نہ سننا۔

نظارہ سوز: نظروں کو جلا دینے والا۔

نقش: صورت، تصویر۔

نقش پائے مور: چیونٹی کے پاؤں کا نشاں۔

نقشِ سویدا: دل پر ایک سیاہ رنگ کا تل۔

نکو نامی: نیک نامی۔

نکوہش: ملامت۔

نکہت گل: پھولوں کی خوشبو۔

نکیرین: وہ فرشتے جو دفنائے جانے کے بعد مردے کا حساب کتاب لینے آتے ہیں۔

نمک پاشی: نمک چھڑکنا۔

نمو: بڑھوتری، بالیدگی۔

نوائے سروش: فرشتۂ غیب کی آواز۔

نوحہ گر: بین کرنے والا، عزا کرنے والا۔

نومیدئ جاوید: ہمیشہ کی نا اُمیدی۔

نوید: خوشخبری۔

نویسندہ: خط لکھنے والا۔

نہالی: فرش، بستر۔

نہاں: چھپا ہوا، پوشیدہ۔

نیاز مندی: عاجزی۔

نیش: نشتر۔

(و)

وا: کھلا۔

وارستگی: آزادی۔

واسوخت: اُردو شاعری کی ایک قسم جس میں عاشق پہلے اپنے عشق کا اظہار پھر معشوق کا سراپا اور پھر اُس کی بے وفائیاں بیان کرتا ہے۔اس کے بعد وہ اُس سے روٹھ کر اُسے جلانے کے لیے یہ باور کراتا ہے کہ ہم کسی اور پہ عاشق ہو گئے ہیں۔یوں اُس کا غرور توڑ کے پھر ملاپ کی کوشش کرتا۔

وام: ادھار۔

وحشت: رمیدگی، بھاگنا۔

وحشت خرامی: دیوانہ وار پھرنا۔

وحشی: دیوانہ۔

وداعِ ہوش کرنا: بیخود ہونا۔

ودیعت: امانت۔

ورطہ: گرداب۔

وضع: خودداری، ضبط کی عادت۔

وفا خوردگاں: وفا کا فریب کھائے لوگ۔

وفور: کثرت۔

(ہ)

ہدف: نشانہ۔

ہرزہ: بیکار۔

ہفت اقلیم: سات سلطنتیں مراد ساری دنیا۔

ہل من مزید: کچھ اور زیادہ۔

ہم دیگر: ایک دوسرے کا۔

ہم صفیر: ہم آواز۔

ہم طرحی: ہم رنگی۔

ہنوز: ابھی تک۔

ہوا باندھنا: رعب بٹھانا۔

ہویدا: ظاہر۔

ہیولیٰ: اصل مادہ ہر شے۔

(ی، ے)

یک: ایک۔

یک کفِ خس: ایک مٹھی بھر تنکے۔

یک مشتِ خاک: ایک مٹھی بھر خاک۔

یگانہ و یکتا: واحد و بے مثال۔

maablib.org

کتابیات

۱۔ ابوالنصیر محمد خالدی، ''تقویمِ ہجری و عیسوی'' انجمن ترقی اردو کراچی

۲۔ اکبر حیدری، ڈاکٹر، ''غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے'' ادارہ یادگارِ غالب کراچی، ۲۰۰۲ء

۳۔ الطاف حسین، حالی، ''یادگارِ غالب'' مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء۔

۴۔ امتیاز علی خاں، عرشی، ''فرہنگِ غالب'' آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی، ۱۹۴۷ء

۵۔ ایوب شاہد، ڈاکٹر، ''شارحینِ غالب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' (جلد اول و دوم) مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ء

۶۔ ترک علی شاہ، ''سخنورانِ چشم دیدہ'' مطبع شمس الاسلام حیدر آباد ۱۹۱۲ء

۷۔ جوش ملسیانی، ''شرح دیوانِ غالب'' سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۹ء

۸۔ حسرت موہانی، ''دیوان مع شرح غالب'' الکتاب آرام باغ روڈ، کراچی، ۱۹۶۵ء

۹۔ دیوانِ غالب (نسخۂ انجمن)، مرتبہ رشید حسن خان، مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۸۹ء

۱۰۔ دیوانِ غالب کامل، مرتبہ کالی داس گپتا رضا، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء

۱۱۔ کلامِ غالب، مرتبہ حامد علی خان، مطبوعہ مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء

۱۲۔ رشید حسن خان، ''املائے غالب'' ادارہ یادگارِ غالب کراچی، ۲۰۰۰ء

۱۳۔ سعید الدین قاضی، ''مطالبِ غالب'' یونائیٹڈ پبلشرز لاہور ۱۹۵۲ء

۱۴۔ شکیل پتافی، ڈاکٹر، ''پاکستان میں غالب شناسی'' بیکن بکس ملتان، ۲۰۱۳ء

۱۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''تفہیمِ غالب'' غالب انسٹیٹیوٹ دہلی، ۱۹۸۹ء

۱۶۔ طارق محمود، ''مجلہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی ادبی خدمات اور توضیحی اشاریہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو) بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۳

۱۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''غالب اور مطالعہ غالب'' ادارہ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۹۴ء

۱۸۔ عبدالباری، آسی، ''مکمل شرح دیوانِ غالب'' مکتبہ شعر و ادب لاہور، سن ندارد

۱۹۔ عبدالواجد، ''وجدانِ تحقیق'' مطبع فخر نظامی حیدر آباد دکن، ۱۹۰۲ء

۲۰۔ عبدالعلی والہ، ''دیوانِ والہ'' مطبع فخر نظامی حیدر آباد دکن، ۱۸۹۵

۲۱۔ غلام رسول مہر، ''نوائے سروش'' شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۷ء

۲۲۔ فرح ذبیح، ''نادر ذخیرۂ غالبیات'' شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۳ء

۲۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' حلقہ نیاز و نگار کراچی، ۱۹۹۵ء

۲۴۔ ایضاً، ''شرح و متن غزلیاتِ غالب'' بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۰ء

۲۵۔ نیاز فتح پوری، علامہ، ''مشکلاتِ غالب'' ادارہ دارالشعور، لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۶۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ''غالب معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' ساہتیہ اکیڈمی ۲۰۱۳ء

۲۷۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ''رموزِ غالب'' ادارہ یادگارِ غالب کراچی، ۱۹۹۹ء

۲۸۔ محمد باقر، آغا، ''بیانِ غالب'' مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۷ء

۲۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''غالب کا ذوقِ تماشا'' اقبال اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۷ء

۳۰۔ یوسف سلیم چشتی، ''شرح دیوانِ غالب'' عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۵۹ء

maablib.org

ضمیمہ جات

ماثر ولی خیر اثماکر و الٰہی

سبحان اللہ بحمدہ [illegible]

اردو زبان [illegible] سے

لطف تازہ [illegible] بیان

[illegible] کے

وطوق صراحت

یہ

[illegible] کامل حضرت مولانا مولوی

محمد عبد العلی [illegible] الرحمۃ کے تصنیف

[illegible]

مطبع [illegible] طبع

ما قلّ ودلّ خیر مّما کثر والہیٰ

سبحان اللہ وبحمدہ

اردو دیوان غالب کی شرح

بطرز تازہ و پاکیزہ مفید منتہیان

جسکا تاریخی نام ہے

وثوق صراحت

جسکو

دبستان سخنوری کے اوستاد کامل حضرت مولانا مولوی
محمد عبد العلی المتخلص والہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے تصنیف فرمایا

باہتمام وزیر علی مہتمم مطبع

مطبع نافع نظامی واقع حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

ظاہر ہو کہ اس خاکسار کے والد مرحوم جب نظام کالج میں بی۔اے
کلاس کو اردو دیوانِ مرزا غالب دہلوی کا پڑھاتے تھے تو اسکے ان
مقامات پر جنکی شرح طلب جاتے تھے اور ایسے مشکلات پر جنکو حل کے قابل
سمجھتے تھے شرح اور حل لکھتے گئے تھے۔ چاہتے تھے کہ نظرثانی کے بعد
امیر ذی توقیر و رشتہ ذی از من قدردان علم و فن جامع الادارت فضیلت مستغنی
عن الالقاب عالیجناب نواب عماد الملک بہادر ناظم تعلیمات
دام اقبالہ و اجلالہ کے جنابِ فیض مآب میں اس شرح کو پیش کریں
لیکن قضا و مرضِ موت سے بیمار ہو کر اس جہانِ فانی سے عالمِ باقی کو سفر

انتقال کر گئے لہذا یہہ ارادہ پورا نہوا۔ اگرچہ اس شرح پر نظر ثانی نہیں
کی گئی لیکن نظر اوّل ہی میں جو کچھ مختصر کہا ہے نہایت غنیمت اور قابل قدر ہے
کیونکہ ایک فرد کامل۔ سخنگو۔ سخندان۔ سخن فہم۔ اور مسلم الثبوت استاد
کی تصنیف ہے۔ اختصار کے ساتھ دقایق کو اسطرح بیان فرمایا ہے
کہ مقصود قایل فوت نہو۔ کہیں غورا۔ کہیں کچھ تعرض و تامل سے طالب العلم
کے ذہن نشین ہو جاے۔ حضرت مرحوم کی یہہ عادت تھی
کہ شرح کو بلا ضرورت ہرگز طول نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے
کہ شرح مختصر مفید ہونی چاہئے۔

اب مجھکو جو مرحوم کے دیوان اور انشا کے چھپوانے سے
فرصت ملی تو اس شرح کو بھی صاف لکھکر اور اسکا تاریخی نام
وثوق صراحت رکھکر بغرض افادہ چھپوایا۔ امید ہے
کہ مقبول خاص و عام ہوگی فقط

الراقم

محمد عبد الواجد عفی عنہ

قطعهٔ تاریخیه بزبان عالیشان فارسی در مرثیهٔ ملک الشعراء فخر جعفر

مولانا مولوی محمد عبد العلی والد مرحوم از کلام بلاغت نظام

مخزن علوم و معدن فنون شاعر غرای همه دان مستغنی

عن الالقاب عالیجناب فیض مآب مولانا مولوی محمد عبد الغنی

صاحب قبله المتخلص بوصف مددگار پیمایش و بنه بست

علاقه سرکار عالی مدظله

بنام یگانه توانا یزدان

والد تخلص مولوی عبد العلی	همچو من و عم من و استاد من
گوهرفشان چو بحر نشان تمکین	شیوا زبان چو در بیان شیرین سخن
گلدان ادب جهان حسب شایان نسب	بد در زمین [illegible] فخر [illegible]
در شاعری زیر فلک بی شابه	بودست در [illegible]
شاعر چنان نادر بود کز آسمان	قدرش رسید [illegible] چون سلطان [illegible]
نثرش چو نیسان بر زبان گوهرفشان	شعرش روان [illegible]
فکرش مگو سر چشمهٔ آب بقا	طبعش مگو سر چشمهٔ شهد و لبن

گر نفیس و تازه زن رسند در گلستان | ق | ور هزار اوتاران بودند همچنین

آرزو بیرون لعل بدخشی نتازدن | آید بهر بدخشی نتازدن

گرازده عالم از اثر اندیشان | گر از قضا گر از قدر گوید سخن

حرفش اگر ریزد اثر آید بدر | ق | سودا از سر دود تا بیخ بدن

کثرت گل زدند ذیل شدت ذیل | گفت ز گل حرمت تا پیشش بن

بربست تا رخت سفر زین گلستان | هر کس چو گل بر تن دریده پیرهن

سوی عدم رفتی چرا ای بینوا | در قدسیان شاید شوی استاد فن

باشد بصورت شمع همین گلشنان | در رحمت یزدان تا گرد و کفن

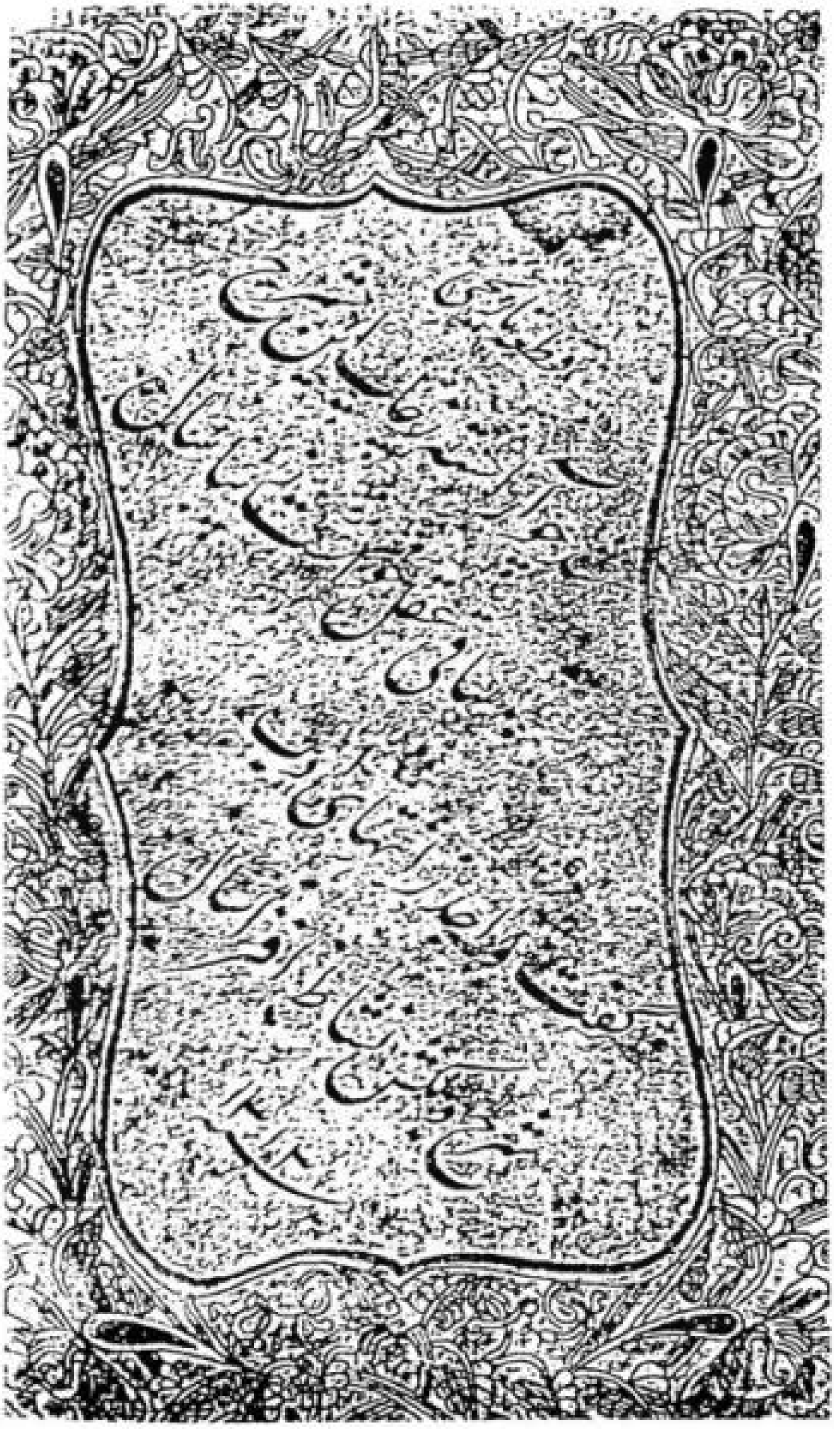
وصف تو زین بشنید تا این دو قد | گردیده یکسر سینه و جب دل خونین

برخوانده پیش سوگواران سال را | با ناله پر درد این بیت حزین

گشته اکنون بی سروپا از قضا
درس و مکتب علم و بیان شعر و سخن

سنه ۱۳۱۱ هجری

فقط



مشکلاتِ غالبؔ

(دیوانِ غالبؔ کی شرح)

علامہ نیاز فتح پوری

ناشر

حلقہ نیاز و نگار کراچی

(عکس صفحہ اول)

(جملہ حقوق محفوظ)

نام کتاب ــــــــــ مشکلاتِ غالب

مصنف ــــــــــ علامہ نیاز فتح پوری

ناشر ــــــــــ حلقہ نیاز و نگار کراچی

طبع دوم ــــــــــ ۱۹۹۳ء

قیمت ــــــــــ چالیس روپے

تقسیم کنندہ ــــ ویلکم بک ہاؤس اردو بازار کراچی

مشکلاتِ غالب

غالب کے یہاں اتنے مختلف رنگ کے شعار نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اس کے دیوان کو زنجیر فرض کرلیں تو اس میں ہمیں کوئی کڑی کسی رنگ کی نظر آئے گی، اور کوئی کڑی کسی رنگ کی۔

اس کے یہاں تصوف وحکمت بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی۔ خالص عاشقانہ رنگ بھی ہے اور رندانہ شوخی و بے باکی بھی۔ بلندیٔ تخیل بھی ہے اور سطحی نقاشی بھی۔۔ گویا وہ ایک گلدستہ ہے مختلف رنگ کے پھولوں کا جس میں ہر شخص کو اپنے اپنے ذوق و پسند کا پھول مل جاتا ہے اور غالباً یہی سبب اس کے قبول عام کا ہے۔

غالب کا نام سنتے ہی اس کی مشکل پسندی ودقیق نگاری ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس میں شک نہیں۔ وہ فطرتاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ پیدا کرنے والا، بڑا مشکل پسند انسان تھا اور بیان کے نئے زاویے تلاش کرنے کے لیے اس کا خیال ہمیشہ دماغ کی پیچیدہ راہوں سے گزر کر سامنے آتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے سہل و سادہ اشعار میں بھی کوئی نہ کوئی گرہ ضرور چھوڑ جاتا تھا۔ چہ جائیکہ حکمت و تصوف کے دقیق اشعار کہ انھیں تو معنوی نزاکت اور ندرتِ خیال کے لحاظ سے مشکل ہونا ہی چاہیے۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا حالی کو بھی یادگارِ غالب میں اس کے بعض اشعار کی شرح کرنا پڑی اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم نہ ہوا یہاں تک کہ کلامِ غالب کی متعدد شرحیں وجود میں آگئیں۔

اس میں شک نہیں کہ شارحین غالب نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کافی ژرف نگاہی

سے کام لیا ہے۔ بعض نے لفظی و لغوی تحقیق کو سامنے رکھا، بعض نے اس عقیدے کی بنا پر کہ غالبؔ کے کلام میں کسی خامی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں، اس کے بعض بے معنی اشعار میں بھی کھینچ تان کر کوئی نہ کوئی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بعض شارحین ایسے بھی ہیں جن کو غالب کا ہر شعر، حکمت و فلسفہ نظر آیا اور اس کی شرح و تفسیر میں وہ غالبؔ سے زیادہ نا قابلِ فہم ہو کر رہ گئے، بعض شرحوں میں بہت اختصار و اجمال پایا جاتا ہے اور بعض میں ضرورت سے زیادہ اطناب۔ اس لیے ان تمام شرحوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک معتدل قسم کی شرح کی ضرورت یقیناً باقی تھی اور بعض احباب نے مجھ سے ایسی شرح لکھنے کی بارہا خواہش بھی کی۔ لیکن میں اس کے لیے وقت نہ نکال سکا۔

اس دوران میں اکثر طلبہ میرے پاس آئے اور انھوں نے غالبؔ کے بعض اشعار کا مفہوم مجھ سے دریافت کیا تو مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان اساتذہ نے جو مفہوم ان کو بتایا ہے وہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور طلبہ کا ذہن و دماغ آسانی سے اُسے قبول نہیں کر سکتا۔ بنابر آں مجھے خیال ہوا کہ غیر ضروری مباحث میں اُلجھے بغیر اگر سادہ الفاظ میں غالبؔ کے مشکل اشعار کا مفہوم ظاہر کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

نیاز

غزل نمبرا

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخئ تحریر کا ۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش = نگارخانۂ عالم یا تمام وہ اشیاء جو کائنات میں ہم کو نظر آتی ہیں۔

شوخئ تحریر = شوخئ نقش، یعنی نقاش کی اپج۔

کاغذی پیرہن = ناپائیدار لباس، جس سے مراد ہے ہستی ناپائیدار (اس میں رعایت اس قدیم رسم کی بھی ہے کہ فریادی کاغذ کا لباس پہن کر حاکم سے فریاد کرنے جاتا تھا۔

کس کی = سوالیہ نہیں ہے بلکہ حیرت و استعجاب کے محل پر استعمال ہوا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ:- اس نگارخانۂ عالم کی ہر ہر چیز، نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبان حال سے اپنی نااستواری و فناپذیری کی فریاد کر رہی ہے۔

یہ شعر حمد کا ہے اور مقصود یہ ظاہر کرتا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر و آثار جملہ موجودات عالم فناپذیر ہیں اور خدا کے سوا کسی کو ثبات نہیں۔

۲۔ کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ ۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاو کاو = کھودنا، کاوش۔ غیر معمولی محنت۔

سخت جانی = انتہائی تکلیف جھیل جانے کی اہلیت۔

جوئے شیر لانا = اشارہ ہے فرہاد کے قصہ کی طرف کہا جاتا ہے کہ شیریں نے اسے پہاڑ کھود کر جوئے شیر (دودھ کی نہر) لانے کا حکم دیا تھا۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم جس انتہائی کاوش و تکلیف کے عالم میں تنہائی کی راتیں بسر کر رہے ہیں

وہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

"کاوکاوِ سخت جانی"؛ "صبح" اور جوئے شیر، میں جو مناسبت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔

یہ شعر عاشقانہ رنگ کا ہے اور غالب کی ندرتِ بیان کا پاکیزہ نمونہ۔

۳۔ جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دمِ شمشیر = تلوار کی دھار۔

دم = سانس۔

مفہوم یہ ہے کہ میرے شوقِ شہادت کا جذبۂ بے اختیار دیکھئے کہ قاتل کی تلوار بھی قتل کے لیے بے اختیار ہو گئی اور اس کا دم باہر آ گیا۔

"دم باہر آنا" بے اختیار ہونے کے مفہوم میں اُردو کا محاورہ نہیں اور محض اختراع ہے غالب کی۔ اس شعر کی بنیاد لفظ دم پر قائم ہے کیونکہ دم سانس کو بھی کہتے ہیں اور دمِ شمشیر تلوار کی دھار کو بھی۔ اسے ایہام کی شاعری کہتے ہیں جواب بالکل نامقبول ہے۔

۴۔ آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

مفہوم یہ ہے کہ میرے اشعار سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ لیکن اُن کا سمجھنا محال ہے۔ یعنی جس طرح جال میں عنقا نہیں پھنس سکتی، اس طرح فہم و ادراک کے جال میں میرے شعر کا مفہوم بھی نہیں آ سکتا۔

اسی مضمون کا ایک اور شعر غالب کا یہ ہے:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

۵۔ بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیرِ پا = بیقرار۔ بیتاب۔

موئے آتش دیدہ = وہ بال جسے آگ دکھا دی جائے یعنی بہت کمزور یا جلا ہوا

مفہوم یہ ہے کہ میں چونکہ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا ہوں اس لیے میری زنجیر کا حلقہ

موئے آتش دیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس شعر کی بنیاد لفظ آتش پر قائم ہے اور اگر آتش زیرِ پا کی جگہ اس کا مترادف لفظ "بیقرار" رکھ دیا جائے تو شعر مہمل ہو کر رہ جائے۔

یہ شعر بھی ناپسندیدہ ایہام و رعایتِ لفظی کا نمونہ ہے اور تغزل سے باہر۔

لفظ حلقہ "ہر حلقہ" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نقص سے خالی نہیں۔

غزل نمبر۲

۱۔ جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ۔۔۔ صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

تنگی = تنگی۔

حسود = حاسد۔

تنگیٔ چشم = بُخل۔

بروئے کار آنا = سامنے میدان میں آنا۔

قیس (مجنوں) کے سوا کوئی اور صحرا میں اس کے مقابلہ کے لیے نہ آیا یعنی صرف وہی ایک میدانِ عشق کا مرد تھا۔ اس کی توجیہہ غالب نے یہ کی کہ صحرا چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا اور اس میں دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔ اس شعر کی بنیاد لفظ تنگی پر قائم ہے اور اس سے کافی ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۲۔ آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ۔۔۔ ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی = پریشانی۔ پریشاں خاطری

نقشِ سویدا = دل کا سیاہ داغ یا نقطہ

دود = دھواں

نقش درست کرنا = نقش پیدا کرنا

مفہوم یہ ہے کہ = ہمارا داغِ دل محض ہماری پریشاں خاطری کا نتیجہ ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ داغ کا سرمایہ محض دود (دھواں) ہے جس کی آشفتگی ظاہر ہے۔ مدعا یہ کہ جب تک آشفتگی پیدا نہ ہو داغِ دل میسر نہیں آسکتا۔

۳۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

یہ شعر بھی غالبؔ کے ان اشعار میں سے ہے جو باوجود سادہ ہونے کے مشکل ہی سے بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اس میں سب سے زیادہ اُلجھن "زیاں وسود" کے ذکر نے پیدا کردی ہے کیونکہ کسی سے معاملہ ہونا، باہم عہد وپیماں کی گفت وشنید کا مفہوم رکھتا ہے اس سے اگر مجھ سے کا خطاب "محبوب" سے ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم خواب میں تجھ سے معاملہ محبت اور عہد وفا لینے پر جھگڑ رہے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور سارا طلسم درہم برہم ہو گیا لیکن اس صورت میں "زیاں تھا نہ سُود تھا" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر خطاب خدا سے ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ کاروبار حیات سے رابطۂ قدرت سمجھنے کی کوشش محض خواب و خیال ثابت ہوئی اور ہماری بے خبری وناآگہی بدستور باقی رہی جو "سود وزیاں" سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

۴۔ لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مکتبِ عشق یا مکتبِ غم میں میری حیثیت اب بھی ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں۔ یعنی جس طرح مکتب کی ابتدائی تعلیم میں رفت کے معنی گیا اور بود کے معنی تھا بتائے گئے تھے۔ اس طرح میں اب بھی اُسی "رفت وبود" کا ابتدائی سبق لے رہا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ خبر نہیں کہ دل کسی وقت اپنے پاس تھا اور اب وہ چلا گیا ہے۔

۵۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ننگِ وجود ہونا = وجود کے لیے باعث شرم ہونا۔

مفہوم یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رنگ میں وجود کے لیے باعث شرم تھا اور کسی لباس سے میرے عیوب چھپ نہ سکتے تھے۔ اس لیے اچھا ہوا کہ میں مرگیا ور کفن نے داغ عیوب کو ڈھانپ لیا۔

۶۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

سرگشتۂ خمار = متوالا۔

رُسوم وقیود = دنیا کی پابندیاں۔

مفہوم یہ ہے کہ:۔ کوہکن (فرہاد) رسوم ظاہری کا پابند تھا کہ اس کو مرجانے کے لیے

سر پر تیشہ مارنے کی ضرورت ہوئی۔ ہماری محبت فرہاد سے زیادہ بلند ہے اور جان دینے کے لیے ظاہری اسباب کی محتاج نہیں۔

غزل نمبر ۳

۱۔ کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

ہم نے مدعا پایا = ہم تمھارا مطلب سمجھ لیے۔

مفہوم یہ ہے کہ دل ہمارے پاس کہاں۔ وہ تو تمھارے ہی پاس ہے اور ازراہِ شوخی یہ کہتے ہو کہ اگر پڑا پایا تو نہ دیں گے۔

۲۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

درد سے مراد "دردِ زندگی" ہے۔

مُدعا یہ کہ جب تک محبت نہ کی تھی۔ زندگی درد تھی۔ اب اس کی جگہ دردِ محبت نے لے لی جس کی کوئی دوا نہیں۔

۳۔ سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

حسن کی ظاہری سادگی و بے پروائی پر نہ جاؤ۔ یہ دراصل ہوشیاری ہے اور اس طرح وہ امتحان لینا چاہتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی بے پروائی دیکھ کر عشاق اپنی حد سے آگے بڑھ جائیں۔

غزل نمبر ۴

۳۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

جب میں اس حالتِ عدم میں تھا تو اس وقت بھی میری "آتش نفسی" کا یہ عالم تھا کہ میری آہ سے عنقا کے پر جل جاتے تھے (عنقا ایک فرضی طائر ہے) لیکن اب تو میں دنیائے عدم سے بھی بہت دُور آگے نکل گیا ہوں۔ اس لیے اب اس عالم کا ذکر نہ کرو۔ جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔

مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مرتبہ "فنائیت" نام صرف معدوم ہو جانے کا نہیں بلکہ اس سے

بھی آگے گزر جانے کا ہے۔

صوفیہ کے یہاں درجہ "ترک ترک" بھی قریب قریب یہی مفہوم رکھتا ہے۔

۴۔ عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں　　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اندیشہ بمعنی فکر و خیال استعمال کیا گیا ہے۔

مدعا یہ کہ میں اپنے فکر و خیال کی گرمی کا کیا بیان کروں۔ گرمی کا تو یہ عالم ہے کہ میں نے صحرا کا محض تصور ہی کیا تھا کہ اس میں آگ لگ گئی۔ مبالغہ ہے لیکن گوارا۔

غزل نمبر ۵

۱۔ شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا　　　قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ہر رنگ یعنی بہر رنگ، ہر طرح

شوق بمعنی عشق استعمال کیا گیا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ عشق خواہ کسی رنگ میں سامنے آئے۔ ساز و سامان سے معرا نظر آئے گا یہاں تک کہ جب قیس (مجنوں) کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو وہ بھی عریاں و برہنہ (ساز و سامان سے بے نیاز) کھینچی جاتی ہے۔

۲۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب　　　تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

"تنگیٔ دل" کے اظہار میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی میری تنگیٔ دل (رنج و ملال) کا یہ عالم ہے کہ تیر بھی اُس کے اندر سے نکلا تو پروں سمیت نہ نکل سکا اور پر دل ہی میں چھوڑ گیا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تیر تنگیٔ دل کی داد دیتا اور زخم کو وسیع کر دیتا۔

مدعا یہ کہ میں ایسا دل تنگ (رنجیدہ و ملول) انسان ہوں کہ محبوب کا تیر کھانے کے بعد بھی میری دل تنگی نہیں جاتی۔ اس شعر کی بنیاد محض لفظ تنگی پر قائم ہے۔ اگر اس کو نکال دیجیے تو شعر بے معنی ہو جائے۔

۴۔ دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذتِ درد کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مائدہ=دستر خوان

بقدرِ لب و دنداں=یعنی محض اس حد تک کہ صرف لب و دنداں لذت حاصل کر سکیں۔

مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ میرا دل حسرت زدہ تو لذت درد کا ایک کھلا ہوا وسیع دستر خوان تھا جس سے کافی لذت درد حاصل کی جا سکتی تھی۔ لیکن لوگوں نے اُس سے صرف بقدرِ لب و دنداں یعنی بہت کم فائدہ اُٹھایا یعنی میرے کلام کو جس نظر غائر سے دیکھنا چاہیے تھا لوگوں نے نہیں دیکھا اور اس کے محاسن کو پوری طرح نہیں سمجھا۔

۵۔ اے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

''ہمتِ دشوار پسند'' سے خطاب ہے اور ''نو آموزِ فنا'' اس کی صفت ہے یعنی ایسی ہمت دشوار پسند جو نو آموز فنا بھی ہے۔ ''ہمت دشوار پسند'' سے مراد وہ ہمت حوصلہ ہے جو دشواریوں سے گزرنا پسند کرے۔ اور ''نو آموزِ فنا'' سے مراد ہے ''فنا کی منزل کا تجربہ نہ رکھ کر اول اول اس سے گزرنے والا۔''

غالب اپنی ''ہمتِ دشوار پسند'' کو جو ''نو آموز'' بھی ہے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تو باوجود نو آموز ہونے کے اپنی دشوار پسندیوں کی بدولت منزلِ فنا کی دشواریوں سے با آسانی گزر گئی اس لیے بتا کہ اب میں کیا کروں اور فنا سے زیادہ اور کونسی مشکل منزل ڈھونڈ نکالوں کہ تیری دشوار پسندی کے حوصلے پورے ہوں۔

۶۔ دل میں پھر گریے نے اک شور اُٹھایا غالب آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

لفظ پھر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی گریہ کیا گیا تھا لیکن کوئی قطرۂ اشک دل میں رہ گیا تھا اور اب اس قطرے نے ایسا زور باندھا کہ طوفان برپا کر دیا۔

غزل نمبر ۶

۱۔ دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

باب نبرد = مقابلہ کرنے کا اہل۔

نبرد پیشہ = جنگ و مقابلہ کا شائق

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ میدانِ محبت میں اُنھی لوگوں کو آنا چاہیے جو سختیاں برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ لوگ اس کے اہل نہیں جو ابتدائی دشواریوں ہی میں ہمت ہار جاتے ہیں مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عشق کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لیے بڑا کلیجہ چاہیے۔

۲۔ تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا　　اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

زندگی میں ہر وقت موت کے کھٹکے سے میرا رنگ زرد رہتا تھا۔ یعنی کاروبارِ حیات میں مجھے کبھی خوشی حاصل نہ ہوئی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ تمام اسبابِ زندگی فنا ہونے والے ہیں اور جس چیز کو بقا نہ ہو اس پر خوش ہونا کیا؟

۳۔ تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں　　مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فرد فرد = منتشر، بے ربط

یعنی اس وقت بھی جب محبت کے متعلق میرے خیالات اوراقِ پریشاں کی حیثیت رکھتے تھے اور میں اس کی حقیقت سے پوری طرح آشنا نہ تھا۔ جذبۂ وفا کا قائل تھا۔ اس لیے اب کہ میں اس ابتدائی منزل سے گزر گیا ہوں۔ میری وفاداری اور خوئے تسلیم و رضا کی پختگی کا کیا کہنا۔

غزل نمبر ۷

۱۔ شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

سبحہ = تسبیح کو کہتے ہیں جس میں عموماً سو دانے ہوتے ہیں۔ میرے محبوب کو تسبیح ہاتھ میں لیے رہنا اس لیے پسند ہے کہ اس طرح وہ گویا ایک ہی وقت میں سو دل اڑانے کا سماں سامنے لے آتا ہے۔ غیر دلچسپ خیال آرائی کے سوا اس شعر میں کچھ نہیں۔

۲۔ بہ فیضِ بیدلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے　　کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

فیضِ بیدلی = حسرت و مایوسی کا فیض یا صدقہ

نومیدیٔ جاوید = ناکامیٔ دائم۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی بڑی سخت گتھی تھی لیکن ہماری مایوسی نے زندگی کی تمام ناکامیوں کو آسانی سے جھیل کر اس کو آسانی سے سلجھا دیا اور کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل اس لیے پسند آیا کہ اس عقدہ کے حل کرنے میں اسے کسی کاوش سے کام لینا نہیں پڑا اور خود ہماری فطرت ہی نے اس کو حل کر لیا۔

۳۔ ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہریٔ قاتل　　　　کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

قاتل کا سیرِ گل کی خواہش کرنا، اس کی بے مہری کا ثبوت ہے کیونکہ جب وہ پھول کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ کوئی بسمل اپنے خون میں لوٹ رہا ہے۔

۴۔ جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ　　　　مبارک باد اسد غمخوارِ جانِ درد مند آیا

تحفہ، ارمغاں اور ہدیہ کا ایک مفہوم ہے۔

الماس۔ ہیرا۔ اس کے ٹکڑے زخم کو اور بڑھا دیتے ہیں "غمخوارِ جانِ دردمند" سے مراد محبوب ہے۔

مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اے اسد مبارک ہو کہ تمھارا محبوب جو تمھاری غمخواری کے لیے آیا ہے وہ جراحت، الماس اور داغِ جگر کے تحفے بھی اپنے ساتھ لایا ہے جو تمھیں بہت مرغوب ہیں یعنی وہ آیا تو تھا غمخواری کے لیے لیکن پہلے سے زیادہ تمھیں مجروح و دردمند بنا گیا۔

اگر غمخوار سے مراد ناصح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی نصیحتوں سے میری دردمندیاں اور بڑھ گئیں۔

غزل نمبر ۸

۱۔ سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　　　　یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

سبزۂ خط کو زمرد سے تشبیہ دی ہے اور کاکل کو افعی سے۔ یعنی تیرا سبزہ خط نمودار ہونے کے بعد بھی تیرے کاکل کی زہر افشانیاں کم نہ ہوئیں۔

مشہور ہے کہ زمرد کے سامنے سانپ اندھا ہو جاتا ہے لیکن کاکل کا افعی ایسا سخت افعی ہے کہ اس زمرد کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مدعا یہ کہ سبزۂ خط نمودار ہونے کے بعد بھی تیری زلف کا کل کی زہر افشانی کا عالم وہی ہے۔

۷۔ مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

اس شعر میں غالبؔ نے اپنی انتہائی ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ محبوب عیسیٰ نفس میرے اندر نئی زندگی پھونکنے آیا تھا لیکن یہاں ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے افسون زندگی پڑھنے کے لیے لبوں کو جنبش ہی دی تھی کہ میں اس جنبش کے صدمہ سے مر گیا۔

مدعا یہ ہے کہ میرا حال دعا و دوا دونوں سے گزر گیا ہے اور میری جانبری کی کوئی صورت باقی نہیں۔

غزل نمبر ۹

۱۔ ستائشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اس شعر میں زاہد کے تصور جنت پر طنز کیا گیا ہے کہ وہ جس چیز کو جنت سے تعبیر کرتا ہے ہماری نظر میں ایک گلدستہ سے زیادہ نہیں اور گلدستہ بھی وہ جسے ہم طاقِ نسیاں کے سپرد کر چکے ہیں یعنی جس کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔

مدعا یہ ہے کہ ہماری منزل عمل جنت کی طمع سے بہت بلند ہے اور ہمارا فلسفہ زندگی یہ نہیں کہ کسی لالچ یا غرض سے کوئی اچھا کام کریں۔

۲۔ بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

مژگانِ یار کی کاوشِ ستم کا حال کیا بیان کیا جائے جب کہ اس نے ہمارے ہر قطرۂ خون کو تسبیح مرجان کا دانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ (مرجان سرخ ہوتا ہے)۔

اس میں لفظ کاوش سے فائدہ اٹھا کر قطرۂ خوں کو دانۂ تسبیح ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ تسبیح کے دانے بھی سوراخ کر کے بنائے جاتے ہیں یہ شعر بھی محض الفاظ کا کھیل ہے اور نا گوار ندرت بیان۔

۳۔ نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت = رعب

دانتوں میں تنکا لینا = اظہارِ عجز و فرومایگی کو کہتے ہیں۔

بعض وحشی قبائل میں دستور تھا کہ جب دو مخالف قبیلے یکجا ہو جاتے تھے تو کمزور قبیلہ کا سردار قوی قبیلے کے سردار کے پاس دانتوں میں تنکا دبا کر جاتا تھا جس سے مقصود اپنی عاجزی کا اظہار ہوا کرتا تھا۔

مدعا یہ کہ میں قاتل کے سامنے اظہارِ عجز کے طور پر دانتوں میں تنکا لے کر گیا لیکن ہوا کہ تنکا ریشہ نیستاں بن گیا۔ یعنی بانسری کی طرح اس سے نالے پیدا ہونے لگے اور قاتل کا رعب بھی مجھے اس سے باز نہ رکھ سکا۔

۶۔ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

مضمر = پوشیدہ

ہیولا = اصل مادہ

خونِ گرم = محنت

میں اپنی تباہی کا گلہ کس سے کروں جبکہ خود میری ساخت و تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ ہے یعنی جس طرح دہقان کا محنت کر کے خرمن جمع کرنا بجلی گرنے کا باعث ہے۔ اسی طرح خود میرا وجود میری تباہی کا باعث ہے۔

۱۲۔ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

جادہ = اس لکیر یا نشان کو کہتے ہیں جو راہگیروں کے نقشِ قدم سے راستے میں پیدا ہو جاتا ہے۔

شیرازہ = اس تاگے (دھاگے) کو کہتے ہیں جو کسی کتاب کے اوراق کو یکجا کر دیتا ہے۔

مدعا یہ ہے کہ ہماری نگاہ میں اصل چیز راہِ فنا کا جادہ ہے کیونکہ آخر کار اسی سے شیرازۂ عالم کے تمام اجزائے پریشاں منسلک ہو جاتے ہیں یعنی زندگی محض پریشانی و آشفتگی کا نام ہے اور مرتے دم تک ان سے مفر نہیں لیکن مرنے کے بعد یہ سب انتشار ختم ہو جاتا ہے اور عالم کے تمام اجزائے پریشاں ایک ہو جاتے ہیں۔ جادہ اور شیرازہ میں فی الجملہ ظاہری مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

غزل نمبر ۱۲

۱۔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

محرم = آشنا، واقف

نواہائے راز = عالم غیب کی صدائیں

اس شعر کی بنیاد لفظ حجاب پر قائم ہے جس کے معنی پردہ کے بھی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ علائق دنیا کے حجابات حقیقت کے سمجھنے سے انسان کو باز رکھتے ہیں لیکن غالب کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ اگر انسان کے کان نواہائے راز اور عالمِ غیب کی صدا سے آشنا ہوں تو یہ حجابات بھی پردۂ ساز ہو جائیں اور ان سے سرمدی نغمے پیدا ہونے لگیں۔

۲۔ رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

رنگِ شکستہ = اُڑا ہوا رنگ۔ جب چہرہ کا رنگ اُڑتا ہے تو اس میں سفیدی سی جھلک آتی ہے اس لیے رنگِ شکستہ کو صبح سے تشبیہ دی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ میرے اڑے ہوئے رنگ کا نظارہ معشوق کے لیے گویا وقتِ صبح کا نظارہ ہے جب عام طور پر پھول کھلنا شروع ہوتے ہیں اس لیے میری رنگِ شکستہ کی صبح کو دیکھ کر محبوب کے گل ہائے ناز کو بھی کھلنا چاہیے۔ یعنی میری شکستگیٔ رنگ کو التفاتِ محبوب کا باعث ہونا چاہیے۔ اس شعر میں ناگوار تکلف و تصنع کے سوا کچھ نہیں۔

۵۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شیشہ باز = وہ شعبدہ باز جو سر پر شیشہ رکھ کر رقص کرتا ہے اور شیشہ نہیں گرنے پاتا۔

مفہوم یہ ہے کہ شیشہ جس میں شراب بھری ہے جوش بادہ سے ہر طرف اچھل رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بساط مے خانہ کا ہر گوشہ گویا کہ شیشہ باز کا سر ہے جس پر شیشے اچھل رہے ہیں۔

نہ مفہوم لطیف، نہ تعبیر و استعارہ قابلِ تعریف۔

غزل نمبر ۱۳

۱۔ گر ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب — آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

دیوانگی دُور کرنے کے لیے عموماً نشتر سے فصد کھولی جاتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ہر چند میں دیوانہ ہوں اور دوست بظاہر ہاتھ میں نشتر لے کر آیا ہے تا کہ وہ فصد کھول کر میری دیوانگی دُور کرے۔ لیکن میں اس فریب میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ آستین کے اندر دشنہ (خنجر) بھی چھپائے ہوئے ہے۔ اور اس کا مقصد فصد لے کر میری دیوانگی دور کرنا نہیں بلکہ دشنہ سے مجھے ہلاک کر دینا ہے۔

۵۔ ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

کہا جاتا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے حسن عمل کی جزا میں بہشت کا دروازہ قبر میں کھل جاتا ہے اس روایت کو سامنے رکھ کر غالب کہتا ہے کہ میں تو صرف حُسن یار کا تصور لے کر گور میں گیا تھا اور حُسنِ عمل سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی خُلد کا دروازہ کُھل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسن کا تصور بھی بجائے خود بڑا حُسنِ عمل ہے جس کی جزا میں خلد کا دروازہ میری گور کے اندر کھل گیا۔ ایک لطیف معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ حُسن کا تصور ہی بجائے خود خُلد آفریں ہے۔

۸۔ کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول — آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

پہلے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا سوال ہے کہ، شبِ غم اتنی تاریک کیوں ہے خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ شبِ غم میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ان بلاؤں کا تماشہ دیکھنے کے لیے آج دیدۂ اختر اُوپر ہی کی طرف مائل ہے زمین کا رخ نہیں کرتا اور یہی سبب ہے شبِ غم کی اندھیری کا۔

یہ شعر دُور از کار تخیّل کے سوا کچھ نہیں۔

۹۔ کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال — نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کُھلا

کسی وقت دستور تھا کہ موت یا کسی حادثہ کی خبر جب کسی خط میں دی جاتی تھی تو اسے بند نہ کرتے تھے بلکہ کھلا ہوا بھیجتے تھے۔ غالب نے اسی رسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مصائب کا

اظہار کیا ہے کہ آج کل نامہ بر وطن سے جو خط لاتا ہے وہ کھلا ہوا ہوتا ہے جس میں بری خبر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

غزل نمبر ۱۴

یہ غزل مسلسل ہے جس میں غالبؔ نے ایک طرف اپنے عالمِ فراق کی بیتابی و اضطراب فرطِ گریہ و اشکباری کا حال ظاہر کیا ہے اور دوسری طرف محبوب کے سرورِ نشاط اور عالمِ استغنا کا۔

۱۔ شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا — شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

زہرۂ ابر آب تھا = ابر کا پتہ پانی ہو گیا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ رات میرے سوزِ دل کی برق پاشی کا یہ عالم تھا کہ ابر کا پتہ بھی پانی ہو گیا تھا اور اُس میں جو بھنور پڑتے تھے وہ بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آتے تھے۔ اس شعر میں صرف شدتِ اضطراب کا ذکر ہے اور وہ بھی حد درجہ ناگوار مبالغہ کے ساتھ جس میں محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ثبوت کوئی نہیں۔

۲۔ واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

عناں گیرِ خرام = مانعِ خرام۔

پنبۂ بالش = تکیہ کی روئی۔

مفہوم یہ ہے کہ وہاں نہ آنے کے لیے ان کو یہ عذر تھا کہ بارش ہو رہی ہے اور یہاں بحالتِ مایوسی آنسوؤں نے وہ طوفان برپا کر رکھا تھا کہ تکیہ کی روئی کفِ سیلاب ہو کر رہ گئی۔

شعر میں ناگوار مبالغہ کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

مفہوم یہ کہ وہاں محبوب کے سنورنے کا یہ حال تھا کہ ایک ایک بال میں موتی پروئے جا رہے تھے اور یہاں بحالتِ انتظار فرطِ گریہ سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

یعنی اُدھر بالوں میں موتی پروئے جا رہے تھے اور اِدھر تارِ نظر میں درہائے اشک۔

۴۔ جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو　　یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

باغ میں سُرخ سُرخ پھولوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جوئے آب میں چراغاں ہو رہا ہے اور یہاں مجبوری کا یہ عالم تھا کہ خون کے آنسو رونے سے فرصت نہ تھی۔

۵۔ یاں سرِ پُر شور بیخوابی سے تھا دیوار جو　　واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

دیوار جو = دیوار ڈھونڈنے والا

یہاں بیخوابی میں بار بار جی چاہتا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا دیا جائے اور وہاں محبوب کے سکون و بے خبری کا یہ عالم کہ کمخواب کے تکیہ پر سر رکھے ہوئے آرام سے سو رہا تھا۔

۶۔ یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی　　جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

یہاں یہ عالم تھا کہ ہر ہر سانس سے بزمِ بیخودی کی شمع روشن ہوتی تھی اور وہاں اغیار کی صحبت سے لطف اٹھانے کے لیے فرشِ گل بچھا ہوا تھا۔

۷۔ فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

وہاں زمین سے آسمان تک لطف و نشاط کا طوفان برپا تھا اور یہاں محض جلنا ہی جلنا۔

غزل نمبر ۱۵

۱۔ نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا　　تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

یعنی رات میرا دل تڑپ تڑپ کر نالے کر رہا تھا لیکن بالکل بے اثر گویا میرا اضطراب دانہ سپند کا سا اضطراب تھا اور اس سے مقصود وصلِ غیر کو نظرِ بد سے بچانا تھا۔

دستور ہے کہ نظرِ بد سے بچانے کے لیے آگ میں دانہ سپند ڈالتے ہیں جو چیخ کر باہر آجاتا ہے۔ اس لیے نالۂ بے اثر کو سپند سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے　　خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مقدم سیلاب = سیلاب کی آمد

نشاط آہنگ = مسرور۔

سازِ صدائے آب = جلترنگ جس میں چینی کے پیالوں کے اندر پانی بھر کر لکڑی کی ضرب سے آواز پیدا کی جاتی ہے۔

سیلاب کی وجہ سے اپنے گھر کی تباہی پر میرا دل اس درجہ مسرور تھا کہ جو آواز گھر کے در و دیوار سے پیدا ہو رہی تھی۔ وہ صدائے جلترنگ کا سا لطف دے رہی تھی۔

۳۔ نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں ــــ پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

اندیشہ = خیال

سنجاب = ایک قسم کا قیمتی سمور

مفہوم یہ ہے کہ خاکساری اور خاک نشینی کے زمانے میں جو نازِ استغنا مجھے حاصل تھا اس کا ذکر کیا کروں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں بستر خاک پر نہیں بلکہ بسترِ سنجاب پر آسودہ ہوں۔

۴۔ کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ــــ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

کچھ نہ کی = یعنی کچھ نہ کیا۔

روکش = مقابل

مفہوم یہ ہے کہ اپنا جنون ناقص و نا تمام تھا اس لیے اس نے کچھ نہ کیا ورنہ صحرائے جنوں کا تو ذرہ ذرہ روکش آفتاب ہے اور اگر ہم اپنے جنون میں کامل ہوتے تو ہم بھی باوجود ذرۂ حقیر ہونے کے آفتاب کا مقابلہ کرتے۔

۵۔ یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا ــــ انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

محبوب سے کہتا ہے کہ وہ زمانہ یاد کر، جب شکار کی جستجو میں تیرے دام (جال) کا حلقہ (پھندا) دیدۂ بیخواب کی طرح کھلا رہتا تھا لیکن اب یہ دور ختم ہو گیا ہے کیونکہ تیرے دام میں اب اتنے صید آ چکے ہیں کہ اب کسی تازہ شکار کی تجھے فکر ہی نہیں۔

۶۔ میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے　　اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

کثرتِ اشکباری کا اظہار انتہائی مبالغہ کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اگر میں رات غالب کو رونے سے باز نہ رکھتا تو اتنا عظیم سیلاب برپا ہو جاتا کہ آسمان بھی ایسا نظر آتا گویا اس سیلاب کا کف (جھاگ) ہے۔

غزل نمبر ۱۶

۱۔ ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ودیعت = امانت

حالی نے "دینا پڑا" کا مفہوم دینا پڑے گا۔ ظاہر کیا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی مدعا یہ ہے کہ خونِ جگر صرف مژگانِ یار کی امانت تھا اور اسی کے لیے یہ خون بہنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں نے دنیا کے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب مژگانِ یار نے اس امانت کا حساب مجھ سے لینا چاہا تو مجھے پھر از سرِ نو خون کے آنسو بہانا پڑے اور اس امانت کو اس طرح واپس کیا۔

۲۔ اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

تمثال دار = عکس پیدا کرنے والا

آئینہ سے مراد آئینۂ دل ہے۔

آئینہ اگر ٹوٹا ہوا نہ ہو تو اس میں ایک ہی عکس نظر آئے گا لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اس کے ہر ٹکڑے میں الگ الگ صورت نظر آئے گی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر غالب کہتا ہے کہ تو نے میرا دل (جو تیری آرزو کا آئینہ دار تھا) ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے ہزاروں آرزوؤں کا ماتم دار بنا دیا۔

مدعا یہ ہے کہ دل ٹوٹنے سے میری تمناؤں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

غزل نمبر ۱۷

۲۔ جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے　　جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

از بسکہ = چونکہ

جوہر آئینہ لکیروں کو کہتے ہیں جو صیقل کے وقت آئینہ میں پڑ جاتی ہیں۔

تیرا جلوہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا ہر وقت اسی کو دیکھتی رہے اور تیرے اس تقاضائے جلوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ خود جوہر آئینہ بھی مژگاں ہو جائے یعنی تجھے دیکھنے کی تمنا کرتا ہے جوہر آئینہ کو مژگاں سے تشبیہ دی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دیکھنا مژگاں کا کام ہے یا نگاہ کا اگر یہ کہا جاتا کہ جوہر آئینہ تار نگہ بن جانا چاہتا ہے تو زیادہ موزوں ہوتا۔

غزل نمبر ۱۸

۱۔ شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا   تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

شوقِ ساقی = شوقِ آمدِ ساقی

رستخیز اندازہ = قیامت کے مانند۔

محیط بادہ = خط ساغر یا خود ساغر مراد ہے

مفہوم یہ ہے کہ رات ساقی کی آمد کا انتظار تھا اور اس کے نہ آنے سے ہم پر خمار کی کیفیت طاری تھی۔ لیکن یہ اس قیامت کی کیفیت تھی کہ مسلسل انگڑائیوں کی وجہ سے (جو لازمی نتیجہ ہیں خمار کا) خط ساغر یا خط شیشہ تک (یعنی تمام بزم بادہ میں) گویا ہنگامۂ قیامت کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔ انگڑائیوں میں چونکہ ایک صورت ہنگامہ و تلاطم کی پائی جاتی ہے اس لیے اسے "رستخیز اندازہ" کہا گیا۔

غالب کا یہ شعر دور از کار تخیل کے سوا کچھ نہیں اور اگر دونوں مصرعوں کی ردیف تھا کو بود کر دیا جائے تو فارسی کا شعر ہو جاتا ہے۔

۲۔ یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

دفتر امکاں = عالم موجودات و ممکنات۔

جادہ = راستہ

اس شعر میں وحشت و جنوں کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جب تک ہم نے دشت وحشت میں قدم نہ رکھا تھا ہم عالم امکاں کی حقیقت سے ناواقف تھے لیکن اس دشت میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ راہ جنوں تو ایک ایسا شیرازہ ہے جس سے دونوں عالم کے اجزاء وابستہ ہو جاتے ہیں۔

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ بقا و فنا کی حقیقت کا صحیح علم عقل و ہوش سے نہیں بلکہ وحشت و جنون ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۔ مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے   خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

صحرا گرد = مجنوں کی صفت ہے.

وحشت خرامی = وحشت و جنوں کی حالت میں چل پڑنا۔

مفہوم یہ ہے کہ مجنوں کا ٹھکانا تو صحرا تھا جہاں نہ کوئی دروازہ تھا نہ کوئی اور روک ٹوک پھر کیا وجہ تھی کہ لیلیٰ دیوانہ وار مجنوں تک نہ جا پہنچی۔ اسی خیال کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے:

"گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا"

۴۔ پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن   دست مرہونِ حنا، رُخسار رہنِ غازہ تھا

حُسن کے استغناء کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسبابِ آرائش سے بے نیاز رہے۔ مگر اس کے ہاتھوں میں مہندی اور رخسار پر گلگونہ لگانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسبابِ آرائش سے بے نیاز نہیں ہے جو حُسن کی انتہائی رسوائی ہے۔

۵۔ نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد   یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

فارسی میں چیزے را بباد دادن = تباہ و برباد کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ ہمارے نالوں نے دل کے ٹکڑے برباد و منتشر کر دیے حالانکہ نالہ کی یادگار یہی منتشر اوراقِ دل تھے اور اب بربادیِ دل کے بعد وہ یادگار بھی باقی نہ رہی۔

دوسرے مصرعہ میں یادگارِ نالہ کے بعد لفظ بھی محذوف ہے۔

غزل نمبر ۲۱

اس غزل کے کچھ اشعار مومنؔ کے رنگ کے ہیں:

۱۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

نشاطِ کار = کام کرنے کا حوصلہ

کاروبارِ عالم کی رونق صرف اس حقیقت پر منحصر ہے کہ دنیا ناپائیدار ہے اور ہر شخص کو مرنا ہے اسی خیال کے زیرِ اثر ہر شخص مصروفِ کار رہتا ہے۔ اگر موت کا کھٹکا نہ ہو تو پھر یہ تمام ہنگامۂ دنیا ختم ہو جائے اور جینے کا کوئی لطف باقی نہ رہے۔

۲۔ تجاہلِ پیشگی سے مدعا کیا   کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟

تجاہلِ پیشگی = جان بوجھ کر انجان بننا

یہ جو تم میری ہر بات پر انجان شخص کی طرح "کیا کیا" کہا کرتے ہو (گویا کچھ جانتے ہی نہیں) تو اس سے آخر تمھارا کیا مطلب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے حال سے خوب واقف ہو اور تمھارا یہ بار بار کا سوال تجاہلِ عارفانہ کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں   شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

دشمن پر آپ کی بیجا نوازشیں دیکھ کر اگر میں شکایتیں کرتا ہوں تو آپ کو اس کا گلہ کیوں ہے؟

شکایتوں کو رنگین اس لیے کہا گیا کہ اس کا تعلق محبوب اور غیر کے ربطِ رنگیں سے ہے۔

۴۔ نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں   تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بالکل بے حجاب اور بے تکلف ہو کر ملو لیکن تم تغافل سے کام لیتے ہو جو میرے لیے سخت صبر آزما ہے۔

۵۔ فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے   ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

خس = تنکا، گھاس پھونس۔

اہلِ ہوس کی محبت بالکل ایسی ہی ہے جیسے خس میں آگ لگا دی جائے اور وہ دم کے دم میں بھڑک کر ختم ہو جائے اس لیے ایسی ناپائیدار محبت کرنے والے سے وفا کی امید رکھنا عبث ہے۔

۶۔ نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے   تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا

ہماری ہر سانس خود اپنے ہی دریائے بیخودی کی موج ہے اس لیے ساقی کے تغافل کی شکایت بیکار ہے کیونکہ اس کے تغافل سے ہماری بے خودی میں تو کوئی کمی ہو نہیں سکتی۔

۷۔ دماغ عطرِ پیراہن نہیں ہے۔ غمِ آوارگیہائے صبا کیا

غالب کا یہ شعر باوجود سادہ ہونے کے کافی اُلجھا ہوا ہے۔ عطر محض خوشبو کو کہتے ہیں اس لیے عطر پیراہن کے معنی "خوشبوئے لباس" کے ہوئے۔

"دماغ نہ ہونا" یعنی برداشت نہ ہو سکنا۔

سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیراہن مراد ہے؟ اپنا یا محبوب کا! بعض حضرات نے خود غالب کا لباس قرار دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں لباس یار مراد ہے اور غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر صبا کی آوارگی پیراہن محبوب کی خوشبو کو ادھر اُدھر لیے پھرتی ہے اور ہم تک نہیں پہنچاتی تو ہم کو اس کا غم کیوں ہو جب کہ خود ہم میں اس خوشبو سے لطف اٹھانے کی تاب نہیں۔

۸۔ دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

جس طرح پانی کے ہر قطرہ کا (اس لحاظ سے کہ وہ سمندر ہی کا ایک جزو ہے) یہ دعویٰ کرنا کہ "میں سمندر ہوں" بیجا نہیں ہے۔ اس طرح اگر ہم بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم وہی (یعنی خدا) ہیں تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ہم بھی اُسی کا ایک جزو ہیں۔

غزل نمبر ۲۳

۱۔ اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

"جنوں جولاں گدا" اور "بے سروپا" دونوں صفتیں گدائی ہیں یعنی ایک بے سروپا قسم کا جنون رکھنے والا صحرانورد گدا۔

"پشت خار" پیٹھ کھجانے والا آلہ۔ لوہے یا کسی اور دھات کا بنا ہوا آلہ جس کے سرے پر پیٹھ کھجانے کے لیے پنجہ بنا ہوتا ہے۔ اور فقرا اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم ایسے جنون زدہ فقیر ہیں کہ صحرا کے سوا ہمارا کہیں ٹھکانا نہیں اور بے سروپائی یا بے سامانی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس پشتِ خار تک نہیں اور اُس کا کام ہم پنجۂ مژگانِ آہو سے لیتے ہیں۔ یعنی کثرت صحرانوردی سے غزالانِ صحرا بھی ہم سے اس درجہ آشنا ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی پلکوں سے ہماری پیٹھ تک کھجا دیتے ہیں۔

غزل نمبر ۲۴

۱۔ پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا — بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

ہماری شرمِ نارسائی الطافِ خداوندی حاصل کرنے کے لیے صرف ایک ہی تحفہ رکھتی ہے۔

اور وہ تحفہ صرف اُس دعوائے پارسائی کا ہے جو سو سو طرح سے خون آلود (ناکام) ہے۔

یعنی خدا کے حضور میں ہم اعترافِ گناہ کے سوا کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتے اور ہماری یہی معذرت ممکن ہے عفو و درگزر کا سبب ہو سکے۔

۲۔ نہ ہو حُسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا — بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

حُسنِ تماشا دوست = وہ حُسن جو نمود و نمائش پسند کرتا ہے۔

رسوا بے وفائی کا = اپنی بیوفائی کی وجہ سے بدنام۔

مفہوم یہ ہے:-

چونکہ "حُسن تماشا دوست" ہے اور اس نے ساری دنیا کو دعوتِ نظارہ دے دی ہے اس لیے اُس پر الزام بے وفائی قائم کرنا درست نہیں بلکہ اس طرح تو سینکڑوں تماشائیوں کی نگاہیں جو اس کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہیں، اس کے دعوائے پارسائی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں۔

۳۔ زکوٰۃِ حُسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا — چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

شاعر محبوب سے درخواست کرتا ہے کہ ہمیں بھی اپنے جلوہ کی زکوٰۃ مرحمت کرتا کہ اس کی روشنی سے ہمارا کاسۂ گدائی چراغِ خانہ کا کام دے۔ مدعا یہ ہے کہ ہمارے تاریک دل کو بھی اپنے جلوہ سے روشن بنا دے۔

۴۔ نہ مارا جان کر بے جرم، قاتل تیری گردن پر — رہا مانندِ خونِ بیگنہ حق آشنائی کا

اس شعر میں مصرعِ اول کے آخری ٹکڑے کو دوسرے مصرع کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ غالب اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ میں تیرے پاس اس لیے گیا تھا کہ مجھے قتل کر دے۔ لیکن تو نے یہ سمجھ کر کہ میں بے جرم ہوں اور بے جرم کو قتل کرنا اس کا خون اپنی گردن پر لینا ہے۔ مجھے قتل نہیں کیا۔ حالانکہ اس صورت میں تو نے مجھے قتل نہ کر کے حق دوستی کا خون کر دیا۔ کیونکہ حق

دوستی یہی تھا کہ تو مجھے قتل کر دیتا یہ شعر غالب نے مومن کے رنگ میں لکھا تھا اور پاکیزگی بیان کے لحاظ سے اس کے بہترین اشعار میں شمار کیا جاتا ہے۔

۵۔ تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے مٹا جس سے تقاضہ شکوۂ بے دست و پائی کا

زبان کی تمنا یا تقاضا یہ تھا کہ محبوب سے اپنی بے دست و پائی کا شکوہ کیا جائے لیکن جب اپنی بے زبانی مجبوری و (بیچارگی) نے اس کی اجازت نہ دی تو محبوب کو خود رحم آ گیا اس لیے ہم کو دراصل اپنی بے زبانی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو حصول مدعا کا سبب بنی۔

۶۔ وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

مدعا یہ ہے کہ میرا نفس (یعنی میری نوا) اور نکہت گل دونوں ایک ہی سے ہیں کیونکہ چمن میں بہار آتے ہی پھولوں کی خوشبو اور میری خوشنوائی دونوں ساتھ ساتھ شروع ہو جاتی ہیں۔

۷۔ دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

پیغارہ جو = طعنہ زن

اس شعر کے سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لیجیے ایک یہ کہ زنجیر کی کڑی دہن سے مشابہ ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ دہنِ معشوق کو شعراء اس کی تنگی ظاہر کرنے کے لیے "معدوم" کہتے ہیں۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی دہن معشوق ایسا نہیں جو تیری بے وفائی پر طعنہ زن نہ ہو اور اس طرح اس زنجیر رسوائی کا چرچا عدم تک پہنچ گیا ہے (کیونکہ دہن معشوق معدوم ہے اور جو بات معشوق کی دہن سے نکلے گی وہ گویا دنیائے عدم ہی کی بات ہوگی۔ غالب کا یہ شعر بھی ناگوار تکلف و دور از کار تخیل کے سوا کچھ نہیں۔

غزل نمبر ۲۵

۱۔ گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہو جائے گا بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہو جائے گا

دوسرے مصرعہ میں مُہر دہاں کو مقدم اور داغ مہ کو موخر کر دیجیے تو مطلب صاف ہو جاتا

ہے۔ یعنی اگر شبِ فرقت کی تکلیف میں نے بیان نہ کی تو بھی میری یہ خاموشی (مہرِ دہاں) داغِ ماہ کی طرح سب پر آشکار ہو جائے گی۔ مہر اور داغ کی مشابہت ظاہر ہے۔

۲۔ زہرہ اگر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب　　　پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

اگر شامِ ہجر کی تکلیف میں پتہ پانی ہو جاتا ہے تو عجب نہیں کہ پرتو مہتاب (چاندنی) بھی آب آب ہو جائے اور میرا گھر اس سیلاب میں ڈوب جائے۔

مدعا یہ کہ چاندنی رات میں ہجر و جدائی کا احساس بہت زیادہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔

۶۔ گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط　　　شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

مفہوم یہ ہے کہ اگر تیری نگاہِ گرم (نظرِ عتاب) اسی طرح مجھے ضبطِ محبت پر مجبور کرتی رہی تو میرا خون میری رگوں میں بالکل اسی طرح نہاں (خشک) ہو جائے گا، جیسے خس میں شعلہ پنہاں رہتا ہے (خس میں شعلے کا پنہاں رہنا اس لیے تصور کیا گیا کہ خس میں جل جانے کی اہلیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے)۔

غزل نمبر ۲۶

۱۔ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جس طرح نمرود کی خدائی سے نمرود کو کوئی فائدہ نہ پہنچا اسی طرح میری بندگی سے بھی میرا بھلا نہ ہوا۔ گویا میری بندگی اور نمرود کی خدائی دونوں ایک سی چیز تھیں۔

اس شعر کا حُسن یہ ہے کہ اس میں بندگی کا مرتبہ خدائی تک پہنچا دیا ہے۔

۸۔ زخم گر دب گیا لہو نہ تھما　　　کام گر رُک گیا روا نہ ہوا

پہلے مصرعہ کو اس طرح پڑھیے جیسے کسی واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسرے مصرعہ کو حیرت و استعجاب کے لہجہ میں۔ مفہوم یہ ہے کہ جب ہمارا کوئی کام رُکا تو وہ رُکا ہی رہا (روانہ ہوا) برخلاف اس کے ہمارے زخم کا یہ حال ہے کہ دبنے کے بعد بھی اس سے لہو رستا رہا۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جس

طرح لہو نہیں رکا۔ کام بھی نہ رکنا چاہیے تھا۔

مدعا یہ کہ میری بدنصیبی کبھی کسی بات میں کامیاب ہونے نہیں دیتی اور ہر بات کا اثر الٹا ہوتا ہے۔

غزل نمبر ۲۷

۱۔ گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اس شعر میں شوق کی تعبیر اضطراب دریا سے کی گئی ہے اور دل کی گہر سے۔

مفہوم یہ ہے کہ میرے شوق محبت کی شدت و وسعت کا یہ عالم ہے کہ دل ایسی چیز میں بھی (جو وسعت دو جہاں اپنے اندر رکھتا ہے) نہیں سما سکتا تھا۔ لیکن مجبوراً اسے دل کے اندر ہی سمانا پڑا۔ گویا یوں سمجھئے کہ ایک اضطراب تھا دریا کا جو گہر کے اندر بند ہو گیا۔

۳۔ حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی — دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

اگر بہار ایسی ہی ناپائیدار آنے جانے والی چیز ہے تو اس کی حیثیت حنائے پائے خزاں سے زیادہ نہیں یعنی جس طرح مہندی کا رنگ چند دن کے بعد غائب ہو جاتا ہے اسی طرح بہار کی رنگینی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا کا کوئی عیش پائیدار نہیں اور اس کا نتیجہ ہمیشہ رنج و ملال ہی ہوا کرتا ہے۔

۷۔ نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے — مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

''جمع و خرج دریا'' سے مراد دریا کا مسلسل بہاؤ ہے۔

ناصح یا ہمدم سے خطاب ہے کہ میری گریہ وزاری جو تو دیکھ رہا ہے، میری حسرت کے لحاظ سے بہت کم ہے کیونکہ میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ آنسوؤں کے دریا جاری کر دے اور پھر بھی بس نہ کرے۔

غزل نمبر ۲۸

۱۔ قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس شعر میں غالب نے ''نفس پروری'' کا استعمال سانس روک کر دم بخود رہ جانے کے

مفہوم میں کیا ہے جو خود غالب کی اختراع ہے۔

''خطِ جام'' سے مراد وہ خط ہے جو ایک خاص انداز ہ یا ناپ ظاہر کرنے کے لیے جام کے چاروں طرف کھینچ دیا جاتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جب محبوب نے جامِ شراب اپنے ہونٹوں سے لگایا تو شراب کے قطرے اس کے چہرے کا عکس پڑنے سے اس قدر حیرت زدہ ہوئے کہ خطِ جام پر وہ جم کر رہ گئے اور اس طرح خطِ جام گویا موتیوں کا ہار ہو کر رہ گیا۔

۲۔ اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

میرے عشق پر محبوب کو اس قدر اعتماد و یقین ہے کہ جب غیر آہ کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے آہ کی ہوگی اور مجھ پر خفا ہوتا ہے پھر جب حالت یہ ہو تو میری تباہی و خانہ خرابی کی حد و پایاں کیا ہو سکتی ہے۔ یہ شعر مومن کے رنگ کا ہے۔

غزل نمبر ۲۹

۲۔ اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

''حیرت کدہ سے مراد یہاں آئینہ ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب وہ شوخیٔ ناز کے ساتھ آئینہ دیکھتا ہے تو جوہرِ آئینہ بھی طوطیٔ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔

فولاد کے آئینوں میں صیقل کرنے سے سبزی مائل نشانات پیدا ہو جاتے ہیں جنھیں ''جوہرِ آئینہ'' کہتے ہیں۔ جوہر کی سبزی اور تڑپ کے لحاظ سے اس کو ''طوطیٔ بسمل'' کہا گیا ہے۔

۳۔ یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا — عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

عربدہ = جنگ۔

اس شعر میں دوسرے مصرعے کو پہلے پڑھیے اور پہلے مصرعے کو اس کے بعد کیونکہ پہلے مصرعے میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے وہ نتیجہ ہے دوسرے مصرعہ کے مضمون کا۔

مفہوم یہ ہے کہ میری کم ہمتی نے دلِ امیدوار کے اندر ایک ایسا طلسم پیدا کر دیا ہے جہاں یاس و امید میں ہر وقت جنگ ہوتی رہتی ہے اور کوئی فیصلہ نہیں ہو چکتا۔

طلسم کے ساتھ جنگ کا خیال اُن داستانوں سے لیا گیا ہے جن میں طلسم بند و طلسم کشا کے درمیان ہمیشہ جنگ دکھائی گئی ہے۔

غزل نمبر ۳۳

۱۔ یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

جادہ = راستہ، مگر یہاں باغ کی روش مراد ہے۔

فتیلہ = چراغ کی بتی۔

مفہوم یہ ہے کہ باغ کا کوئی حصہ بیکار نہیں، یہاں تک کہ باغ کی روش بھی (جو پھولوں سے خالی ہوتی ہے) لالہ کے چراغوں کے لیے فتیلہ کا کام دیتی ہے۔ (لالہ کے درخت عموماً روش کے کنارے ہی نصب کیے جاتے ہیں۔

۲۔ بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

پہلے مصرع میں "آشوب آگہی" کی ترکیب غور طلب ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ اُسے مقلوب ترکیب اضافی مانا جائے (بہ معنی آگہی آشوب) دوسری یہ کہ اسے معمولی اضافی ترکیب جان کر خود آگہی کو آشوب قرار دیا جائے۔

ہر چند لفظ طاقت کے ساتھ پہلی ترکیب زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے لیکن غالبؔ کے پیش نظر دوسری ترکیب تھی جس میں اس نے خود آگہی کو آشوب یا ہنگامہ قرار دیا ہے۔

لفظ طاقت کے معنی صرف قوت کے ہیں اس لیے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لیے طاقت کے بعد کوئی لفظ بہ معنی "برداشت" یا "تحمل" محذوف ماننا پڑے گا اور فارسی میں اس قسم کے محذوفات سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً طاقت مہماں نداشت، خانہ بہ مہماں گزاشت، کہ اس میں طاقت کے بعد لفظ میز بانی یا پذیرائی محذوف ہے۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ نہ ہوش و آگہی کا ہنگامہ اتنا بڑا ہنگامہ ہے کہ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ شراب پی کر اس ہوش و آگہی کو ختم کر دیا جائے۔

فارسی میں "خط کشیدن" "مٹا دینے، یا محو کر دینے" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالبؔ

نے خط کے ساتھ لفظ ایاغ (جام شراب) کا اضافہ کر کے ظاہر کر دیا کہ آشوب آگہی کو جام شراب ہی سے دُور کیا جا سکتا ہے۔

عجز حوصلہ سے خود اپنی بے حوصلگی مراد ہے جو ہنگامۂ ہوش و آگہی کو برداشت نہیں کر سکتی۔

۶۔ بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار   یہ میکدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا

"میکدہ" سے یہاں مراد آنکھ ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ آج کل میری آنکھوں سے خونِ دل نہیں بہتا تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ موجِ نگہ خشک ہو کر غبار ہو گئی ہے۔ گویا میکدہ میں شراب نہ ہونے کی وجہ سے خاک سی اُڑ رہی ہے۔

۷۔ باغِ شگفتہ تیرا، بساطِ نشاطِ دل   ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

پہلے مصرعہ کے محذوفات کو سامنے رکھنے کے بعد مفہوم یہ ہوگا کہ میرے نشاطِ دل کا سبب تیرے ہی حسن کا باغ شگفتہ ہو سکتا ہے۔ محض موسمِ بہار میں شراب نوشی سے مجھے سرور و انبساط حاصل نہیں ہو سکتا۔

غزل نمبر ۳۴

۱۔ وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا   رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

مفہوم یہ ہے کہ جس طرح خط کے عنوان سے بے ربطیٔ تحریر کا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح اسے میری چین پیشانی دیکھ کر میرے غمِ پنہاں کا حال معلوم ہو گیا۔

اس شعر میں چینِ جبیں کو بے ربطیٔ عنواں اور غمِ پنہاں کو رازِ مکتوب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۔ یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

فولادی آئینہ میں جب صیقل کی جاتی ہے تو اس میں الف کی طرح لکیریں نمایاں ہو جاتی ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ جب سے میں نے گریباں کو گریباں سمجھا اس وقت سے اسے چاک کرتا شروع کر دیا لیکن میری دیوانگی اب تک صیقل کی لکیر سے آگے نہیں بڑھی۔ چاک کی صورت بھی الف کی طرح کھنچی ہوئی ہوتی ہے اور صیقل کی لکیر بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔

۵۔ عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا　　نبضِ خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

نبضِ خس سے مراد خس ہے۔ جس طرح خس (تنکے) کو دیکھ کر اس کے جل جانے کی اہلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اسی طرح میں اپنی بیچارگی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ محبوب یقیناً بدخو اور تند مزاج ہوگا یعنی جس طرح خس کی قسمت میں آگ سے جل جانا لکھا ہے اسی طرح محبوب کی برہمی سے میرا تباہ و برباد ہو جانا بھی مقسوم ہو چکا ہے۔

غزل نمبر ۳۵

۱۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل ، جگر تشنۂ فریاد آیا

جگر تشنہ (سخت تشنہ)

شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے پڑھا جائے اور پہلا مصرعہ اس کے بعد تو مفہوم یہ پیدا ہوگا کہ جب دل فریاد کے لیے بیتاب ہوا تو مجھے اپنا دیدۂ تر بھی یاد آیا یعنی وہ وقت یاد آ گیا۔ جب میں فریاد کے ساتھ روتا بھی رہتا تھا لیکن اگر دونوں مصرعوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر غور کیا جائے تو دوسرا مفہوم یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے مجھے پھر اپنا زمانِ اشکباری یاد آ گیا اور میں پر لذت اشکباری حاصل کرنے کے لیے فریاد پر بیتاب ہو گیا۔ دونوں صورتوں میں مفہوم قریب قریب ایک ہی سا رہتا ہے۔

۳۔ سادگی ہائے تمنا ، یعنی　　پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

نیرنگ نظر میں "اضافت" نہیں بلکہ پورا فقرہ صفت ہے محبوب کی۔

مفہوم یہ ہے کہ میری تمناؤں کی سادگی کو دیکھئے کہ باوجود اس علم و تجربے کے کہ محبوب پُر فن فریب میں مبتلا رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گا میں پھر بھی اس کی تمنا کرتا ہوں اور اس سے وفا یا لطف و کرم کی توقع رکھتا ہوں۔

۹۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں گھر کی ویرانی سے گھبرا کر صحرا گیا۔ لیکن وہاں بھی وہی گھر کی سی ویرانی دیکھی۔

اس شعر میں (بقول حالی) صرف یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ دشت اور گھر کی ویرانی بالکل ایک سی ہے۔ لیکن اس شعر میں حُسن اس وقت پیدا ہوتا جب یہ ظاہر کیا جاتا کہ میرا گھر دشت سے زیادہ

ویران ہے۔ اگر پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ "دشت کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہے"۔ تو بیشک گھر کی ویرانی دشت سے بڑھ جاتی ہے لیکن لفظ "سی" نے یہ مفہوم پیدا نہ ہونے دیا۔

۱۰۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر میں غالبؔ نے اپنے ازلی وفطری عاشق و مجنوں ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ جب لڑکپن میں بھی مجنوں کے سر پر پتھر پھینکنے کا خیال مجھے پیدا ہوا تو میں رک گیا اور مجھے اپنا سر یاد آگیا کہ ایک وقت مجھے بھی دیوانہ ہونا ہے اور میرے سر پر بھی لڑکے پتھر پھینکیں گے۔

غزل نمبر ۳۶

۱۔ قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہاں کچھ اک رنج گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

شعر کا مطلب صاف ہے۔ لیکن پہلے مصرعہ میں لفظ ہے زمانۂ حال کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں تھا زمانہ ماضی کو اگر پہلے مصرعہ میں ہے کو تھا سمجھا جائے تو یہ تناقض دور ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے اس شعر کا مفہوم یہ ہو کہ جس وقت میں مقید کیا گیا تھا اس وقت یہ خیال ضرور پیدا ہوا تھا کہ ممکن ہے زنجیر کا بوجھ ناقابل برداشت ہو لیکن اب قید ہو جانے کے بعد تیری زلف کی یاد کے علاوہ گرانباریٔ زنجیر کا خیال ختم ہو گیا۔

۷۔ دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا نالہ کرتا تھا و لے طالب تاثیر بھی تھا

غیر کا نالہ کرنا اور پھر تاثیر کا متمنی ہونا ظاہر کرتا ہے کہ غیر کامیاب نہ تھا اور اس کی ناکامی کا خیال ہمارے لیے باعث تسکین تھا۔ یہ شعر مومنؔ کے رنگ کا ہے۔

غزل نمبر ۳۷

۱۔ "لب خشک در تشنگی" مردگاں کا زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

پہلے مصرعہ میں لب خشک کے بعد یا پہلے "میں ہوں" محذوف ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ تشنگی (شوق) میں جان دے چکے ہیں میں اُن سب کا لب خشک ہوں یعنی ان سب کی تشنگی مجھ میں سما گئی ہے اور اس لیے تمام آزردہ دل لوگ میرا احترام

کرتے ہیں۔

۲۔ ہمہ ناامیدی ، ہمہ بدگمانی   میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

جس طرح فریب وفا میں مبتلا رہنے والوں کا دل ہمیشہ ناامیدی و بدگمانی کا شکار رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں بھی فریب وفا میں مبتلا ہو کر یکسر ناامیدی و بدگمانی کا شکار ہو گیا ہوں۔

غزل نمبر ۳۸

۱۔ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا   اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

''اے ستمگر تو دنیا میں کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ تو نے غیروں پر وہ ظلم کیے جو کبھی مجھ پر بھی نہ کیے تھے۔'' اس شعر میں غالب نے ایک طرف یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ وہ کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ اغیار بھی اس کے ظلم سے نہ بچ سکے اور ان پر مجھ سے زیادہ ستم روا رکھا گیا اور دوسری طرف اپنے جذبۂ رشک کو ظاہر کیا ہے کہ غیروں پر ظلم بھی کیا تو ایسا جو انھیں کے لیے مخصوص تھا اور میں اس سے محروم رہا۔ یہ شعر بھی مومن کے رنگ کا ہے۔

۲۔ چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے   خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

''مہِ نخشب'' سے مراد حکیم مقنع کا وہ مصنوعی چاند ہے جو اس نے بعض کیمیائی اجزاء سے بنایا تھا اور کچھ دیر روشن رہتا تھا۔

غالب اسی تلمیح و تشبیہ کو سامنے رکھ کر کہنا چاہتا ہے کہ جس طرح ''ماہ نخشب'' اصلی چاند کا مقابلہ نہ کر سکا اور حکیم مقنع نے اس کوشش کو ترک کر دیا۔ اسی طرح قدرت نے بھی چاہا تھا کہ وہ محبوب کی تابش حسن کے مقابلہ میں خورشید بنائے لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اس میں کامیابی ممکن نہیں تو پھر یہ خیال ترک کر دیا اور خورشید جیسا ناقص تھا ویسا ہی رہ گیا۔ مدعا یہ کہ میرے محبوب کی تابشِ جمال کا مقابلہ سورج نہیں کر سکتا۔

۳۔ توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

قدرت کا دستور ہے کہ جو شخص جتنی ہمت کرتا ہے۔ اتنی ہی توفیق اس کو عطا ہوتی ہے۔

قطرۂ نیساں نے صرف موتی بننے کی تمنا کی اور وہ موتی بن گیا لیکن وہ قطرہ آب جس نے اس سے زیادہ ہمت کی وہ آنسو بنا۔ مدعا یہ کہ آنسو کی قیمت موتی سے زیادہ ہے۔

۵۔ میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں　　یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

دوست کی آزردگی سے میں اس لیے خوش ہوں کہ اس طرح مجھے دوبارہ اظہار شوق اور محبوب کو منانے کا موقع ملے گا۔ لیکن اس خیال کو بلحاظ نتیجہ وہ محض سادہ دلی سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح آزردگیٔ یار دور نہ ہو سکے گی اور اگر ہوئی بھی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ تاہم وہ صرف اس لیے خوش ہے کہ اس بہانہ سے اظہار شوق و محبت یار کا موقع اُسے پھر مل جائے گا۔

۷۔ جاری تھی اسدؔ داغ جگر سے مری تحصیل　　آتش کدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

مشہور ہے کہ جب آتش کدہ میں صدیوں تک آگ مسلسل روشن رہتی ہے تو اس میں ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جسے سمندر کہتے ہیں۔

تحصیل سے مراد ''تحصیل آتش نفسی'' ہے۔ مدعا یہ کہ میرے داغ جگر کی گرمی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب آتش کدہ میں سمندر بھی پیدا نہ ہوا تھا اور اس طرح دنیا کا کوئی آتشکدہ میرے داغ جگر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

غزل نمبر ۳۹

۱۔ شب کو وہ مجلس فروز خلوتِ ناموس تھا　　رشتۂ ہر شمع خار کسوتِ فانوس تھا

خلوت ناموس = خلوت شرم وحیا۔

رشتۂ شمع = شمع کے اندر کے دھاگے کو کہتے ہیں۔

کسوت = لباس۔

مفہوم یہ ہے کہ رات کی خلوتِ شرم وحیا میں جب وہ جلوہ افروز ہوا تو ہر شمع خار و پیراہن مضطرب نظر آنے لگی کیونکہ اُس کی خلوتِ ناموس اس کی متقضی نہ تھی کہ وہاں شمع کا وجود بھی پایا جاتا۔

کسوتِ فانوس کو پیراہن اور رشتۂ شمع کو خار قرار دینا فارسی محاورہ ''خار و پیراہن'' سے ماخوذ ہے۔ اس شعر میں محبوب کے تقدسِ شرم وحیا کا اظہار بیدلؔ کے انداز میں کیا گیا ہے۔

۳۔ حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو　　　　دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

مفہوم یہ ہے کہ الفت اگر کامیاب ہو تو بھی اُس کا انجام مایوسی اور شکستِ آرزو کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ اگر عاشق و محبوب دونوں کے دل ایک دوسرے سے پیوستہ (ملے ہوئے) نظر آئیں تو بھی ان کی حالت ایسی رہے گی جیسے افسوس کی حالت میں لب مل جاتے ہیں۔

۴۔ کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں　　　　جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

"کیموس" ہضم طعام کا دوسرا درجہ ہے جب غذا معدہ میں رقیق ہو کر خون کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پہلا درجہ ہضم کیلوس کہلاتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ بیماریٔ غم کی فراغت کا یہ عالم ہے جو کچھ میں کھاتا ہوں وہ کیموس کی منزل سے گزرے بغیر خون بن جاتا ہے اور گویا صحیح معنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کھانا نہیں کھاتا بلکہ خون کھاتا ہوں۔

غزل نمبر ۴۱

۱۔ بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے　　　　یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

شش جہت = ہر طرف ہر جگہ۔

"یاں" سے مراد زمانہ یا نظامِ فطرت ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ قدرت ناقص و کامل کا امتیاز نہیں کرتی۔ اس نے چاروں طرف درِ آئینہ باز کر دیے ہیں اور ہر شخص اپنی تصویر (وہ جیسی بھی ہو) اس کے اندر دیکھ سکتا ہے۔

۵۔ وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن　　　　غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

یعنی میرے جذبۂ شوق نے حسن کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ اور اس کے مطالعہ کے لیے اب اگر کوئی چیز حائل ہے تو صرف نگاہ۔

مدعا یہ کہ حجاباتِ حسن دور ہونے کے بعد ہی حسن کا صحیح مطالعہ ہو سکتا ہے۔

غزل نمبر ۴۲

۲۔ ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے　　　　گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

میخانۂ نیرنگ = طلسم زارِ عالم۔

چشمک ہائے لیلیٰ = (لیلیٰ کے اشارہ ہائے چشم) اردو میں چشمک کا استعمال رنجش کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مجنوں کی صحرانوردیاں صرف لیلیٰ کے اشارہ چشم کی آشنا وتابع ہیں۔اس طرح دنیا کا ذرہ ذرہ قدرت کے میخانۂ نیرنگ کا ساغر ہے اور اسی کے اشاروں پر گردش کرتا ہے۔یعنی تمام مظاہر وآثار ایک خاص قانون قدرت کے پابند ہیں جس سے انحراف ممکن نہیں۔

۳۔ شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز   ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

ساماں طراز = سامان مہیا کرنے والا

دستگاہ = اہلیت وقابلیت

صحرا دستگاہ = صفت ہے ذرہ کی اور "دریا آشنا" صفت ہے قطرہ کی۔یعنی وہ ذرہ جس میں صحرا کی سی وسعت ہے اور وہ قطرہ جو دریا کی طرح وسیع ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم اربابِ عجز کے فخر وناز کے لیے ہمارا شوقِ محبت کافی ہے جو یعنی ذرہ آسا اور قطرہ تمثال ہستی میں صحرا کی سی وسعت اور دریا کی سی سمائی پیدا کر دیتا ہے۔

۴۔ کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ   سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

فرہاد محض ایک نقاش تھا جو پتھر کاٹ کر شیریں کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔اگر صحیح معنی میں وہ شیریں کا عاشق ہوتا تو یہ بھی کوئی بات تھی کہ وہ پتھر پر سر مارتا اور شیریں سامنے نہ آجاتی۔مراد یہ کہ فرہاد کا عشق، عشقِ صادق نہ تھا۔

غزل نمبر ۴۵

۱۔ غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں   بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

غافل انسان اس وہم میں مبتلا ہے کہ اُس کی فلاح وصلاح خود اس کی کوشش وتدبیر کا نتیجہ ہے، حالانکہ دراصل سب کچھ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے حتیٰ کہ گھاس ایسی حقیر چیز کی زیبائش میں بھی صبا کا ہاتھ شامل ہے۔

۶۔ بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ   صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

عیش کو تمنا سے الگ بغیر اضافت کے پڑھنا چاہیے۔ (یعنی عیشِ تمنا نہیں)

مفہوم یہ ہے کہ مے نوشی سے یہ تمنا رکھنا کہ وہ باعثِ مسرت وانبساط ہوگی صحیح نہیں کیونکہ یہ ایک ایسا صید ہے جو اس دامگاہ سے نکل کر بھاگ چکا ہے یعنی مسرت کے خیال سے مے نوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اسی خیال کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔

ع مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

غزل (۴۶) صاف ہے۔

غزل نمبر ۴۷

۱۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

پہلے مصرع میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ لطافت بغیر کثافت کے یا روحانیت بغیر مادی ذرائع کے پیدا نہیں ہو سکتی اس کا ثبوت دوسرے مصرعہ میں یہ پیش کیا گیا ہے کہ بادِ بہاری جو بجائے خود بڑی لطیف چیز ہے اس کا علم ہمیں چمن ہی کی وساطت سے ہوتا ہے حالانکہ چمن کی حیثیت آئینۂ بہار کے زنگار کی سی ہے جو کثیف چیز ہے۔

آئینہ کے پیچھے جب تک زنگ نہ پیدا کیا جائے وہ عکس پذیر نہیں ہوتا۔

۲۔ حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل   جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

مفہوم یہ ہے کہ ساحل لاکھ خوددار ہو لیکن جب دریا جوش پر آتا ہے تو وہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح جس محفل کا ساقی تو ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

غزل نمبر ۴۸

۹۔ تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل   دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ہوائے صیقل = صیقل کی خواہش۔

برسات میں آئینۂ فولاد پر زنگ آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زنگاری صیقل آئینہ کا باعث ہوتا ہے۔ مدعا یہ کہ جب شوق کامل ہوتا ہے تو اس کے پورا ہو جانے کے اسباب خود پیدا ہو جاتے ہیں۔

غزل نمبر ۵۰

۱۔ افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے　　جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت

یعنی وہ انگلیاں جو کسی وقت موتی کی لڑی سے کھیلتی تھیں آج وہی انتہائے حسرت و یاس کے عالم میں دانتوں سے کاٹی جا رہی ہیں۔

غزل نمبر ۵۳

۱۔ آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست　　دودِ شمعِ کشتہ تھا، شاید خطِ رخسارِ دوست

جس طرح شمع گل ہونے پر پروانے نظر نہیں آتے اسی طرح سبزۂ خط نمودار ہونے سے بازارِ دوست سرد ہو گیا یعنی اس کے عشاق کم ہو گئے۔ گویا سبزۂ خط بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا۔

۳۔ خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے　　صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

خانہ ویراں سازی = گھر اُجاڑنا۔

تماشا کیجیے = دیکھیے، فارسی میں تماشا کردن دیکھنے کے معنی میں مستعمل ہے۔

رفتہ = وارفتہ۔

محبوب ایک راستہ سے گزرتا ہے اور عاشق اس کی رفتار کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں بھی گویا نقشِ قدم ہوں اور اسی کی طرح مجھے بھی خانہ برباد ہو جاتا ہے۔

نقشِ قدم میں صورت صرف بربادی کی نہیں بلکہ حیرت کی بھی پائی جاتی ہے اور اسی لیے غالبؔ کا خیال "خانہ ویراں سازی حیرت" کی طرف منتقل ہوا۔

۴۔ عشق میں بیداد رشکِ غیر نے مارا مجھے　　کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

میں بیمارِ دوست ہوں اور اسی بیماری میں مجھے جان دینا چاہیے تھی لیکن ہوا یہ کہ دشمن پر اس

کا التفات یا ظلم زیادہ ہوگیا اور میں اس رشک سے جاں بر نہ ہوسکا۔ گویا کشتۂ دوست ہونے کی جگہ مجھے کشتۂ دشمن ہونا پڑا۔

۵۔ چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے دیدۂ پُر خوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

اگر ہمارا دیدۂ پُر خوں بیدرد دوست کی نگاہ میں ایک ساغرِ لبریز کی کیفیت رکھتا ہے تو ہم بھی اس سے خوش ہیں اور ہم کو اس کی کوئی شکایت نہیں۔ اگر دوسرے مصرع کو پہلے پڑھا جائے اور فخر وتعجب کے لہجہ میں تو مفہوم زیادہ واضح ہو جائے گا۔

غزل نمبر ۵۴

۱۔ کمالِ گرمئ سعئ تلاشِ دید نہ پوچھ برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

دیدیار کے لیے جو انتہائی کوششیں میں نے کی ہیں ان کا حال مجھ سے نہ پوچھ بلکہ میرے آئینۂ حیرت کو دیکھ کر معلوم کر جس میں جوہر کی جگہ تم کو خار ہی خار نظر آئیں گے۔

۵۔ بہ نیم غمزہ ، ادا کر حقِ ودیعتِ ناز نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

ودیعت=امانت

محبوب کا خنجر ناز ایک ودیعت یا امانت تھا۔ جسے غالب نے اپنے نیام زخم جگر میں چھپا رکھا تھا لیکن اب وہ اپنی اس خدمت امانت داری کا معاوضہ اس صورت سے چاہتا ہے کہ محبوب "نیم غمزہ" سے کام لے کر اس خنجر کو جگر سے باہر کھینچ لے۔

سوال یہ ہے کہ غالب نے "نیم غمزہ" کیوں کہا اور جگر سے خنجر باہر کھینچ لینا کیونکر امانتداری کا معاوضہ ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ غالب نے خنجر ناز کہا ہے اور اُسی کے ساتھ "نیم غمزہ" کے ساتھ اس خنجر کے کھینچ لینے کی درخواست کی ہے اس لیے یہ تمام اشارات دُور کرنے کے بعد مفہوم یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح ایک بار تو نے اپنے عشوہ و ناز سے کام لے کر میرے جگر میں خنجر سا پیوست کر دیا تھا اب پھر نیم غمزہ سے کام لے کر اُسے باہر نکال اور دوبارہ پھر میرے جگر کو مجروح کر دے (نیام سے خنجر نکالنے کے معنی یہی ہیں کہ اسے استعمال کیا جائے)۔

"نیم غمزہ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ دل کو مجروح کرنے کے لیے "نیم غمزہ" زیادہ موثر ہوا

کرتا ہے۔

سادہ الفاظ میں مفہوم یہ ہوا کہ میں تیرے ناز و عشوہ کا عرصہ سے مجروح ہوں جسے میں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن اب میں اپنی اس رازداری کا معاوضہ چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تو اپنے "نیم غمزہ" سے مجھے اور زیادہ زخمی کردے۔

۶۔ مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں　　　بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

قدح سے مراد قدحِ دل ہے اور آتشِ پنہاں سے آتشِ محبت

سفرہ = دسترخوان۔

سمندر = آگ کا کیڑا۔

میرے ساغرِ دل میں آتشِ محبت کی شراب بھری ہوئی ہے اور وہی میں پیتا رہتا ہوں اس لیے گزک کے لیے مجھے دلِ سمندر کا کباب چاہیے۔

غزل نمبر ۵۷

اس غزل میں غالب نے اپنے اُٹھ جانے پر آپ اپنا ماتم کیا ہے اور نہایت لطیف شاعرانہ انداز میں کہا ہے کہ میرے نہ ہونے سے دنیائے حسن و عشق کس کس طرح ویران ہوئی اور کتنے کاروبارِ عشق معطل ہو گئے معشوقوں نے غمزہ و ناز سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ سرمہ تک لگانا چھوڑ دیا۔ اہلِ جنون سے جنون رخصت ہو گیا۔ عشق پر سوگواری طاری ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے　　　شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

یعنی جس طرح شمع بجھنے کے بعد اس سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے۔

جو علامت ہے سوگواری کو اسی طرح میرے بعد شعلۂ عشق سیہ پوش (ماتمدار) ہو گیا کیونکہ اب مجھ سا دوسرا کہاں پیدا ہو گا جو شعلۂ عشق کی گرمی کو باقی رکھ سکے۔

۵۔ درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا　　　نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

جوہر = اصل مادہ۔

عرض = وہ چیز جس کے ذریعے سے جوہر ظاہر ہوتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے جوہر پیدا و ظاہر ہونے کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی عرض کی ضرورت تھی اور وہ عرض یا مظہر میری ذات تھی اس لیے اب کہ میں نہیں ہوں اس کی نگہ ناز کس کے لیے سرمہ آلود ہو۔

مدعا یہ کہ اس کی "چشم سرگیں" کا صحیح ہدف صرف میں ہو سکتا تھا اس لیے اب کہ میں نہیں ہوں وہ کیوں سرما استعمال کرے۔

۶۔ ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوش وداع — چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

اس شعر میں غالبؔ نے اپنے ذوق جنوں کی ماتمداری کی ہے اور کہتا ہے کہ میرے نہ ہونے سے اب تمام اسباب جنوں درہم برہم ہو گئے ہیں چاک گریبان سے جدا ہو رہا ہے اور گریباں چاک سے۔ گویا یوں سمجھ کہ جنوں اہل جنوں سے رخصت ہو رہا ہے اور وہ رسم دیوانگی جو میں نے قائم کی تھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہی ہے۔

غزل نمبر ۶۰

۱۔ کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

جلوۂ محبوب کو دیکھ کر مجھے جل کر خاک ہو جانا چاہیے تھا لیکن میری طاقتِ دید نے ایسا نہ ہونے دیا اور اب میں اس سے جلنے لگا ہوں کہ اس نے کیوں مجھے اس سعادت و شرف سے محروم رکھا۔

۳۔ کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رُکتا ہوں تم کو "بے سبب آزار" دیکھ کر

بے سبب آزار = بغیر کسی سبب کے آزار پہنچانے والا

مفہوم یہ ہے کہ آبروئے عشق وہیں قائم رہ سکتی ہے جہاں جفا عام نہ ہو بلکہ اس کا خاص مقصد ہو اور مستحقین کے لیے مخصوص ہو لیکن تم اس کے پابند نہیں اور نااہلوں پر بھی جفا کرتے ہو اور اس لیے میں تمہاری یہ ادا دیکھ کر کچھ خوش نہیں ہوں اور تمہاری طرف سے رُکا رُکا سا رہتا ہوں۔

غزل نمبر ۶۱

۱۔ نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

سفیدی سے مراد یہاں آنکھ کا نور ہے اور وہ سفیدی یا قلعی بھی جو صفائی کے لیے دیواروں پر پھیری جاتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ حُسن جہاں بھی ہو اپنی خانہ آرائی سے نہیں باز آتا۔ حد یہ ہے کہ یوسف جب زنداں میں پہنچے تو وہاں بھی آرائش و صفائی کے سلسلے میں دیدۂ یعقوب سے کام لیا گیا۔

چونکہ یعقوب کی نگاہیں ہر وقت یوسف کو تلاش کرتی رہتی تھیں اور یوسف بھی اپنے باپ کو بہت یاد کرتے رہتے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ انھیں زنداں میں بھی اپنے باپ کی منتظر آنکھوں کا خیال آیا ہوگا اور انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ شاید یعقوب کی آنکھیں مجھے زنداں میں بھی دیکھ رہی ہیں اور اسی کیفیت کو غالب نے زنداں پر دیدۂ یعقوب کی سفیدی پھرنے سے تعبیر کیا ہے۔

۴۔ فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں، اس زمانے سے — کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

مفہوم یہ ہے کہ میں اس زمانہ سے درسِ بیخودی پر فنا ہوں جب مجنوں دیوارِ دبستاں پر لام الف (یعنی لا) لکھا کرتا اور درسِ فنا کی ابتدائی مشق کیا کرتا تھا۔

مدعا یہ کہ بیخودی کے باب میں جو مجنوں بہت مشہور ہے لیکن میرے سامنے وہ طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا — کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر

طومار = دفتر

پشتِ چشم = فارسی کا محاورہ ہے پشتِ چشم نازک کردن، جس کے معنی ہیں غمزہ اور ناز و ادا سے کام لینا۔ غالب نے یہاں ناقص محاورہ استعمال کر کے صرف "چشم پشت" لکھ کر یہ مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیائے محبت میں کوئی دفترِ ناز ایسا نہیں جس پر اس کی یعنی محبوب کی "چشم پشت" نے مہر توثیق ثبت نہ کر دی ہو۔ پشت کی مشابہت مُہر سے ظاہر ہے یعنی صحیح معنی میں اگر ناز کا وجود کہیں پایا جاتا ہے تو وہ صرف چشمِ یار ہے۔

۷۔ بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہو گا　　　قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

چونکہ جاں دادگانِ محبت کا وجود، پروازِ شوق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اگر قیامت آئی بھی تو کیا؟ اس کی حیثیت صرف ایک ہوائے تند کی سی ہو گی جو شہیدانِ محبت کی خاک کو اُڑا لے جائے۔

غزل نمبر ۶۴

۱۔ جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی　　　گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

گریباں چاک = چاک گریباں، گریباں چاکی۔

مفہوم یہ ہے کہ جنوں کی دستگیری یا اس کا اظہار صرف عریانی سے ہو سکتا ہے اور چونکہ میری گریباں چاکی ہی نے مجھے عریاں کر کے میرے جنون کی دستگیری کی ہے اس لیے میں اُس کا شکر گزار ہوں۔

۲۔ بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی　　　ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

نیرنگِ بیتابی = فاعل ہے "باندھے ہے" کا۔

مفہوم یہ ہے کہ جلے ہوئے کاغذ کی طرح، میرا نگِ بیتابی بھی بالِ یک تپیدن پر ہزاروں آئینہ ہائے دل رکھتا ہے۔

یعنی جس طرح جلے ہوئے کاغذ کے حروف و نقاط چمکنے لگتے ہیں۔ اسی طرح میرے بالِ تپش پر ہزاروں آئینہ ہائے دل نمودار ہو گئے ہیں۔

اس شعر میں غالب نے خود تپیدن یا تپش کو بال و پر قرار دیا ہے۔

۳۔ ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے　　　شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

بے سبب رنج = بغیر کسی سبب کے رنجیدہ ہو جانے والا۔

آشنا دشمن = دوستوں کا دشمن۔

مفہوم ہے کہ ایسے زود رنج اور بدگماں محبوب سے ہمارا واسطہ پڑا ہے کہ روزنِ دیوار سے سورج کی کرن آتی ہے تو اسے بھی وہ ہمارا تار نگاہ سمجھ کر برہم ہو جاتا ہے۔

۵۔ نہ کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

مفہوم یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقت سمجھنے کا شائق ہے تو خاشاک کی طرح آگ میں جل جا یعنی جس طرح خاشاک کی انتہائی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اسی طرح انسان اگر اپنی حقیقت جاننا چاہتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ جلوۂ محبوب یا جلوہ خداوندی پر اپنے آپ کو فنا کر دے۔

غزل نمبر ۶۷

۱۔ ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر　　　ہوں گل فروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

جس طرح ہاتھ سے نکلی ہوئی دولت پر مفلس فخر کرتا ہے اسی طرح مجھے بھی اپنے داغ ہائے دل کی گل فروشی پر ناز ہے۔

۲۔ مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں　　　خمیازہ کھینچے ہے، بُت بیدادِ فن ہنوز

"خمیازہ" انگڑائی کو کہتے ہیں۔ نشہ جب اُترتا ہے تو انسان جماہی اور انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو سامنے رکھ کر غالب کہتا ہے یہاں تو یہ حال ہے کہ میخانۂ جگر میں شراب یعنی خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں اور وہاں بت بیداد فن انگڑائیاں لے رہا ہے اور مزید شراب طلب کرتا ہے۔

مدعا یہ کہ جگر سب کا سب ختم ہو چکا اور اب ایک قطرۂ خون بھی باقی نہیں کہ نذرِ محبوب کیا جائے۔

غزل نمبر ۶۸

۱۔ حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز　　　دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

حریف مطلبِ مشکل نہ ہونا = کسی مطلبِ مشکل کو پورا نہ کر سکنا۔

مفہوم یہ ہے کہ اپنی نیاز مندیوں سے کوئی دشوار کام تو نکلتا نہیں اس لیے اب آؤ یہی دُعا کریں کہ "عمرِ خضر" دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں جو پہلے ہی دی جا چکی ہے۔

اس شعر میں غالب نے بڑے لطیف طنز سے کام لیا ہے۔

۲۔ نہ ہو بہ ہرزہ ، بیاباں نوردِ وہم وجود ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

بہ ہرزہ = بے کار۔

مفہوم یہ ہے کہ مسئلہ وجود میں خواہ مخواہ فکر و قیاس سے کام لینا بیکار ہے۔ کیونکہ اس باب میں تیرا ہر تصور نشیب و فراز اور ناہمواری سے خالی نہیں اور تو اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیجئے آئینۂ انتظار کو پرواز

جلوہ تماشا = جلوۂ حسن کا تماشا دکھانے والا۔

پرواز = صیقل۔

مطلب یہ ہے کہ جلوۂ حسن کا تماشا وصل ہی پر موقوف ہے لیکن یہ طاقت کہاں کہ اس کے لیے آئینۂ انتظار کی صیقل کیا کروں۔ یعنی وصال اپنی جگہ بہت پُر لطف چیز ہے لیکن تاب انتظار کسے۔

غزل نمبر ۶۹

۱۔ وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

سرتاسرِ خاک = تمام روئے زمین۔

ابر کو قطراتِ باراں کی وجہ سے آبلہ پا کہا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ بخشش و کرم کی وسعت دیکھنا ہو تو ابر کو دیکھو کہ ابر باوجود آبلہ پا ہونے کے اپنی گہرباری ترک نہیں کرتا۔

۲۔ یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت نقشِ پا میں ہے تپ گرمیٔ رفتار ہنوز

یک قلم = یکسر۔

مفہوم یہ ہے کہ میرے نقشِ قدم میں گرمیٔ رفتار کی تپش اب بھی اتنی باقی ہے کہ اس نے صحرا کو کاغذ کی طرح جلا کر رکھ دیا۔

غزل نمبر ۷۱

۱۔ نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

گلِ نغمہ سے مراد نغمۂ طرب ہے۔

پردۂ ساز۔ ساز کے پردے جن سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ لافِ تمکین، فریبِ سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

لاف = شیخی۔

تمکین = صبر و ضبط۔

اگر ہم اپنے صبر و ضبط پر فخر کریں تو یہ ہماری سادہ دلی یا ناآگہی کا فریب ہوگا کیونکہ ہمارے سینہ میں تو ایسے راز چھپے ہوئے ہیں جو خود سینہ توڑ کر باہر آنے والے ہیں اس لیے اگر ہم صبر و ضبط کا دعویٰ کریں تو یہ ہماری نادانی ہوگی۔

۵۔ اے ترا غمزہ یک قلم انگیز اے ترا ظلم سربسر انداز

انگیز = نہایت دلکش ادائے ناز۔

مفہوم یہ ہے کہ تیرا غمزہ و ناز اور تیرا ظلم سب ایک ہی چیز ہیں اس لیے اُن کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

غزل نمبر ۳۷

۱۔ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے لگادے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

اس شعر کی بنیاد صرف لفظ سبزہ پر قائم ہے جس میں طراوت یا تر و تازگی پائی جاتی ہے۔

سبزہ خط سے مراد معشوق کا سبزہ خط ہے۔

جوہر کو خس اس لیے کہا کہ اس میں خس سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ روئے نگار کی تابش و گرمی کا یہ عالم ہے کہ اگر آئینہ دیکھتے وقت اس کا سبزہ خط جوہرِ آئینہ کو طراوت نہ پہنچائے تو وہ جل کر رہ جائے۔

۲۔ فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق نہ نکلے شمع کے پاسے نکالے گر نہ خار آتش

دوسرے مصرع میں خار سے مراد دھاگہ یا بتی ہے جس کے جلنے سے شمع روشن ہوتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جس طرح پائے شمع یعنی خود شمع کا خار آگ ہی سے نکلتا ہے اسی طرح عاشق کی مشکل بھی فروغِ حُسن سے حل ہو سکتی ہے۔

غزل نمبر ۷۵

۱۔ رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

"آتشِ گل" سے مراد محبوب کے رخسار کی سُرخی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ معشوق کے چہرہ کو دیکھ کر شمع از راہ رشک سوزِ دائمی میں مبتلا ہے۔ گویا شمع کی زندگانی کا سبب محض آتشِ گل ہے۔ یعنی اگر وہ رُخِ نگار کی سُرخی نہ دیکھتی تو شمع دائمی سوز میں مبتلا نہ ہوتی اور اس کی زندگی نام اس کے سوز ہی کا ہے۔

۲۔ کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

جس طرح اہلِ فنا (اہلِ عشق) خود اپنی آتشِ محبت میں جل کر ختم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح شمع کی زندگی بھی خود اسی کے شعلہ کی نذر ہو جاتی ہے۔

۳۔ غم اس کو حسرتِ پرواز کا ہے، اے شعلہ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

شمع کی لَو ہر وقت لرزتی کانپتی رہتی ہے۔ غالب اس کی تاویل یہ کرتا ہے کہ اس کی لَو کی لرزش گویا ناتوانی شمع کو ظاہر کرتی ہے اور اس ناتوانی کا سبب یہ غم ہے۔ کہ اس کی حسرتِ پرواز کما حقہ پوری نہ ہو سکی۔

۵۔ ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

دوسرے مصرعہ میں بہ، بائے قسمیہ ہے۔

جلوہ ریزی باد = ہوا کا چلنا

اہتزاز = جھومنا

پرفشانی شمع = شمع کی لو کی تھرتھراہٹ

مفہوم یہ ہے کہ جب میں تیرا تصور کرتا ہوں تو میری روح میں بھی وہی لرزش مسرت پیدا

کرتی ہے جو شمع کی لو میں ہوا کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

۶۔ نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ شگفتگی ہے ، شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

داغِ غمِ عشق سے جو مسرت مجھے حاصل ہے اس کا حال نہ پوچھو۔ بس یوں سمجھ لو کو شمع کے گلِ خزاں دیدہ پر بہار قربان ہو رہی ہے۔ داغِ غمِ عشق کی تعبیر "گلِ خزانیِ شمع" سے کی گئی ہے اور شمع کی "گلِ خزاں دیدہ سے"۔

غزل نمبر ۸۰

۱۔ ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل اس خیال پر مٹی ہوئی ہے کہ پھول اس سے وفا کریں گے اور پھول اس کی اس سادہ دلی پر ہنس رہے ہیں۔

۲۔ آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

غالب کا یہ شعر یوں تو بہت صاف معلوم ہوتا ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے کافی مبہم ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ "آزادیِ نسیم" کی مبارک باد کس کو دی جا رہی ہے۔ خود نسیم کو یا کسی اور کو۔ شعر کے الفاظ سے نسیم کے سوا کسی اور کی طرف خیال نہیں جاتا اس لیے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نسیم کو اس کی آزادی کی مبارک باد دی جاتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کی آزادی میں کون سی چیز حائل تھی۔

دوسرے مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "حلقۂ دامِ ہوائے گل" میں پھنسی ہوئی تھی اور اب اِن حلقوں کے ٹوٹ جانے سے آزاد ہو گئی ہے لیکن ہوائے گل اور اس کا "حلقۂ دام" سے کیا مراد ہے؟ ہوا علاوہ خواہش آرزو کے فضا کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور غالباً مفہوم یہ ہوگا کہ فضائے گل یا فضائے بہار گویا نسیم کے لیے حلقۂ دام تھی کہ وہ اس سے چھٹ کر کہیں اور نہ جا سکتی تھی لیکن اب کہ بہار ختم ہو گئی ہے اور اسی آزادی پر اس کو مبارکباد دی گئی ہے۔ مدعا یہ کہ جب بہار کا وجود ہی ہمارے سامنے ختم ہو گیا تو ہم بوئے گل کے لیے آرزوئے نسیم کیوں کریں۔

۴۔ جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکہ میں مرگیا　　　اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

"موجِ رنگ کے دھوکہ میں مرگیا۔ یعنی موجِ رنگ پر فریفتہ ہوگیا۔ گل کو "لبِ خونیں نوا" فرض کر کے افسوس ظاہر کیا ہے کہ دنیا بھی کتنی حقیقت ناشناس ہے کہ وہ پھول کو موجِ رنگ سمجھ کر خوش ہوتی ہے۔ حالانکہ دراصل "لبِ خونیں نوا" ہے جس پر اظہارِ غم کرنا چاہیے۔

۵۔ ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار　　　میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

نفسِ عطر سائے گل = پھول کی عطریت وخوشبو۔

مفہوم یہ ہے کہ میرا رقیب تو تجھ تک پہنچ سکتا ہے اور میں نہیں پہنچ سکتا۔

۶۔ شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے　　　مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

یعنی میری مینا جو شراب سے خالی ہے اور میرا دل جو خواہشِ گل سے آزاد ہے۔ یہ دونوں مجھے بادِ بہار سے شرمندہ رکھتے ہیں کیونکہ جب شراب اور ہوائے سیرِ گل دونوں میسر نہیں تو پھر موسمِ بہار کا کیا لُطف۔

۷۔ سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی　　　خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

مدعا یہ ہے کہ چونکہ تیرا حُسنِ غیور یہ نہیں چاہتا کہ میں کسی اور پر نگاہ ڈالوں اس لیے میں رنگِ گل کو بھی خون ہی سمجھتا ہوں اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

غزل نمبر ۸۱

۱۔ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　　　برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بیش از یک نفس = ایک لمحہ سے زیادہ۔

وہ لوگ جو آزادہ رو ہیں اگر کسی بات کا غم کرتے بھی ہیں تو اس کی مدت دم بھر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ اپنے ماتم خانہ کی شمع ہم برق سے روشن کرتے ہیں جس کا دم بھر سے زیادہ قیام نہیں تو ہمارا یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔

۲۔ محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال   ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

جس طرح گنجفہ کھیلنے والا پتوں کو الٹتا پلٹتا ہے اسی طرح ہم اپنے تصور خیال میں پچھلی صحبتوں کے اوراق (جو اپنے تنوع کے لحاظ سے نیرنگ بت خانہ کی حیثیت رکھتے ہیں) اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔

۳۔ باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں   ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

یک جہاں ہنگامہ = بہت زیادہ ہنگامہ۔

مطلب یہ ہوا کہ ہر چند ہماری ہستی ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے لیکن وہ ایسی ہی ناپائدار ہے جیسے پروانے کا جل کر ایک لمحہ کے لیے اپنے شبستان دل کو روشن کر لینا۔

۴۔ ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو   ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ہماری ترک جستجو کا سبب قناعت نہیں بلکہ ہماری ضعف و کمزوری ہے جس پر ہماری ہمت مردانہ کو کوئی بھروسہ نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ وہ لوگ جو ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جاتے ہیں دراصل بڑے کم ہمت ہوتے ہیں اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے "قناعت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل نمبر ۸۷

۴۔ کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم (اندھیر ہے)   پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

میرا زندان غم اتنا تاریک ہے کہ اگر اس کے روزن میں روئی رکھ دی جائے تو وہ بھی نور صبح معلوم ہوگی۔ قاعدہ ہے کہ تاریکی جب بہت زیادہ ہوتی ہے تو اس میں تھوڑی سی سفیدی بھی بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔

غزل نمبر ۹۲

۲۔ شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں   جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

میرا شوق جنوں مجھے ایسے صحرا میں لے گیا ہے جہاں جادہ (راستہ) ایسا ہی معدوم ہے جیسے دیدۂ تصویر میں نگاہ معدوم ہوتی ہے۔

۳۔ حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے		جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

آزارِ محبت میں جو لطف و مزہ ہے اس کو دیکھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ یہ لذّتِ آزار دیر تک قائم رہے لیکن مشکل یہ ہے کہ راہِ وفا تلوار کی دھار پر قائم ہے۔ یعنی راہِ وفا میں اول ہی قدم پر جان دینا پڑتی ہے۔ اور اس طرح دیر تک لذّتِ آزار حاصل کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

۴۔ رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو		خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

اگر نالہ تاثیر کا منت کش نہیں تو میں خوش ہوں کیونکہ اس طرح ایک دائمی ناامیدی کے رنج میں مبتلا ہو جاؤں گا اور اسے گوارا کرنا پڑے گا۔

غزل نمبر ۹۵

۱۔ عشق تاثیر سے نومید نہیں		جاں سپاری شجرِ بید نہیں

عشق کی تاثیر سے میں ناامید نہیں ہوں کیونکہ کسی پر جان دینا کوئی بید کا درخت تو نہیں ہے جو پھل نہیں لاتا۔

غزل نمبر ۹۶

۵۔ سُراغ تفِ نالہ لے داغِ دل سے		کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

شب رو= چور یا قزاق جو عموماً رات ہی کے وقت نکلتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح شب رو کے نقشِ قدم سے اس کا سُراغ لگایا جاتا ہے اسی طرح میرے نالہ کی گرمی کا پتہ میرے داغِ دل سے چل سکتا ہے یعنی اگر میرے نالہ میں اتنی گرمی ہے تو حیرت کی کیا بات ہے داغِ دل بھی تو اتنا ہی گرم ہے۔

غزل نمبر ۹۷

۱۔ جو منکرِ وفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے		کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میری یہ بدگمانی کہ دوست غیر کے ادّعائے وفا پر فریب میں مبتلا ہو گیا درست نہیں کیونکہ جب محبوب سرے سے اس کا قائل ہی نہیں کہ دنیا میں وفا کا وجود کہیں پایا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ

دشمن کے اظہارِ محبت و وفا پر کیوں اعتماد کرنے لگا۔

غزل نمبر ۹۸

۱۔ اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

حسبِ بیان مولانا حالی غیر سے "ماسوا اللہ" مراد ہے اور صوفیہ کے نزدیک واجب الوجود کے سوا جو کچھ ہے وہم ہی وہم ہے جو قابلِ توجہ نہیں۔

مدعا یہ کہ میں جتنا ماسوا اللہ کے وہم میں مبتلا ہوتا جاتا ہوں اتنا ہی اپنی حقیقت یعنی خدا سے دور ہوتا جاتا ہوں۔

۶۔ اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود = دیکھنا۔

شاہد = دیکھنے والا۔

مشہود = جسے دیکھا جائے۔

مشاہدہ = ایک دوسرے کو دیکھنا۔

غالب نے اس میں اپنے عقیدۂ وحدت الوجود کا اظہار بالکل صوفیہ کی زبان میں کیا ہے۔

کہتا ہے کہ جب شہود و شاہد و مشہود یعنی دیکھنا، دیکھنے والا اور دیکھا جانے والا سب ایک ہی چیز ہیں تو پھر لفظ مشاہدہ کا استعمال بے معنی ہے کیونکہ مشاہدہ نام ہے ایک دوسرے کو دیکھنے کا اور جب یہاں کوئی دوسرا ہے ہی نہیں تو پھر مشاہدہ کیسا؟

۷۔ ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اس شعر میں بھی وحدت الوجود کا عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔

کہتا ہے کہ قطرہ، موج و حباب میں کیا رکھا ہوا ہے جس کو دیکھا جائے۔ ان کی ہستی وہم کے سوا کچھ نہیں۔ یہ سب ظاہری صورتیں ہیں جن کے ذریعہ سے بحر اپنی نمائش کرتا رہتا ہے لیکن پہلے مصرعہ کا اندازِ بیان اس مفہوم کے لحاظ سے مناسب نہیں کیونکہ اس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ وجودِ بحر نام ہے صرف

نمود وصور کا اور یہ کہنا گویا بحر کے مقابلہ میں وجود صور یعنی قطرہ و حباب وغیرہ کو زیادہ اہمیت دینا ہے۔

۸۔ شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

دوسرے مصرعہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ معشوقوں کا حجاب میں رہنا اور سامنے نہ آنا بھی ایک قسم کی بے حجابی ہے۔ پہلے مصرعہ میں اس دعویٰ کا ثبوت یہ پیش کیا گیا ہے کہ پردہ میں رہنا گویا اپنے آپ سے بے حجاب ہو جانا ہے حالانکہ شرم کا اقتضاء ہے کہ اپنے آپ سے بھی حجاب کیا جائے۔

۱۰۔ ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

"غیبِ غیب" سے مراد ذات باری ہے جو عقل وادراک کی حدود سے باہر ہے۔ شہود سے مراد عالمِ مظاہر و آثار ہے جسے ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔

مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو ہم عالمِ شہود یا "مادیات" کہتے ہیں وہ بھی دراصل عالمِ احدیت ہے اور ہمارا ایسا سمجھنا کہ عالمِ شہود اس سے علیحدہ کوئی چیز ہے بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم خواب میں یہ دیکھیں کہ ہم جاگ رہے ہیں حالانکہ ہم بدستور محوِ خواب ہیں۔

غزل نمبر ۱۰۰

۳۔ شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاہد = معشوق

ہستیٔ مطلق = واجب الوجود۔

اس شعر میں غالبؔ نے دنیا کے موہوم ہونے کا ذکر عجیب انداز میں کیا ہے۔ کہتا ہے کہ لوگوں کا دنیا کی بابت یہ کہنا کہ "وہ ہے" یعنی اس کا علیحدہ وجود پایا جاتا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اگر وہ ہے بھی تو بالکل اس طرح جیسے معشوق کی کمر یعنی نہ ہونے کے برابر (بالکل معدوم)۔

مدعا یہ کہ واجب الوجود سے علیحدہ کائنات کو ایک جداگانہ چیز سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

۵۔ حسرت اے ذوقِ خرابی کی وہ طاقت نہ رہی عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

عشقِ پُر عربدہ = عشقِ نبرد آزما۔ عشقِ جنگ جو۔

گوں = قابل، لائق۔

مفہوم یہ ہے کہ عشق جنگ جو کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور وہ ہمیں تباہ و برباد کردے لیکن افسوس ہے کہ میرا تنِ رنجور اس قابل نہیں کہ عشق کا پوری طرح مقابلہ کرسکے اور وہ مجھے پوری طرح خراب و برباد کردے۔

۸۔ صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ — وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

صاف دردی کش = تلچھٹ سے صاف شراب کا پینے والا۔

جم = جمشید جسے شراب کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم بادہ خواری میں جمشید کے مقلد ہیں اور ایسی صاف شراب پینا پسند کرتے ہیں جو تلچھٹ سے خالی ہو اس لیے کہ اگر ہم کو انگوری شراب (جو سب سے بہتر ہوتی ہے) میسر نہیں تو اس پر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

غزل نمبر ۱۰۱

۵۔ وائے محرومیِ تسلیم و بداحالِ وفا — جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

بدا = وائے کا ہم معنی ہے یعنی بُرا ہو۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم تو فریاد اس لیے نہیں کرتے کہ وہ خوئے وفا و تسلیم کے خلاف ہے۔ لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ہم فریاد کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے۔

مدعا یہ کہ اگر وہ ہماری خاموشی کو صبر و ضبط کا نتیجہ سمجھتا تو ممکن ہے کسی وقت مائل بہ کرم ہوتا۔ لیکن اب یہ صورت بھی باقی نہیں۔

۶۔ رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے — گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

''چراغانِ سرِ رہگذرِ باد'' سے مراد وہ چراغ ہیں جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ روشن کیے جائیں اور ہوا انھیں فوراً بجھادے۔

مفہوم یہ ہے کہ گل و لالہ کا رنگِ خودداری اسی لیے پریشان و ابتر ہے کہ انکی حیثیت اس چراغ کی سی ہے جو ہوا کے رُخ پر روشن کیا جائے اور ہوا اُسے بجھادے۔

مدعا یہ کہ دنیا میں مسرت بڑی ناپائیدار چیز ہے۔

۸۔ نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا   دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

معشوق کے دہن کو معدوم کہتے ہیں اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ اس کے دہن سے ہمیشہ "نہیں نہیں" نکلتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے دہن کا اثبات حرف نفی (نہیں نہیں) سے ہوتا ہے یعنی اگر وہ ہر بات پر نہیں نہ کہتا تو ہمیں اس کے دہن کا بھی پتہ نہ چلتا۔

نہیں سے ہاں یا عدم سے وجود کا اثبات بڑے لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔

غزل نمبر ۱۰۴

۱۔ دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ   نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

سرگرم= فارسی میں سرخوش کا مترادف ہے لیکن کنایۃً کسی کام میں زیادہ منہمک ہو جانے والے کو بھی کہتے ہیں۔

اس شعر میں غالبؔ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ محبوب کی اُلفت آزمانے کی کوشش نہ کر۔ کیونکہ اُلفت آزمائی بڑی سخت چیز ہے اور محبوب کا نازک دل مشکل ہی سے اس کا متحمل ہو سکتا ہے اس لیے نتیجہ یہ ہوگا کہ خود تمہی کو اس سے تکلیف ہوگی۔

غزل نمبر ۱۰۸

۱۔ اہلِ تدبیر کی واماندگیاں   آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

جب پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں تو عموماً ان پر مہندی باندھ دیتے ہیں تاکہ چھالے اچھے ہو جائیں لیکن غالبؔ کہتے ہیں کہ یہ چارہ سازوں کی واماندگی اور سعی بے جا ہے کیونکہ جب آبلہ پائی مجھے صحرانوردی سے باز نہ رکھ سکی تو اس کی حنا بندی کیا باز رکھ سکتی ہے۔

لیکن اس صورت میں دوسرے مصرع میں بھی کا استعمال بے محل ہو جائے گا اس لیے بھی کے پیش نظر شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ آبلوں پر حنا باندھنا اگر اس لیے ہے کہ میں چل نہ سکوں تو بیکار بات ہے کیونکہ خود آبلے ہی مجھ کو صحرانوردی سے باز نہ رکھ سکے تو کیا ان پر مہندی لگانے سے میں

صحرا نوردی ترک کر دوں گا؟

غزل نمبر ۱۱۲

۲۔ دل کو نیاز حسرتِ دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

مفہوم یہ ہے کہ جب ہم حسرتِ دیدار کے لیے اپنے دل کو تباہ و برباد کر چکے تو پتہ چلا کہ یہ بالکل بیکار سی بات تھی کیونکہ اگر ہم کو دیدار کا کوئی موقع ملتا بھی تو ہم اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ جب کہ ہم میں دیدار کی طاقت ہی موجود نہ تھی۔

۳۔ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

مفہوم یہ ہے کہ اگر تجھ تک رسائی آسان نہ ہوتی یعنی دشوار ہوتی تو یہ بات ہمارے لیے سہل تھی کیونکہ اس طرح ہم مایوس ہو کر خاموش بیٹھ جاتے لیکن چونکہ تیرا ملنا ناممکن نہیں ہے بلکہ غیر سے مل سکتا ہے اس لیے نہ ہمارا شوقِ آرزو کم ہوتا ہے اور نہ یہ جذبۂ رقابت کہ تجھ سے ہر شخص مل سکتا ہے۔

۷۔ ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

خدا کو مان = خدا سے ڈر۔

مفہوم یہ ہے کہ لوگ جب کسی طائر کو گرفتار کرتے ہیں تو اس کی بیقراری و فریاد پر انھیں رحم آجاتا ہے لیکن تو میری فریاد و زاری پر مطلق رحم نہیں کرتا۔ تو کیا میرے نالہ ہائے زار نوائے مرغِ گرفتار سے بھی کم ہیں جن کا اثر تجھ پر نہیں ہوتا۔

غزل نمبر ۱۱۳

۱۔ نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

بخیے کے درخور = بخیے کے قابل۔

رشتہ = دھاگہ۔

چشمِ سوزن = سوئی کا ناکہ۔

چونکہ میرا جسم زخموں کی کثرت سے اتنا تار تار ہو گیا ہے کہ اس میں ٹانکے لگانا ممکن نہیں اور سوزن مایوس ہو چکی ہے اس لیے چشم سوزن کا تاگہ گویا اس کا تار اشک ہے۔ جس سے وہ اپنی ناکامی و مایوسی کا اظہار کر رہی ہے۔

۲۔ ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشہ، خانہ ویرانی کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

مفہوم یہ ہے کہ سیلاب اشک سے ہم نے اپنے گھر کو اس لیے ویران کر دیا تھا کہ ذوقِ تماشا کے لیے فضا زیادہ وسیع ہو جائے گی لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ کفِ سیلاب روزنِ دیوار میں روئی کی ڈاٹ ہو کر رہ گیا ہے اور اب ہم روزنِ دیوار سے جھانک بھی نہیں سکتے۔

۳۔ ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

میرے جسم کا ہر قطرۂ خوں گویا ایک نگینہ ہے جس پر کاوشِ مژگاں نے معشوق کا نام کندہ کر دیا ہے اور میں اُن کا امانت دار ہوں۔ اسی مفہوم کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

۴۔ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

میرے شبستان یا خوابگاہ کی تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اگر روزنِ دیوار میں روئی رکھ دیں تو وہ بھی چاندنی کی طرح روشنی دینے لگے (انتہائی تاریکی میں ہر وہ شے جو سفیدی مائل ہو کافی نمایاں ہو جاتی ہے) شدت تاریکی کے اظہار میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

۵۔ نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

نکوہش = ملامت و تضحیک۔

چونکہ احباب نے میری دیوانگی کی ہنسی اُڑائی اور میں ان کی ملامت و تضحیک کی وجہ سے جوشِ جنوں میں اپنے جیب و دامن کو چاک نہ کر سکا۔ اس لیے یوں سمجھنا چاہیے کہ خندۂ احباب نے گویا میرے جیب و دامن کے لیے بخیہ کا کام دیا (خندہ اور بخیہ کی مشابہت ظاہر ہے۔)

۶۔ بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا　　　　مگر اثر نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

"نفسِ بے اثر" کہنے کے بعد یہ کہنا کہ اس میں اثر نہیں عجیب بات ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ اگر میرے آہ و نالہ کا اثر اُس پر نہیں ہوا تھا تو کم از کم خود مجھ پر اس کا اثر ہوتا اور میں اپنے حال پر رحم کھا کر نالہ کشی سے باز رہتا لیکن معلوم ہوا کہ میرا نالۂ بے اثر اس لحاظ سے محبوب کے دل میں کیفیتِ رحم نہ پیدا کر سکا۔ یا اتنا بے اثر ہے کہ خود مجھ پر بھی اس کا اثر نہ ہوا اور میں نالہ سے باز نہ آیا۔

غزل نمبر ۱۱۹

۱۔ وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو　　　　کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

وارستہ = آزاد، بے پروا۔

مفہوم یہ ہے کہ ہمیں اس کی پروا نہیں کہ تم محبت ہی کرو (چاہے) تم عداوت ہی کرو لیکن ہو میرے ہی ساتھ۔ کوئی اور اُس میں شریک نہ ہو۔

پہلا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے۔ اگر وارستہ کے معنی بے پروا کے لیے جائیں تو پھر کیوں کے بعد "نہ" بیکار ہو جاتا ہے۔ اندازِ بیان یہ ہونا چاہیے کہ ہم اس سے بے پروا ہیں کہ تم محبت ہی کرو۔

دوسرے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا اہل لکھنؤ کے ذوق کے مطابق ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

۷۔ ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال　　　　حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

انفعال یعنی کسی دوسرے کا اثر قبول کرنا یا اس سے کچھ حاصل کرنا ہمت کی کمی کی دلیل ہے۔ یہاں تک کہ اگر زمانہ سے عبرت حاصل کی جائے تو وہ بھی گویا زمانہ کا احسان لینا ہوگا اور یہ دونِ ہمت ہے۔ پہلے مصرعہ میں لفظ ہنگامہ محض برائے بیت استعمال ہوا ہے۔ ورنہ بغیر اس کے بھی شعر کے معنی پورے ہو جاتے ہیں۔

۸۔ وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں　　　　اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی = آزادی، وحشت

بیگانگی = مغائرت و نا آشنائی۔

مفہوم یہ ہے کہ آزادی یا آزادہ روی اہلِ دنیا سے بیگانہ رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ خود اپنے آپ سے وحشت کرنے کا نام ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ صحیح آزادی خود اپنے آپ کو اغراض سے آزاد رکھنے کا نام ہے یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بھی کوئی غرض وابستہ نہ ہونی چاہیے۔

غزل نمبر ۱۲۲

۱۔ اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

تاکہ = جب تک۔

نخچیر = شکار

یعنی اس کا ذوقِ ستم تو دیکھئے کہ جب تک دیدۂ نخچیر کا آئینہ سامنے نہ ہو وہ اپنی صورت دیکھتا ہی نہیں۔ جب کہ کوئی جانور مر جاتا ہے تو اسکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور ان سے حیرانی کا اظہار ہونے لگتا ہے جس کی تعبیر آئینہ سے کی گئی ہے۔

غزل نمبر ۱۲۳

۱۔ واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

صدرہ = سو سو طرح سے۔

آہنگ = ارادہ۔

پئے ہم = پیہم، متواتر، فارسی میں پئے ہم بھی مستعمل ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ اس کے کوچہ میں پہنچ کر جو ہم کو غش بار بار آتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم سو سو بار اس کا نشانِ قدم چومنے کو زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔

اگر قدم سے مراد خود اپنا قدم ہو تو مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اپنا نقش قدم چومنا چاہتے ہیں اس لیے کہ وہ کوچۂ یار تک پہنچ سکا۔

۲۔ دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو

ہم = باہم۔

مفہوم یہ ہے کہ میں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو محوِ وفا رکھتے ہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ ہم دونوں میں ذوقِ گرفتاری کتنا مشترک ہے۔

۳۔ ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رَم ہے ہم کو

پئے مور = پائے مور، چیونٹی کا پیر۔

رَم = بھاگنا، گریز کرنا، فرار۔

مفہوم یہ ہے کہ تیرے کوچے سے بھاگ کر کہیں اور چلا جانا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے ضعف کا یہ عالم ہے کہ تیرے کوچے میں پائے مور کا نشان بھی طوقِ گردن سے کم نہیں اور وہ ہمیں جانے سے باز رکھتا ہے۔

۵۔ رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

ہمطرحی = ہمسری

پہلے مصرعہ کے دونوں ٹکڑوں کا تعلق نالۂ مرغِ سحر سے ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ نالۂ مرغِ سحر میرے لیے دو دھاری تلوار ہے یعنی ایک تکلیف تو مجھے اس رشک سے ہوتی ہے کہ وہ بھی میری ہی طرح نالہ کرتا ہے اور شاید تیرا شیدائی ہے اور دوسری تکلیف یہ کہ اس کی آواز میں اثر ہے اور میری آواز میں نہیں ہے۔

۹۔ بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

اس شعر میں بڑی معیوب تعقید ہے۔ پہلے مصرعہ میں قرار فاعل ہے "کیونکر ہو" کا، جو دوسرے مصرعہ کا قافیہ و ردیف ہے۔

اس کی نثر یوں ہوگی (اگر) اس مژہ کو دیکھ کر بتاؤ کہ اگر یہ نیشتر رگِ جاں میں فرو ہو تو مجھ کو قرار کیوں کر ہو (یعنی میں کیوں نہ بے قرار ہوں)۔

غزل نمبر ۱۳۳

۱۔ ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

سخن کا لبوں سے آزردہ ہونا = بات نہ کر سکنا۔

اس شعر کے سمجھنے میں عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ لبوں سے سخن کی آزردگی کو خود غالب سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور اس طرح مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں حالانکہ اس کا تعلق بتوں سے ہے اور مفہوم یہ ہے کہ بزم بتاں کا یہ حال ہے کہ وہ کوئی بات ہی نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ ان کی خوشامد کی جائے تو وہ کچھ بولیں۔ اس لیے ہم ایسے خوشامد طلبوں سے سخت تنگ آ گئے ہیں۔

۳۔ رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد   زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

طرف = فارسی میں مقابل کو کہتے ہیں۔

یعنی اے زاہد رندوں کے منہ کبھی نہ لگنا۔ یہ بڑے بے ادب اور منہ پھٹ ہیں۔

۴۔ بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر   ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

مفہوم یہ ہے کہ ہر چند میری جان کا تعلق صرف لبوں سے باقی رہ گیا تھا یعنی جان لبوں پر رہا کرتی تھی۔ لیکن تقاضائے وفا کا ظلم دیکھیے کہ اُسے یہ بھی گوارا نہ ہوا اور جان و لب کا تعلق بھی اُس نے توڑ دیا۔

غزل نمبر ۱۳۶

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے   ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

پرنیاں = ریشمی کپڑا جس سے آگ فوراً لپٹ جاتی ہے۔

مدعا یہ ہے کہ آگ پرنیاں میں لپٹ کر تو اپنے آپ کو چھپا سکتی ہے لیکن میں اپنے سوزِ غم کو کسی طرح نہیں چھپا سکتا۔

غزل نمبر ۱۳۷

۱۔ حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی   دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی = آرزو کرنا۔

ڈوبی ہوئی اسامی = وہ کاشتکار جس سے لگان وصول نہ ہو سکے۔

مفہوم یہ ہے کہ جوشِ گریہ سے کوئی امید کامیابی کی قائم کرنا بے کار ہے۔ کیونکہ اک ڈوبی

ہوئی آسامی کی طرح اس سے بھی کچھ وصول نہیں ہو سکتا۔

غزل نمبر ۱۳۸

۱۔ غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے ‌ ‌ ‌ حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ

سیلی = تھپیڑ۔ ضرب

خارا = پتھر

مفہوم یہ ہے کہ میرا شیشہ تو پتھر کی ضرب سے لالہ رنگ ہے لیکن غافل یہ سمجھتا ہے کہ اس میں شراب بھری ہوئی ہے۔ ناقص شعر ہے۔ کیونکہ پتھر کی ضرب سے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لالہ رنگ نہیں ہو سکتا اور اگر شیشہ سے مراد دل لیا جائے تو پھر پتھر کی ضرب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے ‌ ‌ ‌ کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا

گرم کا تعلق سینہ سے نہیں ہے۔

جا گرم کردن کا مفہوم فارسی میں قیام کرنے اور بیٹھنے کا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ اس نے سینۂ اہلِ ہوس میں اس لیے اپنی جگہ بنائی ہے کہ وہ ٹھنڈا یعنی گرمیٔ عشق سے خالی ہے اور قیام کے لیے عموماً ٹھنڈی جگہ ہی کو پسند کیا جاتا ہے

۷۔ کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے ‌ ‌ ‌ ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا

مفہوم یہ ہے کہ غم کی شدت نے جگر کو اتنا مٹا دیا کہ اب اس کی جگہ صرف داغ رہ گیا ہے اس لیے اگر میں کسی سے یہ کہوں بھی کہ یہ داغ جگر کا نشان ہے تو اسے کون مانے گا۔

غزل نمبر ۱۴۱

۱۔ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے ‌ ‌ ‌ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

یعنی اگر لوگ اپنی خاموشی سے یہ فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ان کا حال کسی پر ظاہر نہ ہو تو میں بھی اپنی گویائی سے خوش ہوں کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ بھی لوگ نہیں سمجھ سکتے یعنی جو فائدہ دوسرے لوگ خاموشی سے حاصل کرتے ہیں وہ میں اپنی گویائی سے حاصل کرتا ہوں گویا اوروں کی

خاموشی اور میری گویائی بہ لحاظ نتیجہ دونوں ایک ہی سی ہیں۔

اس میں غالب نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری شاعرانہ بلند خیالی تک مشکل ہی سے کوئی شخص پہنچ سکتا ہے۔

۲۔ کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ ‏ ‏ ‏ دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

فرد جمع و خرچ= اس کاغذ کو کہتے ہیں جس میں جمع و خرچ کا حساب درج ہوتا ہے۔

(بہی کھاتہ)۔ یہاں مراد محض دفتر یا ریکارڈ ہے۔

زباں ہائے لال= گونگی زبانیں۔

اس شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں حسرت اظہار کا گلہ کس سے کروں جب کہ خود میرا ہی دل اظہار حال سے قاصر ہے اس صورت میں "زباں ہائے لال" سے خود غالب کی گنگ زبان مراد ہوگی۔ لیکن اگر "زبان ہائے لال" کا تعلق دوسروں سے ہو تو پھر مفہوم یہ ہوگا کہ جب لوگ میرا حال پوچھتے ہی نہیں تو پھر میں حسرت اظہار کا گلہ کس سے کروں۔ زیادہ قرین قیاس یہی مفہوم ہے۔ گو اس صورت میں "زباں ہائے لال" بہ صورت جمع استعمال کرنے کا کوئی محل نہیں ہے۔

۳۔ کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا ‏ ‏ ‏ رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

آئینہ پرواز= محو آرائش۔

رحمت کے بعد لفظ کر محذوف ہے۔

شاعر خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو کس پردہ میں محو آرائش ہے۔ سامنے آ اور اس کا انتظار نہ کر کہ میں عذر گناہ پیش کروں۔ کیونکہ میرا لب بے سوال (یعنی میرا کچھ نہ کہنا) ہی میری بڑی معذرت ہے جس پر تجھے رحم کرنا چاہیے۔ مدعا یہ کہ جو کچھ دینا ہے بے طلب دے۔ سوال کا انتظار نہ کر۔

۴۔ ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی ‏ ‏ ‏ اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

دوسرے مصرع میں "شوق منفعل" غور طلب ہے۔ اگر یہ ترکیب توصیفی ہو اور منفعل کو شوق کو صفت قرار دیا جائے تو پھر پہلا مصرع بے معنی سا ہو جاتا ہے کیونکہ جب شوق خود محبوب کے

خیال دشمنی پر منفعل ہے تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ "ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی!" اس لیے اگر شوق اور منفعل دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھ کر منفعل کے بعد لفظ "ہو" محذوف تسلیم کیا جائے تو البتہ پہلا مصرع اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اے شوق تیرا خیال کہ محبوب تیرا دشمن ہے صحیح نہیں اور اس بدگمانی پر تجھے منفعل (شرمندہ) ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے دوسرا مصرع یوں ہو:

اے شوق منفعل ہو، تجھے کیا خیال ہے

۵۔ مشکیں لباس کعبہ، علی کے قدم سے جان ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

مشکیں لباس سے سیاہ لباس نہیں، بلکہ مشک کی سی خوشبو دینے والا لباس مراد ہے۔ نافِ زمین سے مراد مرکز زمین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کعبہ نافِ زمین ہے۔

نافِ غزال = ہرن کی ناف جس کے اندر مشک پیدا ہوتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ کعبہ کے لباس سے اگر مشک کی سی خوشبو آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی وہاں پیدا ہوئے تھے، ورنہ کعبہ گو نافِ زمین سہی مگر نافِ غزال تو نہیں کہ اس سے مشک کی خوشبو پیدا ہو۔

۶۔ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

عرصۂ آفاق سے مراد عرصۂ زمین ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ زمین کی وسعت میری وحشت و صحرا نوردی کے لیے اتنی تنگ تھی کہ زمین ہم کو دیکھ کر شرم سے پسینہ پسینہ ہوگئی اور دریائے عرق انفعال بن گئی۔

۷۔ ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالب اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہستی یا عالمِ موجودات کے فریب میں نہ آجانا۔ یہ سراسر وہم و خیال ہے ان کا وجود بظاہر کہیں نہیں۔

غزل نمبر ۱۴۳

۱۔ ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا ظاہراً کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

غلط بردار کاغذ وہ کاغذ ہے جس سے کوئی حرف بآسانی مٹایا جا سکے۔ لیکن یہاں خود کاغذ کو اس معنی میں غلط بردار کہا گیا ہے کہ وہ خود حرفِ غلط کو مٹا دیتا ہے چونکہ محبوب نے اپنے خط میں کسی جگہ غلطی سے حرفِ وفا لکھ دیا تھا اس لیے وہ آپ ہی آپ کاغذ سے مٹ گیا اور عاشق کو اس کی تردید کی ضرورت بھی نہیں ہوئی۔

۲۔ جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں　　ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

ہم چاہتے تو یہ ہیں کہ کسی طرح یک دم جل کے فنا ہو جائیں لیکن باوجود اس کے کہ ہمارا ہر نفس آتش بار ہے ہم جل نہیں سکتے اور اس طرح ذوقِ فنا کے پورے نہ ہو سکنے پر ہمارا جی ہر وقت جلتا رہتا ہے۔

۴۔ ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ　　جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

عذر خواہ = معذرت کرنے والا۔

مفہوم یہ ہے کہ جس کے جلوہ سے زمین تا آسمان مست و سرشار ہے وہ جانتا ہے کہ یہاں کے ہر ہر ذرہ کو مست و سرشار ہونا چاہیے۔

۵۔ مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی　　زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

غالبؔ نے شعر بالکل مومنؔ کے رنگ میں کہا ہے۔

غالبؔ معشوق سے کہتا ہے کہ اب تو مجھے یہ بات یاد نہ دلا کہ میں تجھے اپنی زندگی کہا کرتا تھا۔ کیونکہ آج کل میں زندگی سے بھی بیزار ہوں۔

غزل نمبر ۱۴۵

۱۔ مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے　　جسے کہتے ہیں سب نالہ وہ اس عالم کا عنقا ہے

مفہوم یہ ہے کہ تمناؤں کے ہجوم نے مجھے حیرت کدہ بنا دیا ہے اور عالمِ حیرت میں انسان خاموش رہتا ہے۔ اس لیے نالہ و فریاد کا کیا ذکر۔

نالہ و فریاد کو عالمِ حیرت کا عنقا کہنا اس بنیاد پر ہے کہ عنقا کا بس نام ہی نام ہے بھلا پر اس کا کہیں وجود نہیں پایا جاتا۔

۴۔ نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی　　　　کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

جب انسان مایوس ہوتا ہے تو کفِ افسوس ملتا ہے اور جب باہم عہد و پیمان ہوتا ہے تو بھی ہاتھ سے ہاتھ ملا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ عالمِ یاس میں کفِ افسوس ضرور ملتا ہوں لیکن چونکہ ناامیدی اور یاس کی تکلیف میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے اس لیے میں اپنے دل کو سمجھاتا ہوں کہ میرا کفِ افسوس ملنا ناامیدی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ تجدیدِ تمنا کا عہد و پیمان ہے۔

غزل نمبر ۱۴۶

۱۔ زخم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے　　　　نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

بود = ہستی۔

چراغ کشتہ = بجھا ہوا چراغ۔

دود = دھواں۔

غالب نے چراغ کشتہ عنقریب بجھ جانے والے چراغ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے بجھے ہوئے چراغ کے مفہوم میں نہیں ورنہ طلبِ رحم کا فقرہ بے کار ہو جاتا۔

مدعا یہ کہ ترا بیمارِ وفا اب زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور چند گھڑی کا مہمان ہے۔ اس لیے اس وقت تو تجھے رحم کرنا ہی چاہیے۔

نبض کو دودِ چراغ کشتہ سے تشبیہ دینا اس بناء پر ہے کہ اطبا آخری وقت کی نبض کو نبض دودی کہتے ہیں۔

۲۔ دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں　　　　ورنہ یہ بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

چراغ کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ بجھ جائے (بے رونق ہو جائے) کیونکہ اس سے اس کا جلنا ختم ہو جاتا ہے لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ جب ایک آرزو فنا ہوتی ہے تو دوسری آرزو پیدا کر لیتے ہیں اور اس چراغ کو بجھنے نہیں دیتے۔

غزل نمبر ۱۴۷

۱۔ چشمِ خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے　　　　سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

اپنی آنکھوں کو نوا پرداز کہنا اسی بنا پر ہے کہ باوجود خاموشی کے اُن میں ایک ایسی کیفیت ضرور پائی جاتی ہے جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہوں لیکن اس خیال کے اظہار کے لیے غالبؔ کی دشوار پسند فطرت نے شعلۂ آواز اور سُرمہ کی صورت میں اس کے لیے دھواں بھی پیدا کر دیا ورنہ اصل مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ معشوق کی سرمہ آلود آنکھیں باوجود کچھ نہ کہنے کے بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔

۲۔ پیکرِ عشاق ، سازِ طالعِ ناساز ہے   نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

غالبؔ نے اس شعر میں نہایت ناگوار مبالغہ و تعبیر سے کام لیا ہے۔ عشاق عاشق کی جمع ہے اور ایک فارسی راگنی کا بھی نام ہے اس لیے اس کو سامنے رکھ کر غالب نے ساز بھی پیدا کیا اور ''طالع ناساز'' کی رعایت سے ناموافق سیارہ بھی ڈھونڈھ نکالا اور پھر اپنے نالہ کو اس سیارہ کی آواز گردش قرار دیا۔ ورنہ صرف یہ کہنا تھا کہ ہماری آہ و زاری کا سبب صرف ہماری ازلی بدنصیبی ہے اور ہم پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ نالہ و فریاد کرتے رہیں۔

۳۔ دستگاہِ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا   یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

دستگاہ = قدرت۔ کمال۔

یک بیاباں جلوۂ گل = ایک وسیع تختۂ گل۔

فرش پا انداز = وہ فرش جو کسی کے خیر مقدم کے لیے اس کی راہ میں بچھایا جاتا ہے اور عموماً سُرخ کپڑے کا ہوتا ہے۔

کہنا صرف یہ ہے کہ مجنوں نے اپنی چشمِ خونبار سے سارے دشت کو رنگین بنا دیا ہے۔ لیکن اس کو ظاہر اس طرح سے کیا ہے کہ دشت میں جو وسیع جلوۂ گل نظر آتا ہے وہ مجنوں کی خونبار آنکھوں کا پیدا کیا ہوا ایک فرشِ پا انداز ہے۔

غزل نمبر ۱۴۸

۱۔ عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی

اس غزل میں ردیف (ہی سہی) کا استعمال آسان نہ تھا اور مطلع کے دوسرے مصرعہ میں غالبؔ بھی ردیف کا صحیح استعمال نہ کر سکے ''ہی سہی'' ہمیشہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی

نامناسب یا گری ہوئی بات کو بدرجہ مجبوری تسلیم کر لیا جائے۔

اب اس شعر کے مفہوم پر غور کیجیے۔

غالبؔ جب اپنے عشق کا اظہار کرتے ہیں تو معشوق بگڑ کر کہتا ہے کہ یہ عشق نہیں وحشت ہے۔ غالبؔ یہ سُن کر معشوق سے کہتے ہیں۔ چلو عشق نہیں وحشت ہی سہی لیکن اس سے تو انکار ممکن نہیں کہ میری یہی وحشت تمھاری شہرت کا باعث ہے۔ اس مفہوم کے پیش نظر دوسرے مصرعہ میں ردیف کا استعمال صحیح نہیں کیونکہ موقع طنزیہ انداز میں "تیری شہرت تو ہے" کہنے کا تھا نہ کہ "شہرت ہی سہی" کا۔

۳۔ میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی   اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ معشوق ایک مجلس منعقد کرتا ہے لیکن اس میں غالبؔ کو باریابی کی اجازت نہیں ملتی۔ غالبؔ شکایت کرتے ہیں تو معشوق کہتا ہے کہ یہ کوئی مجلس نہیں ہے بلکہ خلوت کی ایک صحبت ہے اس پر غالبؔ کہتے ہیں:

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی   اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

(۲) دوسرا مفہوم یہ کہ محبوب مجلس میں غالبؔ کو شرکت کی اجازت نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ تمھاری شرکت سے رسوائی کا اندیشہ ہے اس پر غالبؔ کہتے ہیں اس میں رسوائی کی تو کوئی بات نہیں لیکن اگر تم ایسا ہی سمجھتے ہو تو مجلس نہ سہی خلوت ہی میں بلا لو۔

۴۔ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے   غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

یہ شعر مومنؔ کے رنگ کا ہے۔ جس میں بالکل نئے انداز سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔

غالبؔ نے غیر سے محبوب کی رسم و راہ دیکھ کر کہا کہ تو اس سے کیوں ملتا ہے جبکہ وہ تجھ سے محبت نہیں بلکہ صرف محبت کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب نے کہا کہ "نہیں تم غلط کہتے ہو اسے واقعی مجھ سے محبت ہے" یہ سن کر غالبؔ نے کہا کہ چلو مان لیا کہ غیر کو تم سے محبت ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مجھے محبت نہیں ہے۔ کیونکہ تجھ سے میرا نہ محبت کرنا خود اپنے آپ سے دشمنی کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص آپ اپنا دشمن نہیں ہو سکتا۔ یعنی غیر کا تجھ سے محبت کرنا تو صرف محبت کے لیے ہے۔ لیکن میرا محبت کرنا تو میری مجبوری ہے کیونکہ وہی میری زندگی ہے۔

۵۔ اپنی ہی ہستی سے ہو جو کچھ ہو آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

اپنی ہستی سے آگہی بھی عرفانِ حق ہے اور اپنے آپ سے غفلت (یعنی اپنے آپ کو بھلا دینے یا مٹا دینے) کا نتیجہ بھی وہی ہے۔

مدعا یہ کہ معرفتِ خداوندی کا تعلق اپنی ہی ذات سے ہے خواہ ہم آگاہی سے کام لیں یا غفلت سے غفلت کا لغوی مفہوم بھلا دینے یا ترک کر دینے کا ہے۔

غزل نمبر ۱۴۹

۱۔ ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

آرمیدگی = آرام طلبی۔

نکوہش = ملامت۔

میری آرام طلبی یقیناً قابلِ ملامت ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ صبحِ وطن بھی مجھ پر ازراہِ طنز ہنس رہی ہے۔ صبح کو خندۂ دنداں نما کہنے کی وجہ ظاہر ہے۔

۳۔ کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

نکہتِ گل سے حیا آنے کا سبب یہ ہے کہ وہ باغ میں محبوب کی بے حجابیوں کی یاد دلا دیتی ہے اور چونکہ باغ میں بے حجابیوں سے کام لینا گویا سرِ عام بے حجاب ہو جانا ہے اس لیے عاشق کو معشوق کی اس عدم حیا پر حیا آنا ہی چاہیے۔

غزل نمبر ۱۵۲

۱۔ رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

سال سے مراد عمر ہے۔

دنیا میں عمر بسر کرنا گویا انتہائی اضطراب اور بے چینی کے دن کاٹنا ہیں۔

اس لیے عمر کا حساب آفتاب کی گردش سے نہیں بلکہ تابشِ برق سے کرنا چاہیے۔

۲۔ مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے

تدرو = چکور

غالب نے اس شعر میں اپنے لطفِ میخواری کا ذکر کیا ہے اور استعارتاً مینا کو سرو اور موجِ شراب کو "بالِ تدرو" قرار دے کر گویا باغ کا سماں پیدا کیا ہے۔

۳۔ نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا　　جوشِ بہار ، جلوہ کو جس کے نقاب ہے

اس حُسنِ برق پاش کا نظارہ جس کا نقاب خود بہار ہو کون کر سکتا ہے۔

برق کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ اگر برقِ حُسن کی جگہ جانِ حُسن کہا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

غزل نمبر ۱۵۳

۱۔ ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے　　آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اس شعر میں دل کی تعبیر آبگینہ سے اور اندیشہ کی تندیٔ صہبا سے کی گئی ہے۔

اندیشہ فکر و تامل کو کہتے ہیں لیکن یہاں خیال کی بلندی مراد ہے۔

مدعا یہ ہے کہ اگر میری گرمیٔ خیال کا یہی عالم رہا تو میں خود اس سے فنا ہو جاؤں گا جیسے شراب کی تیزی سے شیشہ پگھل جائے۔

غزل نمبر ۱۵۴

۱۔ گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے　　تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

شکلِ نہالی = قالین یا بستر کے نقش و نگار۔

بردِ لیالی = راتوں کی سردی۔

ہجر کی راتیں میرے لیے اس قدر سرد تھیں کہ اگر بستر کی تصویروں کو دیکھ کر مجھے محبوب کی یاد نہ آجاتی اور میں اس کو یاد کر کے سرگرمِ فریاد نہ ہوتا تو زندہ نہ رہتا۔

۲۔ نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم　　لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

نسیہ = قرض۔

دو عالم = دنیا و عقبیٰ۔

نقد سے مراد دنیا ہے اور نسیہ سے عقبیٰ۔ مفہوم یہ ہے کہ میں خوب جانتا ہوں دنیا و عقبیٰ کا سودا کس طرح ہوا کرتا ہے۔ اس لیے میری ہمت عالی نے یہ سودا گوارا نہ کیا اور مجھے دین و دنیا کسی کے ہاتھ بکنے نہ دیا۔

۳۔ کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم کر دیا کافر، ان اصنامِ خیالی نے مجھے

کثرت آرائی وحدت = سے مراد دوست کو کثرت میں جلوہ گر دیکھنا ہے۔

مدعا یہ کہ واجب الوجود کا یہ تصور کہ وہ ہر چیز میں نمایاں ہے محض وہم پرستی اور خیالی اصنام تراشی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا عالم خود کلی حیثیت سے خدا ہے اور یہ سمجھنا کہ خدا فلاں فلاں صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ جذبۂ وحدت پرستی کے منافی ہے۔

غزل نمبر ۱۵۵

۱۔ کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے برقِ خرمنِ راحت خونِ گرم دہقاں ہے

مدعا یہ کہ دنیا میں انسانی سعی و عمل کا مال رنج و الم کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً لالہ کو دیکھیے کہ دہقان کس محنت سے لالہ اُگاتا ہے لیکن جب وہ اُگتا ہے تو یکسر داغ نظر آتا ہے۔

۲۔ غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل پریشاں ہے

غنچہ کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پنکھڑیاں ایک جگہ سمیٹے ہوئے بڑا مطمئن سا ہے لیکن یہ اسی وقت تک ہے جب تک وہ پھول نہیں بنا ادھر پھول بنا اور اُس کی پنکھڑیاں منتشر ہوئیں۔

۳۔ ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے داغ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

خس بدنداں ہونا = اظہار عجز کرنا۔ "پشت دست بر زمیں نہادن" فارسی میں کورنش بااظہارِ فروتنی کو کہتے ہیں۔

شعلہ کو "خس بدنداں" اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ خس و خاشاک ہی سے پیدا ہوتا ہے اور داغ کو "پشتِ دست" کہنا اس کی ظاہری حالت کے لحاظ سے ہے۔

مدعا یہ کہ جس دنیا میں داغ و شعلہ کی عاجزی کا یہ عالم ہو وہاں رنجِ بیتابی دنا کا می اُٹھانا کتنا مشکل ہے۔

غزل نمبر ۱۵۷

۱۔ رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے — اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

واماندگی= خستگی۔ مراد اپنی واماندگی سے ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جب منزل میں ہمارے قدم انتہائی خستگی کی وجہ سے نہیں اُٹھتے تو ہم کیوں رنجِ رہ نوردی اختیار کریں۔

مدعا یہ کہ اس دنیا کی تگ و دو محض سعی بے حاصل ہے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان بہ حالت مایوسی ایک جگہ تھک کر بیٹھ جائے۔

۶۔ جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی — فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

معشوق نے غالبؔ سے کہا کہ تیرے دل میں آتشِ دوزخ بھری ہوئی ہے۔ غالبؔ نے کہا ہاں یہ ایسا ہی ہوگا جیسا تو کہتا ہے لیکن یہ تو بتا کہ فتنۂ شورِ قیامت کا تعلق کس کے خمیر سے ہے۔ میرے یا تیرے؟

غزل نمبر ۱۶۳

۱۔ کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

ہم نفس= ساتھی۔ احباب۔ اس شعر میں کئی باتیں محذوف ہیں۔

غالبؔ کے احباب نے محبوب کے پاس جا کر غالبؔ کی شدتِ گریہ وزاری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کا اثر کہاں تک نہ ہوگا۔ اس پر محبوب نے کہ گریہ وزاری کے اثر کا خیال غلط ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو مجھ پر اس کا اثر ضرور ہونا چاہیے تھا یہ دلیل سن کر غالبؔ کے احباب نے بھی اس کی تصدیق کی اور لوٹ کر غالبؔ سے سارا حال بیان کیا۔

غالبؔ نے یہ ساری داستان سُن کر یہ شعر کہا۔

غزل نمبر ۱۶۵

۱۔ جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی — نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

اگر کچھ زمانہ ہم نے خوشی میں گزار لیا اور تھوڑی بہت زندگی کی لذت حاصل کر لی تو اس سے ہمارے ذوقِ جنوں پر تسکین کی تہمت نہ رکھنا چاہیے کیونکہ زندگی کی عارضی لذت تو اور زیادہ زخمِ دل پر نمک چھڑکتی ہے۔ پہلے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے میں "نہ ہو" "کیونکہ نہ ہو" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی — ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

ہستی کی کشمکش سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش فضول ہے کیونکہ اس سے آزادی ممکن نہیں۔ مثلاً پانی کی موج کو دیکھئے کہ وہ روانی کے لیے آزاد ہے لیکن پھر بھی اس کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے۔

(موجوں کی صورت زنجیر کی سی ہوتی ہے۔)

۳۔ پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے — شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

میرے مرنے کے بعد بھی میری قبر لڑکوں کی جولاں گاہ بنی ہوئی ہے جس پر وہ پتھر پھینکتے ہیں اور ان پتھروں سے جو شرارے نکلتے ہیں وہ گویا پھول ہیں جو میری تربت پر چڑھائے جاتے ہیں۔ مدعا یہ کہ میری تربت پر شرر افشانی بھی گویا گل افشانی کی صورت رکھتی ہے۔

غزل نمبر ۱۶۶

۱۔ نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی — مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

معشوق کے ظلم کی فریاد قابلِ ملامت چیز ہے اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن میں محبوب کے ظلم کی فریاد کروں اور صبحِ محشر میری ہنسی اڑائے۔

۲۔ رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے — اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

مشہور ہے کہ ایک بار لیلیٰ نے فصد کھلوائی تو مجنوں کی رگ خون دینے لگی۔ اسی راویت کے پیشِ نظر غالبؔ نے یہ شعر کہا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر دہقان دشتِ مجنوں میں دانہ کی جگہ

نوکِ نشتر ہو وے تو عجب نہیں کہ رگِ لیلیٰ بھی اس کی خلش محسوس کرنے لگے۔

۳۔ یہ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

ہر مجلس میں شمع روشن کی جاتی ہے جس پر پروانے آ آ کر گرتے اور پھر دورِ شراب چلتا ہے اس کو سامنے رکھ کر غالبؔ نے پرِ پروانہ کو کشتیِ مے کا بادباں فرض کیا اور اس کشتی کی روانی کو دورِ ساغر سے ظاہر کیا۔ نہایت دُور از کار اور بے لطف تخیّل ہے۔

۴۔ کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت کہ طاقت اڑگئی اُڑنے سے پہلے میرے شہ پر کی

پرفشانی = پرواز۔ پر پھڑ پھڑانا

شہ پر = سب سے بڑا پر جس کی مدد سے طائر اُڑتا ہے۔

اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ بہت کم عمری ہی میں میں نے ذوقِ پرواز میں اپنے پر اس قدر پھڑ پھڑائے کہ جب اُڑنے کا زمانہ آیا تو معلوم ہوا کہ شہ پر بیکار ہو چکا ہے اور یہ اتنا بڑا ظلم میرے شوقِ پرواز کا ہے جس کا اظہار ممکن نہیں۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ذوقِ پرواز سے مجبور ہو کر میں نے اُڑنے کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ شہ پر پہلے ہی سے بیکار ہیں۔ دراصل یہ ظلم مجھ پر ذوقِ پرواز کا ہے کیونکہ اگر وہ مجھے مجبور نہ کرتا تو مجھ کو احساسِ بے پروبالی بھی نہ ہوتا۔

غزل نمبر ۱۶۷

۱۔ ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

اس شعر کی بنیاد اردو کے ایک محاورے پر قائم ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی چیز بہت کم ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ "بس قسم کھانے کو" ہے۔ یعنی اتنی کم ہے کہ اگر ہم سے کوئی قسم نہ کھلوائے تو ہم اس کے وجود سے انکار کردیں۔

اس شعر میں غالب بھی یہی کہنا چاہتا ہے کہ ہم بالکل مٹ چکے ہیں اور ہماری ہستی صرف کہنے کو رہ گئی ہے پہلے مصرعہ میں لفظ دلیل بہ معنی حجت و برہان استعمال نہیں ہوا بلکہ بمعنی۔ رہنمائی و

اشارہ لایا گیا ہے۔

۷۔ اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے　　اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

دوسرے مصرعہ میں "رزقِ ہم" کا مفہوم عام طور پر "رزق باہم" سمجھا جاتا ہے۔

یعنی اجزائے نالہ نے ایک دوسرے کو کھالیا یہ بڑی مضحک سی بات ہے ہم کے معنی "غم والم" کے ہیں۔ اس لیے شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ تیری تند خوئی و برہمی کے خوف سے میرا نالہ باہر نہ آسکا اور وہ دل ہی دل میں گھٹ کر نذرِ غم ہو گیا۔

۸۔ اہلِ ہوس کی طمع ہے ترکِ نبردِ عشق　　جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

غالبؔ کا یہ شعر بالکل ناسخ کے رنگ کا ہے جس میں محض ایک لفظ "اُٹھ گئے" کو سامنے رکھ کر نہایت رکیک سی بات کہہ دی۔

علم ہوا۔ بلند ہونے کو بھی کہتے ہیں اور پاؤں اُٹھنے میں بھاگ کھڑے ہونے کے علاوہ بلند ہونے کا مفہوم بھی پنہاں ہے۔ اس لیے اس ابہام کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا گیا ہے۔

۹۔۱۰۔ نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے　　جو واں نہ کھنچ سکے سو یہاں آ کے دَم ہوئے

دَم = سانس

مفہوم یہ ہے کہ عدم میں ہم کو یہ خدمت سپرد کی گئی تھی کہ نالے کرتے رہیں۔ لیکن جتنے نالے مقسوم ہو چکے تھے وہ سب کے سب دنیائے عدم میں کھنچ نہ سکے۔ اس لیے دنیائے وجود میں آ کر وہ ہم کو پورے کرنے پڑتے ہیں اور اب ہماری ہر سانس نے نالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مدعا یہ کہ ہماری زندگی نالہ و فریاد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

غزل نمبر ۱۶۸

۱۔ جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی　　تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ میزبانی

یہ شعر بھی حُسنِ تعبیر سے معرّا ہے۔ نقد کا فسردگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح۔ شعلہ کی پاسبانی بھی "نقدِ داغِ دل" سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ خزانے کی حفاظت کے لیے آگ روشن نہیں کی

جاتی، بلکہ قدیم روایات کے مطابق یہ خدمت سانپ کے سپرد کی جاتی ہے۔ علاوہ اس کے میزبانی بھی "نقدِ داغِ دل" سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اگر پہلے مصرعہ میں "نقدِ داغِ دل" کی جگہ "لالہ زارِ دل" ہوتا تو یہ نقائص ایک حد تک دور ہو سکتے تھے۔

غزل نمبر ۱۶۹

غالبؔ کی یہ غزل غزل بھی ہے اور مرثیہ بھی اور دونوں حیثیتوں سے بہت کامیاب ہے اگر اس کے دوسرے تیسرے اور چوتھے شعر کو نکال دیا جائے تو پوری غزل مرثیہ ہو جاتی ہے جس میں "عہدِ بہادر شاہ ظفرؔ" کی تصویر نہایت حسرت آمیز لب ولہجہ میں کھینچی گئی ہے۔

۱۔ ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے　　　اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

"شبِ غم کا جوش" بقول غالبؔ انتہائی تاریکی ظاہر کرنے کے لیے ستعمال کیا گیا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں اس شدید تاریکی کا ثبوت یہ دیا گیا ہے کہ شمع جو دلیلِ سحر ہو سکتی ہے وہ بھی خاموش ہے اس شعر میں لفظ خموش سے ایہام کا لطف پیدا کیا گیا ہے کیونکہ خموش کے معنی ساکت ہونے کے بھی ہیں اور بجھی ہوئی شمع کو بھی شمعِ خاموش کہتے ہیں۔

صبح کو عموماً شمع بجھادی جاتی ہے۔ لیکن غالبؔ نے یہاں اس کے دوسرے معنی سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

۲۔ نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال　　　مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

ایک زمانہ ہو گیا کہ نہ آنکھوں کو نظارۂ جمال کا موقع ملا اور نہ کانوں کو مژدہ وصال سننے کا۔ اس لیے اب چشم و گوش دونوں میں باہم صلح ہو گئی ہے۔ ورنہ پہلے یہ تھا کہ جب آنکھ کو نظارۂ جمال کا موقع ملتا تو کان اس پر رشک کرنے لگتا تھا اور جب کانوں کو مژدہ وصال پہنچتا تھا تو آنکھ رشک کرتی تھی کہ پہلے مجھے کیوں نہ نظارۂ جمال کا موقع ملا۔

۳۔ مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب　　　اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

"یاں" اس جگہ "اب" کے محل پر استعمال کیا گیا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جب معشوق نشۂ شراب کی وجہ سے بے حجاب ہو جائے تو شوق کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے ہوش کو رخصت کر دے اور بے باک ہو جائے۔

۴۔ گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

عقد = ہار۔ مالا۔

محبوب کے گلے کے ہار میں موتی دیکھ کر غالب کو یہ خیال آیا کہ موتی کی خوش نصیبی تو ظاہر ہے کہ گردنِ خوباں سے متصل ہے۔ لیکن جس نے یہ موتی فروخت کیا ہے وہ بھی کم خوش قسمت نہیں کیونکہ وہ نہیں تو کم از کم اس کا موتی تو محبوب کی گردن تک پہنچ گیا۔

۵۔ دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست　　بزمِ خیال مے کدۂ بے خروش ہے

دیدار کو بادہ قرار دیا، حوصلہ کو ساقی اور نگاہ کو بادہ خوار۔ مدعا یہ کہ خیال و تصور کا مے کدہ بھی کتنا پُرسکون میکدہ ہے جہاں ہم حُسن یار کا نظارہ کر کر کے مست ہو رہے ہیں اور کوئی شور و ہنگامہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد سات اشعار مرثیہ کے انداز کے ہیں جس میں دلّی کے اُجڑنے کا حال نہایت لطیف و موثر لب و لہجہ میں بیان کیا گیا ہے۔

غزل نمبر ۱۷۱

۱۔ ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے　　کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

غم میں آدمی سر جھکا کے بیٹھ جاتا ہے۔ غالب اس غم کی شدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ میرا سر ہجوم غم سے اتنا جھک گیا ہے کہ تارِ نگاہ تارِ دامن سے مل گیا ہے۔

۲۔ وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب　　چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

مفہوم یہ ہے کہ وہ گل (یعنی محبوب) جس گلستاں میں جلوہ فرما ہوتا ہے وہاں کی ہر کلی فرط مسرت سے چٹکنے لگتی ہے۔ اور یہ چٹکنا اس کا گویا خندۂ دل ہے۔

کلی کی مشابہت دل سے ظاہر ہے اور چٹکنے میں جو ایک آواز سی پیدا ہوتی ہے اُس کی تعبیر

خندۂ دل سے کی گئی ہے۔

"جلوہ فرمائی کرنا" اچھی زبان نہیں کیوں کہ محض جلوہ فرمائی سے مفہوم پورا ادا ہو جاتا ہے۔

اس لیے اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔

"وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرما ہو وہاں غالبؔ"

غزل نمبر ۱۷۲

۱۔ پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد — خار پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

"پا بدامن کشیدن" فارسی میں پاؤں سمیٹ کر بیٹھ جانے اور آمد و شد ترک کر دینے کے مفہوم میں مستعمل ہے۔

بسکہ = چونکہ۔

آئینۂ زانو سے مراد خود زانو ہے۔

زانو کو آئینہ کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آئینہ کو زانو پر رکھ کر دیکھا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ زانو کی ہڈی آئینہ کی طرح ہوتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ میں چونکہ پاؤں سمیٹ کر ایک جگہ بیٹھ گیا ہوں اس لیے اپنی طبعی صحرا نوردی کی بناء پر میرے آئینۂ زانو یعنی خود زانو میں پاؤں کے کانٹے جوہر آئینہ کی طرح اب بھی نمایاں ہیں یا یہ کہ آئینۂ زانو کے جوہر مجھے بالکل خار پا کی طرح نظر آتے ہیں۔ مدعا یہ کہ باوجود شکستہ پائی کے صحرا نوردی کی یاد دل سے نہیں نکلتی۔ جوہر آئینہ یا صیقل آئینہ سے کانٹوں کی تشبیہ ظاہر ہے۔

۲۔ دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

وصل و ہم آغوشی کے وقت شدتِ جذبات سے ایک عاشق ایسا محسوس کر سکتا ہے کہ معشوق خود اس میں اور وہ خود معشوق کے اندر سمایا جا رہا ہے۔ اسی جذبہ کو غالبؔ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم آغوشی کے وقت میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ محبوب کے جسم کا ہر ہر رونگٹا مجھ سے واقف ہے اور میں اس سے۔

غزل نمبر ۱۷۳

۱۔ جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

"صورتِ دیوار" سے مراد غالباً وہ نقوش و تصاویر ہیں جو دیوار پر نقش کی جاتی ہیں مدعا یہ کہ جب تو کسی بزم میں آتا ہے تو تیری جاں بخش باتیں سن کر دیوار کی تصویروں میں جان آجاتی ہے۔

اس شعر میں ایک دعویٰ کیا گیا ہے بغیر کسی دلیل کے اور غالب کے یہاں اس عیب کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ علاوہ اس کے کالبد کا استعمال بے محل ہے کالبد یا قالب کے مفہوم میں جسمیت کا تصور ضروری ہے اور نقش یا تصویر میں کوئی جسم نہیں ہوتا۔ ہاں اگر صورتِ دیوار سے مراد خود دیوار ہو تو مفہوم یہ ہوگا کہ خود دیوار میں جان آجاتی ہے اور اس مفہوم کی رکاکت ظاہر ہے لیکن اگر صورت دیوار سے اُبھرے ہوئے نقوش مراد ہوں۔ تو البتہ کالبد کا استعمال صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس طرح صورت کا استعمال واحد میں غلط ٹھہرے گا۔ صور بحالتِ جمع ہونا چاہیے۔

۴۔ دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر　　کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

پہلے تم مجھے شکایت کا موقع تو دو کہ اس پر تمھیں غصہ آئے اور مجھ پر زیادہ ظلم کرو، یوں بے وجہ ستانے میں کیا لطف ہے۔

میری شکایت کے بعد جب تم کو غصہ آئے گا تو جذبہ تعزیر و انتقام کے زیر اثر ظلم بھی شدید ہوگا۔ اور ظلم کی شدت ہی میری عین تمنا ہے۔

۵۔ اُس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ　　طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

طوطی کے سامنے آئینہ رکھ کر اس کو بولنا سکھایا جاتا ہے اس لیے طوطی کے ساتھ آئینہ کا ذکر تو درست ہے لیکن خود آئینہ کا چشمِ فسوں گر کے اشارہ سے گفتار میں آجانا لایعنی سی بات ہے۔ آئینہ کا گفتار سے کوئی تعلق نہیں بلکہ سکوت و حیرانی سے ہے۔

آئینہ کی حیرانی و سکوت کا چشم فسوں گر کے اشارہ سے گفتگو میں تبدیل ہو جانا عجیب بات ہے۔

غزل نمبر ۱۷۵

۱۔ نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا　　گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

سیہ خانہ = مطلق خیمہ کو کہتے ہیں۔ سیاہ رنگ سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن غالب کو لفظ سیہ سے شمع اور چشم و چراغ کے استعمال کا موقع مل گیا۔

مفہوم یہ ہے کہ اگر قیس خیمہ لیلیٰ کی شمع نہیں بن سکتا تو کیا مضائقہ، وہ رونق صحرا تو ہے۔

غزل نمبر ۱۷۷

۱۔ شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے   یہ بھی مت کہہ کہ "جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے"

دوسرے مصرع میں یہ کا اشارہ پورے اس فقرے کی طرف ہے جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے۔

خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ وہ بے مہر شکوہ کجا، شکوہ کے نام سے بھی خفا ہوتا ہے۔

۳۔ گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو!   شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

میں جب شکوۂ جور کرتا ہوں تو وہ اور زیادہ جور پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ میرا مقصود ہی یہ ہے کہ میں شکوۂ جفا کروں اور وہ اس شکوہ سے خفا ہو کر اور زیادہ جفا مجھ پر کرے۔

۶۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ   کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

ہماری ہر تمنا اُلٹی ہو جاتی ہے یعنی اگر ہم بھلا چاہتے ہیں تو بُرا ہو جاتا ہے اس لیے خوب ہوتا اگر ہم پہلے ہی بُرا چاہتے اور اس طرح اپنا بھلا ہو جاتا۔

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی   آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

غزل نمبر ۱۸۲

۱۔ تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے   اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

غالبؔ کا یہ شعر بہت اُلجھا ہوا ہے اور مشکل سے کھینچ تان کر اس میں کوئی مفہوم پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مقصود صرف عالی ظرفی کا اظہار ہے جس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص میری طرف سے پہلو تہی بھی کرے تو سمجھتا ہوں کہ میری جگہ بدستور خالی ہے۔

غالبؔ نے صرف لفظ تہی سے فائدہ اُٹھا کر "جا میری خالی" کا اظہار کیا اور ایہام گوئی کی یہ کوئی اچھی مثال نہیں۔

۲۔ رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

بڑا پاکیزہ شعر ہے اور اس میں نہایت نازک ولطیف تخیل سے کام لیا گیا ہے۔

کہتا ہے کہ عالم کی آبادی ورونق صرف اس لیے قائم ہے کہ اہل ہمت مفقود ہیں عجیب دعویٰ تھا لیکن غالب نے نہایت خوبصورتی سے اس کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ میخانہ کو دیکھو۔ اگر اس کے جام وسبو بھرے ہوئے ہیں۔ تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میخانے میں کوئی پینے پلانے والا نہیں۔ ورنہ اگر کوئی باہمت ساقی ہوتا تو جام وسبو سب خالی ہو جاتے اور میخانہ میں خاک اُڑنے لگی۔

غزل نمبر ۱۸۳

۲۔ خلش غمزہ خوں ریز نہ پوچھ دیکھ خونناب فشانی میری

اپنے غمزۂ خوںریز کی خلش کا حال مجھ سے نہ پوچھ بلکہ میری خونناب فشانی دیکھ کر خود سمجھ لو کہ اس خلش نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔

۴۔ ہوں ز خود رفتہ بیدائے خیال بھول جانا ہے نشانی میری

بیدائے خیال۔ صحرائے خیال۔

مفہوم یہ ہے کہ میں خیال کی دنیا میں گم ہو چکا ہوں اس لیے مجھے بھلا دینا ہی مجھے یاد کرنا ہے۔

۵۔ متقابل ہے مقابل میرا رُک گیا دیکھ روانی میری

متقابل=ضد

مقابل=حریف یعنی دوست۔

میرا دوست طبعاً بالکل میری ضد واقع ہوا ہے یہاں تک کہ اس نے میری روانی دیکھی تو رُک گیا۔

"رُک گیا" کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا اظہار خود غالب نے بھی نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ انھیں محض رُک گیا اور رواں کا تقابل کرنا تھا اور مقصود اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

۶۔ قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی=وزنی، بیش قیمت۔

میری حالت اُس سنگِ راہ کی سی ہے جسے ہر شخص ٹھکرا کر گزر جاتا ہے یعنی باوجود گراں ہونے کے بھی اتنا ارزاں ہوں۔

اس شعر میں محض لفظ گرانی سے ایہام پیدا کیا گیا ہے۔ اور کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتا۔

۷۔ گردبادِ رہِ بیتابی ہوں صرصرِ شوق ہے بانی میری

بانی=بانی مبانی۔

میری ہوائے شوق راہِ بیتابی میں بگولے کی طرح اُڑائے لیے پھرتی ہے۔

اس شعر میں قافیہ کا استعمال کراہت سے خالی نہیں۔

غزل نمبر ۱۸۴

۱۔ نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس شعر میں بے جا تکلف و تصنع کے سوا کچھ نہیں۔

معشوق رقیب کی آغوش میں ہے اور یہ ایسا مکروہ منظر ہے کہ اس کی تصویر کھینچنے کے لیے بجائے موقلم کے پائے طاؤس ہونا چاہیے (کیونکہ پائے طاؤس بہت بدنما ہوتا ہے اور تصویر کے نیچے کا حصہ (یعنی رقیب کا جسم) بھی ویسا ہی بدنما ہے۔

۲۔ تو وہ بد خو کہ تحیر کو تماشا جانے غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

تحیر کو تماشا جانے یعنی تحیر کو پسند کرے۔

مفہوم یہ ہے کہ میری داستانِ غم آشفتہ بیانی چاہتی ہے اور تو صرف تحیر و سکوت کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

۳۔ وہ تپِ عشق، تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

میں اس تپِ عشق کا متمنی ہوں جو جگر تک پہنچ کر سارے جسم کو شمع کی طرح سراسر شعلہ بنا دے۔

غزل نمبر ۱۸۵

۱۔ گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے　　ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

از بسکہ = بہت زیادہ۔

گلشن کو تیری صحبت وہم نشینی حد درجہ مرغوب ہے اور اس کے ہر غنچہ کا کھل کر پھول بن جانا گویا تیرے لیے اپنی آغوش کھول دینا ہے۔

۲۔ واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پر　　یاں نالہ کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

معشوق کا استغناء ہر دم بڑھتا جاتا ہے اور ادھر میرے نالہ کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اس کے بامِ استغناء تک پہنچ جاتا ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔

غزل نمبر ۱۸۷

۱۔ سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے ہم　　حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

پشت گرمی = امانت، مدد

آئینہ میں صیقل وجلا سیماب کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے اور چونکہ آئینہ کو حیران بھی کہتے ہیں اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ آئینہ کی حیرانی کا سبب سیماب ہے۔ اسی کے پیش نظر غالبؔ نے اپنی حیرانی کا سبب دلِ بیقرار کو ظاہر کیا ہے (دلِ بیقرار اور سیماب کی مشابہت ظاہر ہے)۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ "دے" کھٹکتا ہے اور صرف وزن پورا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ اس کو نکال دینے کے بعد مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔

غزل نمبر ۱۸۹

۱۔ دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

غالبؔ محبوب سے کہتا ہے کہ تم ہم سے منہ چھپا کر لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ ہماری تمھاری کوئی شناسائی نہیں ہے۔ حالانکہ تمھاری یہی ادا پردہ فاش کر دینے والی چیز ہے جس طرح تم اوروں سے بے تکلف ملتے ہو اسی طرح مجھ سے بھی ملو۔ خصوصیت کے ساتھ کسی سے پردہ کرنا راز

فاش کردیتا ہے۔

۶۔ دشمنی نے میری کھویا غیر کو　　کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے

غیر نے میرا ذکر محبوب کے سامنے چھیڑا تو وہ اس سے بھی برہم ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ میں "کس قدر دشمن ہے" کا فاعل غیر نہیں بلکہ محبوب ہے۔

غزل نمبر ۱۹۰

ا۔ ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان بڑا پر لطف ہے شاعر کہنا صرف یہ چاہتا ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے بیاباں سے گزرنا ضروری ہے اور ادھر بیاباں کا یہ حال ہے کہ میرے ہر قدم کے ساتھ وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ قطعِ بیاباں ممکن ہے اور نہ منزل تک رسائی آسان۔

۲۔ درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر　　ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

"درس عنوان تماشا" سے مراد صرف تماشا ہے۔ اگر "درسِ عنوان" کو حذف کر دیا جائے تو صرف لفظ تماشا سے مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔

پہلے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کے تماشا یا دیدار کا لطف اسی میں ہے کہ محبوب اس سے باخبر ہو۔

دوسرے مصرعہ میں نگہ کو "رشتۂ شیرازۂ مژگاں" کہنا اس حیثیت سے ہے کہ جس طرح "رشتۂ شیرازۂ مژگاں" غیر محسوس ہے اسی طرح میری نگہ بھی غیر محسوس ہے۔ اور محبوب کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔

ردیف "مجھ سے" کا استعمال "میرا" کی جگہ کیا گیا ہے جو تکلف سے خالی نہیں۔

۳۔ غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں　　کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

خانۂ آئینہ کی ویرانی یہ ہے کہ اس کے سامنے بیٹھ کر شغلِ آرائش ترک کر دیا جائے اور غمِ عشاق نے معشوقوں میں ترکِ آرائش کا خیال پیدا کر کے سادگی کی طرف مائل کر دیا تو خانۂ آئینہ کی ویرانی ظاہر ہے۔

پہلے مصرعہ میں "نہ ہو" کا تعلق زمانہ مستقبل سے ہے اور دوسرا مصرعہ "کا ہے" زمانہ حال کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے اگر پہلے مصرعہ میں "نہ ہو" کی جگہ "ہوا" کر دیا جائے تو یہ نقص دور ہو سکتا ہے یا پھر یوں سمجھا جائے کہ غمِ عشاق کو منادیٰ قرار دیا گیا ہے کہ تو "سادگی آموزِ بتاں" نہ بن لیکن یہ تاویل کچھ یونہی سی ہے۔

تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں غالب صرف اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے کہ میرے نہ ہونے سے اس نے سوگ لے لیا اور آئینہ کے سامنے بننا سنورنا چھوڑ دیا اور دوسرے مصرعہ میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کہیں یہ صورت عام نہ ہو جائے اور غمِ عشاق میں تمام معشوق ترکِ آرائش پر آمادہ ہو جائیں۔

۵۔ اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں　　　صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

اس شعر میں آبلہ کو گوہر اور جادہ صحرا کو رشتۂ گوہر قرار دیا ہے۔ مدعا یہ کہ میرے پاؤں کے چھالوں نے پھوٹ کر تمام جادۂ صحرا کو روشن کر دیا ہے۔

غزل نمبر ۱۹۲

۱۔ چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے　　　صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

گریبانی کرے = فارسی میں "گریباں کردن" چاک کرنے کو کہتے ہیں۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عالمِ وحشت میں (جب کہ جسم عریاں ہو) گریباں چاک کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو صبح کے مانند خود میرا زخمِ دل چاک ہو جاتا ہے۔ "صبح کے مانند" اس لیے کہا کہ اسے بھی شعراء گریباں چاک کہتے ہیں اور زخم کے پھیلاؤ کی وجہ سے اُسے بھی داغدار کہتے ہیں۔

۳۔ ہے شکستن سے بھی دل مایوس یارب کب تلک　　　آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

خطاب خدا سے ہے لیکن اشارہ معشوق کی سنگدلی کی طرف ہے کہ باوجود اظہار گرانجانی کے وہ ہمارے دل کی طرف توجہ نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ پتھر کی توجہ آبگینہ کی طرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اسے توڑ دے۔

مدعا یہ کہ محبوب کے تغافل کا یہ عالم ہے کہ وہ ہم پر ظلم و ستم بھی روا نہیں رکھتا۔

۴۔ میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پائے شکست   موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

میکدہ کا چشمِ مستِ ناز سے شکست پانا یہی ہے کہ چشمِ یار کی نشہ بخشیاں مے کدہ سے بڑھ جائیں۔

موئے شیشہ سے مراد وہ بال ہے جو ٹوٹے ہوئے شیشہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔

مژگانی کرنا یعنی مژگاں کا کام دینا۔

مفہوم یہ ہے کہ چشمِ یار سے جو مستی بیخودی پیدا ہوتی ہے وہ خُم کا خُم پی جانے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ بات میکدے کے لیے اتنی باعث شرم ہے کہ ساغر بھی اس کو دیکھ کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔

۵۔ خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد   یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

یہ خیال کہ الفت زلف کے سامنے یہ اقرار کرے کہ مجھے ہر پریشانی منظور ہے۔ ایک حد تک تو غنیمت ہے لیکن خطِ عارض سے تحریر عہد نامہ کی طرف خیال منتقل ہونا کوئی قابلِ تعریف خیال نہیں۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ سبزۂ خط کے ساتھ زلف کا ذکر کیوں کیا گیا۔ جب کہ سبزۂ خط ظاہر ہونے کے بعد زلف کا حُسن گھٹتا ہے بڑھتا نہیں۔ ممکن ہے غالب کا ذوق اس کے خلاف ہو۔

غزل نمبر ۱۹۴

۔ تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے   مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

مری تپش کی شدت کا یہ عالم ہے کہ بستر اور تکیہ دونوں کشمکش میں مبتلا ہیں مدعا یہ کہ بیقراری کی حالت میں مجھے کسی کروٹ چین نہیں ملتا۔

۔ سرشک سر بصحرا افتادہ، نور العین دامن ہے   دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

"سر بصحرا افتادہ" یہ پورا فقرہ صفت ہے سرشک کی اور "بے دست و پا افتادہ" صفت ہے دل کی۔

صحرا سے یہاں صحرا نہیں بلکہ وسعت دامن مراد ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ میرا دامن ہر وقت آنسوؤں سے تر رہتا ہے اور دل ناکام بستر مجبوری پر پڑا رہتا ہے۔

۳۔ خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو وہ آئے ہیں	فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدار بستر ہے

یہ شعر اس غزل کی جان ہے۔ محبوب کا عیادت کے لیے آنا عاشق کے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہوا کرتا ہے اور اسی خیال کو غالب نے بڑی خوبصورتی سے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ محبوب کی آمد سے شمع بالیں میں بھی رونق آ گئی اور بسترِ علالت کی بھی قسمت جاگ اٹھی۔

۴۔ بہ طوفان گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی	شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

اس شعر میں بے چینی و اضطراب کا اظہار ناگوار مبالغہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ شامِ تنہائی کے اضطراب کو اس طرح ظاہر کرنا کہ تارِ بستر آفتابِ صبحِ محشر کی شعاع کی طرح نظر آنے لگے۔ بلندیٔ خیال ضرور ہے لیکن اس کو جن الفاظ میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے بعض کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔

پہلے مصرع میں طوفان گاہ اور جوش دونوں کا آفتابِ صبحِ محشر سے کوئی تعلق نہیں۔ محض مصرع پورا کرنے کے لیے لائے گئے ہیں۔ دوسرا مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا۔

"نہ پوچھو مجھ سے وجہِ اضطرابِ شامِ تنہائی"

۵۔ ابھی آتی ہے بو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی	ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

بالش = تکیہ

مفہوم یہ ہے کہ ہم زلیخا کی طرح اپنے محبوب کو صرف خواب میں دیکھ کر خوش نہیں ہوئے کیونکہ وہ تو ہمارے پاس آتا ہے اور جب جاتا ہے تو اپنے بالوں کی خوشبو تکیہ پر چھوڑ جاتا ہے۔

غزل نمبر ۱۹۵

۱۔ خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے	غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

اس شعر میں غالب نے رگِ گردن کہہ کر دو مفہوم علیحدہ علیحدہ پیدا کیے ہیں "رگِ گردن" غرور و نخوت کو کہتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ مفہوم بھی اس میں پنہاں ہے کہ "رگِ گردن" قطع بھی کی جاتی ہے۔ مدعا یہ کہ تیری دوستی پر غرور کرنے سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مبادا تو دشمن ہو جائے اور رشتۂ الفت رگِ گردن کی طرح قطع کر دے۔

غزل نمبر۱۹۶

۱۔ شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

اردی بہار کا مہینہ ہے اور دے خزاں کا جو اس کے بعد آتا ہے۔

کہتا ہے کہ اگر تو غم سے بچنا چاہتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تو خوشی بھی نہ کر اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اردی کے بعد ہی دے کا زمانہ آتا ہے۔ یعنی اگر بہار نہ آئے تو اس کے بعد خزاں کے آنے کی بھی کوئی صورت نہیں رہ جاتی۔ مدعا یہ کہ اگر دنیا میں مسرت کا خیال ترک کر دیا جائے تو پھر کوئی غم، غم نہیں رہتا۔

۷۔ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"

اس شعر میں غالبؔ نے ردیف کا استعمال بڑی ندرت کے ساتھ کیا ہے چونکہ اس زمین کی ردیف "نہیں ہے" اور ساری غزل میں "نہیں ہے، نہیں ہے" کی تکرار کی گئی ہے اس لیے غالبؔ نے اپنا نام ہی "نہیں ہے" رکھ لیا اور اسی سے مخاطب ہو کر پوچھ رہا ہے کہ (اے تو وہ جو ہر بات میں "نہیں ہے، نہیں ہے" کہنے کے سوا اور کچھ نہیں کہتا یہ بتا کہ تو خود کیا ہے۔

غزل نمبر۱۹۷

۲۔ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

یہ شعر انداز بیان کے لحاظ سے غالبؔ کے نشتروں میں سے ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ ایک زمانہ کے تغافل کے بعد محبوب کو اتنی توجہ ہوئی ہے کہ وہ ہم کو کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے اور وہ بھی پوری نگاہ سے نہیں، لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ اس کی یہی نگاہ جسے بظاہر پوری نگاہ نہیں کہہ سکتے کیا چیز ہے۔ مدعا یہ ہے کہ پہلے تو تغافل ہی تغافل تھا مگر نادانستہ۔ لیکن اب اس تغافل میں یہ احساس بھی پیدا ہو چلا ہے کہ تغافل کس سے کیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ دانستہ تغافل اسی سے کیا جاتا ہے جس سے لگاؤ ہوتا ہے۔

غزل نمبر۱۹۸

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

ہم تمام تکلیفیں برداشت کرتے ہیں لیکن ان کی تمنا نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم کو بربنائے رشک یہ بھی گوارا نہیں کہ ہم خود ان کی تمنا کریں چہ جائیکہ کوئی اور۔ اسی مفہوم کا شعر غالب نے ایک اور لکھا ہے:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غزل نمبر ۱۹۹

۱۔ کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ　　خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

جب تو جام اپنے لبوں تک لے جاتا ہے تو خود شراب تیرے ہونٹوں سے کسبِ رنگ کرتی ہے اور خطِ پیالہ گلچیں کی طرح تیرے ہونٹوں کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

غزل نمبر ۲۰۰

۱۔ کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو　　یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

چشمِ بتاں اگر محوِ تغافل ہیں اور وہ کسی کی طرف نہیں اُٹھتیں تو غلط نہیں کیونکہ وہ بیمار ہیں اور آنکھ کی بیماری میں، دیکھنے اور نگاہ سے کام لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

غزل نمبر ۲۰۱

۱۔ دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے　　ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

اگر نامہ بر ہمارے محبوب کو دیکھ کر اپنا دل دے بیٹھا اور ہمارا رقیب ہو گیا تو کیا کیا جائے وہ بھی آخر انسان ہے علاوہ اس کے اس لحاظ سے بھی کہ وہ ہمارا نامہ بر ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے　　قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

یہ ہم جانتے ہیں کہ قضا ایک نہ ایک دن ضرور آکر رہے گی۔ لیکن اس کا بھی یقین ہے کہ آج نہ آئے گی۔ مدعا یہ کہ آج آجاتی تو ہماری تکلیفوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن وہ بربنائے ضد کیوں آنے لگی۔

۶۔ تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال　　ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہیے

مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ سررشتۂ وفا ہمارے ہی ہاتھ میں ہے لیکن تم اس سے اس قدر بے خبر ہو کہ یہ بتانے کے بعد بھی اگر میں تم سے پوچھوں کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے تو تم نہ بتا سکو گے۔

غزل نمبر ۲۰۲

۱۔ دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے　　　کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

دامن افشانی = ترکِ علائق

ترکِ علائق کے سلسلے میں میں نے کپڑے تو اُتار پھینکے لیکن آزادی مجھے پھر بھی نصیب نہ ہوئی اور تن کی وابستگی بدستور قائم رہی۔ مدعا یہ کہ حقیقی آزادی اس زندگی میں کسی کو نصیب نہیں۔

۲۔ بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں　　　مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

سنگِ فساں = وہ پتھر جس پر تلوار تیز کی جاتی ہے۔

لفظ "گراں" سے فائدہ اٹھا کر گراں جانی کو سنگ فساں قرار دیا گیا جس پر تیغ نگاہ یار تیز کی جاتی ہے۔

۳۔ کیوں نہ ہو بے التفاتی، اس کی خاطر جمع ہے　　　جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

"پرسش ہائے پنہانی" فارسی میں لفظ پرسش ہمیشہ عیادت و تعزیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور "پرسشِ حال" کے لیے جب اس کا استعمال کیا جائے تو لفظِ حال کا اظہار ضروری ہوگا۔ غالب نے یہاں اس کا کنائی استعمال کر کے پرسشِ حال کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ پرسش ہائے پنہائی سے وہ آگاہی مراد ہے جو پوشیدہ طور پر یا چھپ کر حاصل کی جائے۔

مفہوم یہ ہے کہ محبوب جانتا ہے کہ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں اور کسی نہ کسی طرح خواہ وہ تصور ہی کی مدد سے کیوں نہ ہو اس تک پہنچ جاتا ہوں۔ اس لیے وہ مطمئن ہے اور التفات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

۵۔ بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے　　　اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

"مرغِ بستانی" سے مراد بلبل ہے۔

نوائے بلبل سننے کا شوق مجھ بار بار چمن کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ وہ بھی میری ہی

طرح زار نالی میں مصروف رہتا ہے۔ لیکن میرا محبوب یہ دیکھ کر مجھ سے بدگماں ہوتا ہے لیکن کیوں؟ اس کا کوئی سبب ظاہر نہیں کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ محبوب یہ خیال کرتا ہو کہ غالب کو صرف سیر چمن کا شوق ہے۔ اگر اسے میری محبت ہوتی تو وہ صحرا کا رُخ کرتا کسی گلشن کی طرف کیوں جاتا۔

غزل نمبر ۲۰۳

۱۔ یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

یارب = فریاد

سبحہ = سمرن، تسبیح۔

میرا یہ عالم ہے کہ مسرت میں بھی ہنگامۂ فریاد جاری رہتا ہے اس لیے جب زاہد کو تسبیح خوانی میں مصروف دیکھتا ہوں تو میں مسکرا پڑتا ہوں اور مجھے اپنا عالم فریاد یاد آجاتا ہے۔ اس میں زاہد پر ہلکا سا طنز بھی شامل ہے۔

۲۔ ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن تھا طلسم قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

قفلِ ابجد = ایک خاص ترکیب کا قفل جو بعض مخصوص حروف کے مل جانے پر کھلتا ہے۔

جس طرح قفل ابجد بغیر لفظ بنائے ہوئے نہیں کھل سکتا۔ اسی طرح میری دل گرفتگی بھی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک میں فکر سخن نہ کروں۔

۳۔ یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

جب میں زنداں میں تھا تو صحرا نوردی کے لیے بیتاب تھا اور اب صحرا نوردی کے زمانے میں مجھے زندانیوں کی آسائش پر رشک آتا ہے۔ مدعا یہ کہ نہ مجھے زنداں میں چین ہے نہ صحرا نوردی میں۔

۴۔ طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

مجھے حسرت و ناکامی ہی میں لطف آتا ہے اس لیے میری آرزو اس کے سوا کچھ نہیں کہ آرزو پوری نہ ہو اور میں مبتلائے حسرت رہوں۔

غزل نمبر ۲۰۴

۲۔ قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

قیس وفرہاد کی آزمائش قد و گیسو سے آگے نہیں بڑھتی لیکن میں عشق کی جس منزل سے گزر رہا ہوں وہاں دار و رسن سے آزمائش ہوتی ہے۔

مدعا یہ کہ میرا مرتبۂ عاشقی قیس وفرہاد سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

۴۔ کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر ہنوز اس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

فرہاد کو بے ستون کھود کر جوئے شیر لانے کی فرمائش تو صرف اُس کی جسمانی قوت کی آزمائش ہے۔ آگے بڑھ کر اس کو ایک اور سخت امتحان دینا ہے جس کا تعلق اس کے حوصلہ سے ہے، مگر وہ امتحان کیا ہے ہوسکتا ہے کہ غالب کی مراد اس سے یہ ہوگی کہ اسے مرگ شیریں کی خبر سنائی جائے گی اور وہ یہ خبر سن کر تیشہ سے اپنے آپ کو ہلاک کرے گا۔

۶۔ نسیم مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

پیرِ کنعاں سے مراد حضرت یعقوب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فراقِ حضرت یوسف میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی لیکن پیرہنِ یوسف کی خوشبو آئی تو وہ عود کر آئی۔ مفہوم یہ ہے کہ نسیمِ مصر اگر یوسف کی بوئے پیرہن کو یعقوب تک لے گئی تو اس سے مقصود یعقوب کی ہمدردی نہ تھی بلکہ صرف دیکھنا تھا کہ "یوسف کی بوئے پیرہن" کتنا زبردست اثر اپنے اندر رکھتی ہے۔

۷۔ نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

تسبیح و زنار میں بجائے خود کوئی ایسی دلکشی یا کشش نہیں کہ شیخ و برہمن اُس کے غلام بنے رہیں۔ بلکہ اس سے اصل مقصود ان کی وفاداری کا امتحان ہے کہ آیا جو کیش و مسلک انھوں نے اختیار کیا ہے اس پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔

۸۔ پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

مگر = شاید

دل سے خطاب ہے کہ تو اس سے پہلے بھی زُلفِ یار کی بندش سے آزاد ہونے کی کوشش کر چکا ہے اور ناکام رہا ہے۔ اس لیے اب کیوں بیتاب ہے کیا پھر اس زلفِ پُرشکن کی طاقت آزمانا چاہتا ہے۔

غزل نمبر ۲۰۶

۱۔ زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے کشاد و بستِ مژہ، سیلیٔ ندامت ہے

چونکہ حسن کا بار بار تماشا کرنا، سراسر دیوانگی ہے۔ اس لیے وقتِ تماشا میری پلکوں کا بار بار کھلنا اور بند ہونا گویا ایسا ہے جیسے شرم وندامت مجھے تھپڑ مار رہی ہو۔ مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ تماشائے حسن کا نتیجہ ندامت کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ نہ جانوں کیونکر مٹے داغ طعن بدعہدی تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

اغیار سے ملنے کے لیے معشوق آئینہ کے سامنے محوِ آرائش ہے۔ لیکن یہ بھی سوچتا جاتا ہے کہ میرا ایسا کرنا غالبؔ سے بدعہدی ہوگی اور اس خیال کے زیرِ اثر وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ آئینہ بھی اس کو ملامت کر رہا ہے۔

۳۔ بہ پیچ وتاب ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ نگاہِ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

امن وعافیت اسی میں ہے کہ حرص وہوس کو چھوڑ دیا جائے۔

۴۔ وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنونِ ساختہ و فصلِ گُل قیامت ہے

باوجود اس کے کہ اغیار کا دعوائے عشق بے بنیاد ہے لیکن تو پھر بھی وفا پر آمادہ ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص جنون ودیوانگی کی مصنوعی کیفیت اپنے اوپر طاری کرلے اور فصلِ گُل سے لطف حاصل کرے۔

غزل نمبر ۲۰۸

۱۔ ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

جب میں صحرا میں خاک اُڑانے پر آجاتا ہوں تو خود صحرا اپنی گرد میں چھپ جاتا ہے اور جب اشک باری شروع کر دیتا ہوں تو دریا بھی مجھ سے عاجز آجاتا ہے۔

۱۱۔ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

شبِ ہجراں میں ہم موت کی تمنا کرتے تھے لیکن موت نہ آئی۔ اب شبِ وصل میں یہ تمنا

شادیٔ مرگ سے پوری ہوئی۔

غزل نمبر ۲۰۹

۱۔ رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے　　　کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

اس شعر میں اور اس سے پہلے کے چند اشعار میں زمانہ کے ناساعد حالات کا ذکر کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ زمانے کا چلن کتنا اُلٹا ہو گیا ہے ظلم کی داد کہیں نہیں ملتی یہاں تک کہ اگر قاتل جان لے تو اس سے خون بہا لینے کی جگہ اُلٹا خون بہا دینا پڑتا ہے زبان کاٹنے والے کو مرحبا و آفرین کہنا پڑتی ہے۔

غزل نمبر ۲۱۰

۱۔ رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے　　　دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھوئے گئے = بے شرم و بے حجاب ہو گئے۔

ہم نے محبت میں اشکباری سے اس لیے کام نہیں لیا تھا کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو لیکن آخر کار جب ضبط باقی نہ رہا اور آنسو جاری ہو گئے تو یہ ساری احتیاط خاک میں مل گئی اور ساری دنیا پر یہ راز ظاہر ہو گیا۔

غزل نمبر ۲۱۱

۱۔ نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب　　　شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

غالبؔ نے اس شعر میں محفلِ طرب کی مسرت و نشاط کا ذکر کیا ہے کہ ہر شخص نشہ میں چور ہے۔ مُطربوں کے ساز سے مستی ٹپک رہی ہے۔ شیشۂ شراب سَرو نظر آتا ہے اور نغمہ جوئبار کی طرح جاری ہے۔

۲۔ ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست　　　واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

اگر میں دوست کی محفلِ عیش و مسرت میں نالہ کرتا ہوں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بزمِ محبوب میں کوئی تلخی یا برہمی پیدا ہوتی ہے کیونکہ وہاں تو میرے نالے سے بھی نغمہ کا سا لطف

اٹھایا جاتا ہے۔

غزل نمبر ۲۱۲

۱۔ عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے　　دعوئے جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

جب معشوق ازراہِ شوخی ہنستا ہے تو اس کے دانت نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح احباب کا یکجا ہو جانا بھی ہنسی کی بات ہے، کیونکہ اس جمعیت کا کیا اعتبار اس شعر میں محبوب کے دانتوں کو ایک دوسرے سے ملے ہوئے دیکھ کر جمعیتِ احباب کی طرف خیال منتقل ہوا۔

۲۔ ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل　　یک جہاں زانو، تامل درقفائے خندہ ہے

یک جہاں زانو تامل = تاملِ بسیار۔ کیونکہ فکر کے وقت انسان زیادہ تر زانو پر سر رکھ کر سوچتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ غنچہ ہنوز حالتِ عدم میں ہے لیکن وہ سوچ رہا ہے کہ اس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وہ غنچہ سے پھول بنے اور آخر کار فنا ہو جائے جو بڑی عبرت کی بات ہے۔

۳۔ کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام　　ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

عیشِ بیتابی = وہ لطف جو بیتابی سے حاصل ہو۔

دنداں در دل افشردن = تکلیف و مصیبت کو برداشت کرنا۔

افسردگی کے عالم میں ہم بیتابی کا اظہار حرام سمجھتے ہیں۔ ورنہ تکلیفوں کے تحمل کے لیے اگر ہم اپنے دل کو دانتوں سے زخمی کر دیں تو اس سے ایک کیفیت خندہ ضرور پیدا ہو سکتی ہے۔ اس شعر میں فارسی محاورہ "دنداں در دل افشردن" سے ابہام پیدا کر کے انتہائی دور از کار استعارہ سے کام لیا گیا ہے۔

۴۔ سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

بظاہر احباب یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں سوزشِ باطن نہیں پائی جاتی۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ بظاہر میرے لب آشنائے خندہ نظر آتے ہیں۔ لیکن دل پر سیلِ گریہ طاری ہے۔

غزل نمبر ۲۱۳

حُسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے　　آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

خریدارِ متاعِ جلوہ = جلوہ کا خواہشمند۔

حُسن بظاہر بے پروا نظر آتا ہے لیکن نت نئے جلووں کی فکر سے غافل نہیں اور ہر وقت آئینہ کے سامنے اسی فکر میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ کس آرائش سے کام لے کر اپنے جلووں کو فروغ دے۔

آئینہ کو "زانوئے فکر" اس لیے کہا کہ جس طرح فکر کے وقت زانو پر سر رکھ کر سوچتے ہیں۔ اسی طرح وہ جلووں کی افزائش کے لیے آئینہ سامنے رکھ کر غور کرتا رہتا ہے۔

۲۔ تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن! چشمِ واگردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

رنگِ تماشا باختن = مصروفِ تماشا رہنا۔

اے آگاہی تو کب تک جلوہ ظاہر کے تماشے میں مصروف رہے گی، حالانکہ اس تماشہ کے لیے آنکھ کا کھلنا ہی وداعِ جلوہ ہے یعنی آنکھ جتنی زیادہ کھلے گی۔ اتنی ہی زیادہ یہ حقیقت واضح ہو گی کہ دنیا کے ظاہری جلوے بالکل بے بنیاد ہیں۔

غزل نمبر ۲۱۴

۱۔ عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

دنیا کو طرۂ لیلیٰ کے نقطۂ نظر سے کب تک دیکھا جا سکتا ہے جب کہ وہ دراصل وحشتِ مجنوں کی غبار انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔

مدعا یہ کہ دنیا میں ناکامی وحشت ہی اصل چیز ہے اور ظاہری نمود و نمائش بالکل بے بنیاد چیز ہے۔

۸۔ ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

"سودائے جنوں" نقصان کا سودا نہیں کیونکہ اس عالم میں ہر سنگ و خشت جس سے لڑکے دیوانوں کو مارتے ہیں اس کے لیے صدف کا حکم رکھتا ہے اور یہ شکست دیوانوں کو گوہر کی طرح عزیز ہے جس سے گوہرِ شکست حاصل ہوتا ہے۔

۱۰۔ ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

یاس = نومیدی۔ ایک پھول کا نام بھی ہے۔

طبعِ ایجاد پسند کی وحشت کا نتیجہ ہمیشہ یاس و نومیدی ہوا کرتا ہے اس لیے ایسے لوگوں کا

اردو نومیدی میں مبتلا ہو جانا ناگزیر ہے۔

غزل نمبر ۲۱۷

۱۔ جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر تمام ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

جس طرح تلوار میں جوہر پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ تیزاب (زہر آب) سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح میری حالت بھی اُس سبزہ کی ہے جو زہر آب سے نشو ونما پاتا ہے۔ مدعا یہ کہ میری فطرت ہی یہ ہے کہ زہر غم سے آسودہ ہوں۔

۳۔ مدعا محو تماشائے شکستِ دل ہے آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

ہمارا مدعا یہی تھا کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہم شکست دل کے تماشہ میں محو ہو جائیں۔ چنانچہ اب ہماری حالت ایسی ہے جیسے کسی کو آئینہ خانہ میں لے جائیں اور ہر طرف اسے اپنی ہی صورت نظر آئے۔

۴۔ نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

قمری بھی خاکی رنگ کی ہوتی ہے اور قمری کا انڈا بھی خاکستری ہوتا ہے اس لیے آسمان کو بیضۂ قمری قرار دیا اور عالم کو کفِ خاک۔ چونکہ دنیا نام نالہ وزاری اور خاک اڑانے کا ہے اس لیے آسمان گویا بیضۂ قمری ہے۔ (جو خاکی رنگ کا ہوتا ہے)۔ قمری کی آواز کو بھی نالہ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

غزل نمبر ۲۲۰

۱۔ کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

اگر ہم صدا یا آواز بن کر اس دنیا میں رہنا چاہیں بھی تو صدائے بازگشت کی طرح پہاڑ اسے لوٹا دیتا ہے۔ اس لیے پوچھتا ہے کہ شرارِ جستہ بتا ہمیں کیا ہونا چاہیے۔ اس سوال میں جواب بھی پنہاں ہے اور وہ یہ کہ شرارِ جستہ ہو جانا ہی زیادہ موزوں ہے کہ دفعتہً نمودار ہوتا ہے اور پھر فنا ہو جاتا ہے۔

غزل نمبر ۲۲۱

۱۔ مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

مستی میں غفلت ہوتی ہے لیکن ساقی کی ادائے غفلت پروہ بھی نثار ہے یہاں تک کہ جس چیز کو ہم موج شراب کہتے ہیں وہ محبوب کی مژۂ خوابناک سے زیادہ نہیں۔ مدعا صرف محبوب یا ساقی کی غفلت شعاری کا اظہار ہے جس کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ جُز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو　　　جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

میرے دل میں اس کے سوا کوئی آرزو نہیں کہ تیری تیغِ ناز اس کو زخمی کرے اور آرزو کا تعلق چونکہ خیال سے ہے اس لیے گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ تیرے ہاتھوں جیبِ خیال بھی چاک ہے۔

۳۔ جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ　　　صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

جوشِ جنوں کا یہ عالم ہے کہ ہمیں دنیا میں صحرانوردی کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی باقی نہیں رہی۔ گویا صحرا نے ہماری آنکھ میں خاک جھونک دی ہے اور اب ہمیں دنیا میں کچھ نظر نہیں آتا۔

غزل نمبر ۲۲۲

۱۔ لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی　　　قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

عیسیٰ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ صرف جنبشِ لب سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے، لیکن وہ لوگ جو لعلِ بتاں کے کشتہ ہیں ان پر عیسیٰ کی مسیحائی گہوارہ جنبانی کا کام کرتی ہے اور ان کی نیند اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ مدعا یہ کہ جو عشاق معشوق کے لب لعلیں کے کشتہ ہیں ان کا چارہ مسیح کے پاس بھی نہیں۔

غزل نمبر ۲۲۴

۱۔ میں بھی ہوں تماشائی نیرنگِ تمنا　　　مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

میرا کسی بات کی تمنا کرنا اس لیے نہیں ہے کہ وہ پوری بھی ہو بلکہ میرا مقصود تو نیرنگِ تمنا کا تماشہ دیکھنا ہے یعنی صرف یہ دیکھنا کہ انسان کیسی کیسی آرزوئیں کرتا ہے اور وہ کس کس طرح ناکام رہتا ہے۔

غزل نمبر ۲۲۵

۱۔ سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر　　　مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

تصویروں کے ذریعہ سے بھی اظہار حقیقت کیا جاتا ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر غالب نے ظاہر کیا ہے کہ میری لوحِ تقدیر میں شبِ ہجراں کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بالکل ایسی ہے جیسے کاغذ پر سیاہی کا دھبہ پڑ جائے۔

غزل نمبر ۲۲۶

۱۔ ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے　　　خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

"خس بدنداں" ہونے سے اظہار عجز مراد ہے کسی زمانہ میں یہ دستور تھا۔ کہ جب دو فریق میں لڑائی ہو جاتی تھی اور ان میں سے کوئی ایک اظہار عجز کرتا تھا تو اس کا سردار یا فاتح یا غالب فریق کے سامنے دانت میں تنکا دبا کر آجاتا تھا۔ حیرت عاجز (عاجز حیرت) ترکیب مقلوب ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہجوم نالہ کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں آہ و فغاں سے باز رہتا ہوں۔ اسی حالت کو اس نے دوسرے مصرعہ میں بڑی پاکیزہ تشبیہ سے ظاہر کیا ہے۔ کہتا ہے کہ نیستاں کی بھی بعینہٖ یہی حالت ہے یعنی باوجود اس کے کہ اس میں بے شمار بانسریوں کے بننے کا سامان موجود ہے لیکن وہ بھی حیرت سے خس بدنداں نظر آتا ہے اور اس پر خموشی کا عالم طاری ہے۔ (بانس میں ریشے ہوتے ہیں اور اسی روایت سے "خس بدنداں" استعمال کیا گیا ہے)۔

۲۔ تکلف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں　　　نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیز عریاں ہے

جانستاں تر = زیادہ جان لیوا۔

بدخویاں سے مراد محض معشوق ہیں۔

مدعا یہ کہ معشوقوں کا لطف اور زیادہ جان لیوا ہے کیونکہ ازراہِ لطف جب وہ بے حجابانہ نگاہِ ناز صرف کرتے ہیں تو وہ تیغ تیز ثابت ہوتی ہے۔

۳۔ دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے　　　کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

متاعِ دست گرداں = اُس شے کو کہتے ہیں جو عاریتاً حاصل کی جائے۔ لیکن غالب نے اس کا استعمال اس معنی میں نہیں کیا بلکہ نقد سودا کے مفہوم میں کیا ہے اور ساغر چونکہ دست بدست چلتا ہے اس لیے اس نے دستگرداں کا لفظ استعمال کیا جو یقیناً بڑا لطیف استعمال ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر ساقی سے سودا کرتا ہے تو یہاں عاریت سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کے لیے دل و دین پیش کرنا ضروری ہے۔

۵۔ غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

قلزم = سمندر

صرصر = تیز و تند ہوا۔

مرجاں = مونگا۔

مونگا سُرخ ہوتا ہے اور سمندر میں پایا جاتا ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر غالب کہتا ہے کہ جس طرح سمندر میں مرجاں کا چراغ روشن ہے اُسی طرح غمِ عشق آغوش بلا میں عاشق کی پرورش کرتا ہے اور ہمارا وجود ایسا ہے۔ جیسے بادِ صرصر میں کوئی داغ روشن ہو۔ ہجوم بلا کو "قلزم صرصر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

غزل نمبر ۲۲۷

۱۔ خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے ترے سُرمہ سا نکلتی ہے

"تماشا ادا" کو اگر ترکیب توصیفی قرار دیا جائے تو اس کو نگاہ کی صفت قرار دیا جائے گا۔ "نگاہِ تماشا ادا" جس کا مفہوم ہوگا "قابلِ تماشا" اور نکلتی ہے کا فاعل نگاہ ہوگی لیکن اگر نکلتی ہے کا فاعل ادا کو قرار دیا جائے تو پھر پہلے مصرعہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ خموشیوں میں تیری ادا قابلِ تماشا ہو جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ غالب اس شعر میں معشوق کی نگاہ کو ذکر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی خاموشی کے لطف کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اس کا اظہار یوں کرتا ہے کہ تیری خاموشی گویا دل سے نکلتی ہوئی نگاہ سُرمہ سا ہے اور نگاہِ سرمہ آلودہی کا سا لطف دیتی ہے۔

۲۔ فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

فشار = بھینچنا۔

اس شعر میں غالب نے شبنم کے وجود کی بڑی پیاری توجیہ کی ہے۔ کہتا ہے کہ غنچہ پر شبنم کے جو قطرے نظر آتے ہیں وہ دراصل صبا ہے جو غنچہ کی تنگی خلوت سے پانی پانی ہوگئی ہے۔

۳۔ نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آب تیغ نگاہ	کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

اس شعر میں غالب نے تیغ نگاہ کی آبداری اور تیزی کا ذکر کیا ہے کہ سینۂ عاشق سے تیغ نگاہ کی کاٹ کا حال نہ پوچھو بلکہ سینے کے زخم کو دیکھو جس میں روزنِ در کی طرح ایک بڑا روزن پیدا ہو گیا ہے اور اس سے برابر ہوا نکلتی رہتی ہے۔

جب سینے کا زخم ہوا دینے لگتا ہے تو اسے مہلک سمجھا جاتا ہے (زخمِ سینہ کو اس وقت ہوا دینے والا کہتے ہیں جب پھیپھڑے کی ہوا جو ناک اور منہ سے نکلتی ہے سینے کے زخم سے نکلنے لگے۔)

غزل نمبر ۲۲۸

۱۔ جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے	نافہ، دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے

اس شعر میں غالب نے زلفِ یار کی خوشبو کا ذکر کیا ہے کہ جب ہوا زلفِ یار کو چھوتی ہوئی گزرجاتی ہے تو دماغ آہو بھی نافہ کی طرح معطر ہو جاتا ہے۔

۲۔ کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا	آئینہ فرشِ ششش جہت انتظار ہے

ششش جہت = یعنی تمام عالم یا جملہ کائنات۔

اس شعر میں خیال اور الفاظ سب بیدلؔ کے ہیں۔ انسان کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ "یہ جلوہ گری کس کی ہے اس انتہائی حیرت کو آئینہ فرشِ ششش جہت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جا سے غبارِ شوق	گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

اس شعر میں غالبؔ نے اپنے شوق کی وسعت و فراوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ میرے غبارِ شوق کو تنگیٔ جا کے فشار نے ذرہ ذرہ کر دیا ہے اور ان ذروں نے ایک ایسے جال کی سی صورت اختیار کر لی ہے جس نے وسعتِ صحرا کو بھی اپنے اندر لے لیا ہے۔

۵۔ چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگ گل پہ آب	اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

ایران میں رسم ہے کہ جب کوئی سفر کو جاتا ہے تو چلتے وقت اس کی پشت کی طرف آئینہ رکھ کر پانی چھڑکتے ہیں اس سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ اس کا سفر خیریت سے ختم ہوگا۔ اور عافیت کے ساتھ گھر

لوٹ آئے گا۔ اسی رسم کے پیش نظر غالبؔ عندلیب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ گلشن میں شبنم نہیں ہے بلکہ آئینۂ برگِ گل پر پانی چھڑکا گیا ہے اور اس طرح بہار کو رخصت کیا جا رہا ہے تا کہ وہ پھر جلد واپس آئے۔

۸۔ اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں　　طوفانِ آمدِ آمدِ فصلِ بہار ہے

عندلیب سے خطاب ہے کہ اپنے آشیاں کے لیے ابھی سے تنکے جمع کر لے ورنہ جب بہار آجائے گی تو پھر خشک تنکے کہاں ملیں گے۔

۹۔ دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی　　اے بے دماغ، آئینہ تمثال دار ہے

بے دماغ = نافہم۔

خبر = معرفتِ حقیقت

اپنے سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے نافہم اگر دل حقیقت معرفت سے بے خبر ہے تو بھی اس کو برباد نہ کر کیونکہ اگر یہ حقیقت کا آئینہ دار نہیں تو کم از کم اس میں کچھ تصویریں تو ایسی نظر آتی ہیں جنھیں دیکھ کر ہم کچھ دیر لطفِ تماشا حاصل کر سکتے ہیں۔

غزل نمبر ۲۲۹

۱۔ آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے　　ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

شعر کا مفہوم صاف ہے کہ تجھ سا حسین دنیا میں کوئی نہیں اور اگر یہ سوال کبھی پیدا ہوا تو اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ تیرے سامنے آئینہ لا کر رکھ دوں۔ مدعا یہ کہ تو آپ اپنی مثال ہے اور دنیا میں کوئی دوسرا تیرا مقابل نہیں۔

اس شعر میں "تماشہ کہیں جسے" کا استعمال سمجھ میں نہیں آتا۔ فارسی میں لفظ تماشا دو معنی میں مستعمل ہے۔ نظارہ اور ہنگامہ اور ان دونوں معنی میں اس لفظ کا استعمال بغیر کسی تاویل کے درست نہیں معلوم ہوتا۔ "آئینہ کیوں نہ دوں" کا مفہوم محذوف ہے۔ جو صرف "تجھے" ہو سکتا ہے۔ اس لیے گر پہلے مصرعہ کا مفہوم کچھ اس طرح ظاہر کیا جاتا کہ "آئینہ کیوں نہ دوں کہ (تو) تماشہ کرے جسے" تو تماشہ کا صحیح مفہوم پیدا ہو سکتا تھا۔

۲۔ حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں　　گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

بزم خیال سے مراد دل ہے۔ مدعا یہ کہ لوگ جسے "سویدائے دل" کہتے ہیں وہ دراصل گلدستہ ہے ہماری حسرت آلود نگاہوں کا۔ یعنی ناکامی نظارہ نے ہمارے دل کو داغدار بنا دیا ہے۔

۴۔ سر پر ہجوم دردِ غریبی سے ڈالیے ۔ وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

دردِ غریبی و کسمپرسی کا ہجوم دیکھ کر یہ جی چاہتا ہے کہ خاک بسر ہو جائیے اور صحرا نوردی اختیار کر لیجیے۔

۵۔ ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں ۔ شوقِ عناں گسیختہ ، دریا کہیں جسے

شوقِ عناں گسیختہ = شوقِ بے اختیار۔

شعر کا مفہوم صاف ہے۔ یعنی حسرتِ دیدار سے ہماری چشمِ تر میں شوقِ بے اختیار کا دریا چھپا ہوا ہے۔

۶۔ درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو ۔ صبحِ بہار ، پنبۂ مینا کہیں جسے

تمام پھول عموماً صبح کے وقت کھلتے ہیں لیکن گلہائے عیش و نشاط کے کھلنے کے لیے وہ صبح بہار درکار ہے جسے ہم پنبۂ مینا کہہ سکیں "پنبۂ مینا" کنایہ ہے شراب کی طرف۔ مدعا یہ ہے کہ جب تک صبوحی (صبح کی شراب) فراہم نہ ہو صحیح معنی میں لطف و مسرت حاصل ہونا ممکن نہیں۔

غزل نمبر ۲۳۰

۱۔ شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے ۔ داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

نظرگاہ فارسی میں اولیائے کرام کے آستانہ اور بادشاہوں کے ایوانِ بارگاہ کو کہتے ہیں لیکن ترکیبِ اضافی کے ساتھ اس کے معنی بدلتے رہتے ہیں مثلاً "نظرگاہِ گریباں" اس چاکِ گریباں کو کہتے ہیں جس سے سینے کا کوئی حصہ نظر آئے۔ اس لیے "نظرگاہ" کے معنی اس جگہ کے ہوئے جہاں نگاہ جا کر ٹھہرے اور "نظرگاہِ حیا" وہ جگہ ہوئی جو باعثِ حیا ہو۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ لالہ پر شبنم کا پایا جانا خالی از ادا نہیں ہے۔ لالہ دل کا سا داغ تو رکھتا ہے لیکن درد نہیں رکھتا اور یہ کیفیت اس کے لیے باعثِ شرم ہے۔ اس لیے جس چیز کو شبنم کہا جاتا ہے

وہ شبنم نہیں ہے بلکہ لالہ کا شرم سے عرق عرق ہو جاتا ہے۔

۲۔ دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار　　　آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

اس شعر کی ترکیب میں اگر پہلے مصرعہ کو مبتدا اور دوسرے مصرعہ کو خبر قرار دیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ ہمارا دل جو حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا ہے اس بدستِ حنا کے ہاتھ کا آئینہ ہے۔ یعنی جس طرح آئینہ میں حنا کی سُرخی نظر آتی ہے اسی طرح ہمارا خوں شدہ دل نظر آتا ہے لیکن یہ مفہوم صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر دونوں مصرعے اپنا اپنا مفہوم جدا رکھتے ہوں۔ اور مدعا یہ کہنا ہو کہ ادھر تو یہ عالم ہے کہ دل حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا ہے اور اُدھر یہ عالم ہے کہ ہر وقت اس بدمست حنا کے ہاتھ میں آئینہ رہتا ہے اور ہمارے حال کی اُسے خبر نہیں۔

۳۔ شعلے سے نہ ہوتی، ہوس شعلہ نے جو کی　　　جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے

شعلہ سے نہ ہوتی۔ کیا نہ ہوتی؟ تکلیف! (جو یہاں محذوف ہے) ہوس آرزو کو کہتے ہیں اور شعلہ سے مراد شعلۂ عشق ہے۔

شعر کا مفہوم صاف ہے۔ یعنی اگر آرزوئے عشق کی جگہ واقعی شعلۂ عشق ہمارے اندر پایا جاتا تو اتنی تکلیف نہ ہوتی کیونکہ ہم جل کے کبھی کے خاک ہو گئے ہوتے لیکن چونکہ دل کی افسردگی یہ کیفیت پیدا ہونے نہیں دیتی اور عشق کی آرزو ہی آرزو میں دن کٹ رہے ہیں۔ اس لیے اس خیال سے ہر وقت جی جلتا رہتا ہے۔

۴۔ تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کی بصد شوق　　　آئینہ بہ اندازِ گل، آغوش کشا ہے

تیرے عکس میں وہ شوخی ہے کہ آئینہ کی آغوش ہر وقت اس کے لیے کھلی رہتی ہے لیکن لفظ شوخی سے شعر میں کوئی کام نہیں لیا گیا اور اس کے استعمال کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی سوا اس کے کہ شوخی کا مفہوم محض حُسن قرار دیا جائے۔

۵۔ قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ　　　اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

غالب نے بقول خود اے بہ معنی جُز (بہ معنی سوا) استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس معنی میں اے کا استعمال کسی نے نہیں کیا۔ اور یہ غالب کی اختراع ہے۔

مفہوم یہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ عشق کی جگہ سوختگی کا نتیجہ نالہ کے سوا کچھ نہیں اور اس کی مثال میں قمری اور بلبل کو پیش کیا ہے کہ ان میں سے ایک محض کفِ خاکستر ہو کر رہ گئی ہے اور دوسری محض ''قفسِ رنگ'' اس میں شک نہیں کہ غالب کہنا یہی چاہتا تھا لیکن مصرعہ اول اس مفہوم پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتا۔

قمری کو تو خیر اس کے رنگ کے لحاظ سے کفِ خاکستر کہہ سکتے ہیں لیکن بلبل کو ''قفسِ رنگ'' کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بلبل خیالی رنگ کا طائر ہے اور اس میں نام کو بھی کوئی رنگ نہیں پایا جاتا۔

ہندوستان میں گلدم کو بھی بلبل کہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ غالبؔ کے سامنے گلدم ہی رہی ہو حالانکہ اس کی صرف دُم ہی سرخ ہوتی ہے اور سارا جسم سیاہی مائل ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ بلبل کو ''قفسِ رنگ'' کہنا اس کے رنگِ جسم کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس نے اپنے اندر پھولوں کے رنگ کو بند کر لیا ہے تو بھی اس کو ''قفسِ رنگ'' کہہ کر وہ بات کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے جو قمری کو کفِ خاکستر کہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ قمری کا کفِ خاکستر ہونا تو سامنے کی کھلی ہوئی چیز ہے اور قفسِ رنگ ہونا متعلق ہے کیفیت سے نہ کہ ظاہری صورت سے۔ پھر کسی چیز کے ''خاکستر'' ہو جانے کے بعد تو کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس کا کوئی نشان باقی نہیں اور قمری چونکہ صورتاً کفِ خاکستر ہے اس لیے اس کے بابت یہ کہنا کہ اس کا نشان نالہ کے سوا کچھ نہیں درست ہو سکتا ہے۔ لیکن بلبل کو ''قفسِ رنگ'' کہہ کر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا نشان صرف نالہ رہ گیا ہے۔

۶۔ خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو معشوق و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

معشوق کے بے حوصلہ ہونے سے مراد یہاں اس کی بے پروائی ہے۔

۷۔ مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

دستِ تہِ سنگ آمدن = مجبور ہو جانا۔

مفہوم یہ ہے کہ ہمارا یہ کہنا کہ ہم خود گرفتارِ اُلفت ہوئے صحیح نہیں کیونکہ ہم تو محبت کرنے پر مجبور تھے اور ہمارا پیمانِ وفا سراسر مجبوری تھا۔

۸۔ معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ تیغِ ستم ، آئینۂ تصویر نما ہے

تیری تیغ ستم گویا ایک آئینہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے تو اور کتنوں کا خون کر چکا ہے۔

غزل نمبر ۲۳۱

ا۔ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

تجلی نور ظاہر ہونے کے لیے بیتاب تھی لیکن اس کی کوئی موزوں صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخرکار اس کی قسمت کھلی اور تیرا قد و رُخ نظر آگیا اور انھیں کو اس نے اپنے ظہور کا ذریعہ قرار دیا۔ مدعا یہ کہ تیرا قد و رُخ سراپا تجلی نور ہے۔

غزل نمبر ۲۳۲

ا۔ کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

زہد میں اگر ریا شامل نہ ہو تو کچھ نہیں کیونکہ زُہدِ بے ریا میں یہ خیال تو ضرور شامل ہوتا ہے کہ اس کا عوض بہت اچھا ملے گا اور اس طمع پیدا ہو جانے کی وجہ سے زہد و عبادت کی وقعت ختم ہو جاتی ہے۔

غزل نمبر ۲۳۳

ا۔ رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

اس رشک نے کہ تیری ادا ساری دنیا کے لیے بلائے جاں ہے مجھے مبتلائے رشک رکھا۔ کاش کہ وہ صرف میرے لیے ہوتی۔

(ختم شد)

maablib.org



غالب اردو کا وہ واحد شاعر ہے، جس کے کلام کی سب سے زیادہ شروح لکھی گئیں، حنا جمشید نے غالب کی دو شروح 'وثوق صراحت اور مشکلات غالب' کو یک جا کر دیا ہے۔ حنا جمشید نے ۲۰۰۶ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی سے ایم اے اردو میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ۲۰۰۹ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور ان کا تقرر بحیثیت لیکچرار اردو ہوا۔ ۲۰۱۳ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی سے پہلی پوزیشن میں ایم۔ فل اردو کیا۔ ۲۰۱۷ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کے چناؤ میں ان کا میرٹ پر دوسرا نمبر رہا۔ آج کل مذکورہ بالا جامعہ سے پی ایچ ڈی اردو کر رہی ہیں اور شعبۂ اردو گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ساہیوال میں تدریسی خدمات بھی سرانجام دے رہی ہیں۔ ان کے کئی تحقیقی و تنقیدی مقالات اور افسانے مختلف کتب اور رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ''شبنم شکیل کی تحقیقی و فکری کائنات'' ۲۰۱۵ء میں عکس بکس سے شائع ہوئی۔ زیر طبع کتب میں افسانوں کی ایک کتاب ''کتھا کہانی'' اور ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب ''بچوں کا ادب'' شامل ہیں۔ دور حاضر میں جہاں تحقیق کا عمومی رجحان فکشن کی طرف ہے، حنا جمشید نے اپنی تحقیق کا موضوع شاعری کو بنایا ہے، جو ایسا کٹھن میدان ہے، جس میں توجہ، عرق ریزی اور انہماک کے ساتھ ساتھ، ایک خاص ادبی ذوق کی بھی ضرورت ہوتی ہے، یہ ذوق حنا جمشید میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ادارہ انھیں اس تحقیقی کام پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ ادب کے سنجیدہ قارئین بھی اس کام کی خوش دلی سے پذیرائی کریں گے۔

—ادارہ

9789695814383

Misaal PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com
Tel: +92-41-2643841, +92-333-9933221